یادگارِ رفتگاں

کیا جانے رہروانِ محبت کدھر گئے
روشن مگر ہیں راہِ ابد میں نشاں کئی

از جگر بریلوی

مطبوعہ مطبع انوار احمدی الٰہ آباد

قیمت ۔ للعہ

فہرست مضامین

وقابلیت اور حسنِ کارکردگی نے پندرہ سال کی مدت ہی میں انسپکٹر مدارس
کے عہدۂ ممتاز پر فائق کر دیا۔ اس وقت لکھنؤ آپ کے محکمہ کا صدر
مقام تھا آپ لکھنؤ ہی میں جھاؤلال کے پل پر اپنی ذاتی کوٹھی میں
رہا کرتے تھے، اپنی پر خلوص و بیش بہا خدمات کے صلہ میں رائے بہادر
کا خطاب پایا اور قیصر ہند کے تمغے سے معزز ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں
جان ہتھیلی پر رکھ کر سرکار برطانیہ کی وفاداری کا حق ادا کیا اور انعام
و اسناد حاصل کئے ۱۸۸۵ء میں پنشن لے کر اپنے وطن مالوف یعنی
بریلی میں سکونت پذیر ہو گئے اور یہاں رہ کر بھی سرکار و پبلک
دونوں کی خدمات سے غافل نہ رہے، غیر معمول اعزاز و وقار
حاصل کر کے بالآخر ۱۸۹۷ء میں آپ نے انتقال فرمایا۔

رائے بہادر آنجہانی کے خلفِ اکبر کنور کنہیا لعل آنجہانی تھے، آپ
۱۸۵[illegible]ء میں پیدا ہوئے اردو و فارسی کی تعلیم حسب دستور قدیم گھر پر
ہوئی انگریزی میں کیننگ کالج لکھنؤ سے انٹرنس پاس کیا، شوق مطالعہ
اور مزاولت تحریر سے انگریزی زبان پر وہ عبور حاصل کیا کہ اکثر
انگریز آپ کی انگریزی دانی پر حیرت کرتے تھے، فارسی زبان میں
عالمانہ حیثیت رکھتے تھے، آپ نے بھی محکمہ تعلیم میں ماسٹری سے
ملازمت شروع کی اور چند ہی سال میں اپنی ذکاوت و ذہانت
کی بدولت ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے
لیکن افسوس بہت جلد بعض ناگزیر موانع خانگی کی بنا پر آپ کو

ملازمت سے دست کش ہونا پڑا، رائے بہادر آں جہانی پنشن لے کر جب بریلی میں قیام پذیر ہوئے تو بعض امور ناگفتہ بہ کے باعث آپ کی جان خطرے میں تھی، ادھر پیری و پیرانہ سالی سعادت مند فرزند نے فرائض فرزندی کو محسوس کیا اور اٹھارہ سال کی ملازمت کو والد ماجد کی خدمت و حفاظت کی سعادت پر قربان کردیا، استعفیٰ دیکر اُن کی معیت میں بریلی مقیم ہوگئے۔

کنور کنہیالال آنجہانی میں ذہانت و ذکاوت کے ساتھ ساتھ ملکہ شاعری بھی بدرجۂ اتم تھا، لکھنؤ جیسے دارالعلوم کا قیام کاملین فن کی شبانہ روز صحبتیں۔ شعر و ادب سے معمور فضا یہ اسباب ایسے نہ تھے کہ آپ کے مذاق شعر کو روز افزوں ترقی نہ دیتے چنانچہ اس فن میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا، راقم الحروف کے ایک خاندانی بزرگ حضرت غلام حسنین المتخلص بہ قدر بلگرامی مرحوم جو حضرت غالب سے تلمذ رکھتے تھے کنور کنہیالال کے استاد تھے شروع سے آخر تک اپنا کلام قدر بلگرامی کو ہی دکھایا مگر افسوس آپ کا یہ شوق و سلسلہ جلد ختم ہوگیا، یکایک آپ کا دیوان چوری گیا اولاد معنوی کے تلف ہونے کا آپ پر اس قدر اثر ہوا کہ آپ نے آئندہ شعر کہنے کی قسم کھالی اور اس عہد پر تمام زیست قائم رہے

آپ کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن کے مجموعہ کا نام انسانیت ہے۔ راستی و پاکبازی، نیک نفسی تواضع اور انکسار آپ کے ضمیر میں داخل تھے اِن صفات کے دوش بدوش مسلک

تصوف کی پوری پوری پیروی اور صبر و توکل رضا و تسلیم، ذکر و فکر نے آپ کو ایک عارف کے مرتبہ پر پہونچا دیا تھا، صوفیائے کرام کا فارسی کلام وردِ زبان رہتا تھا بڑی محویت کے ساتھ اکثر و بیشتر اُسے پڑھا کرتے تھے۔ طب سے بھی آپ کو لگاؤ تھا لکھنؤ کے ایک طبیب حاذق سید محمد خاں سے آپ نے باقاعدہ یہ فن حاصل کیا تھا لیکن کبھی اِس کو ذریعہ معاش نہیں بنایا، کبھی مطب نہیں کیا آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ فن طبابت کارِ خیر میں داخل ہے البتہ جو درد مند آجاتا توجہ خاص سے محروم نہ رہتا۔

کنور کنہیا لال آنجہانی کی آخری زندگی بہت تلخ گزری ۱۸۹۴ء میں رائے بہادر آنجہانی کے انتقال کے بعد آپ کے اور آپ کے بھائیوں کے درمیان ایک کثیر جائداد کے متعلق مقدمہ بازی شروع ہوگئی، یہ قضیہ کم و بیش پندرہ بیس سال تک چلتا رہا ۱۹۰۷ء میں جب پریوی کونسل سے مقدمہ کا فیصلہ آپ کے خلاف صادر ہوا تو گویا آپ کی آزمائش و ابتلا کا دور شروع ہوا اس دور آزمائش میں وہ وہ مصائب اور آلام آپ نے برداشت فرمائے جو یقیناً معمولی دِل و دماغ کے اِنسان کو دیوانہ بنا کر چھوڑتے مگر آفریں اِس صبر و توکل پر آپ رضا و تسلیم کی صراطِ مستقیم سے ذرا نہ ہٹے۔ اِسی عالم میں ۱۹۲۴ء میں جب بارگاہِ ایزدی میں طلبی ہوئی تو خوش خوش داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت جگر بریلوی (مولف یادگار رفتگاں) کنور کنہیا لال آنجہانی کے چوتھے صاحبزادے ہیں ۱۸۹۰ء میں بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ دس گیارہ سال کی عمر تک گھر پر اُردو و فارسی انگریزی کی تعلیم پائی ۱۹۱۱ء میں ڈبلو، آئی، ایم ہائی اِسکول سے انٹرنس پاس کیا اور ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی، بی اے آپ نے انگریزی فارسی اور فلسفہ میں پاس کیا، زمانہ چونکہ بگڑ چکا تھا اس لئے ملازمت کی تلاش ناگزیر ہوئی ۱۹۱۶ء میں نائب تحصیلداری سے ملازمت کی ابتدا کی، آزاد خیالی اور آزادروی، راست کرداری اور استغنا چونکہ ورثہ میں مِلا تھا اِس لئے ملازمت کی قیود اور بند شیں آپ پر ہمیشہ بار رہیں، ذوقِ شعر نے اِن صفات کو مزاج میں الیسا راسخ کردیا کہ آپ کو دورانِ ملازمت میں ابتداء و انتہا کا کبھی احساس بھی پیدا نہ ہوا ورنہ ایک نامور خاندان کا سپوت ذرا سی حکمتِ عملی برت کر سب کچھ ہو سکتا تھا، میرا ذاتی تجربہ ہے کہ حضرتِ جگر نے دورانِ ملازمت میں ابن الوقتی، ضمیر فروشی کو کبھی خیال میں بھی نہ آنے دیا۔ میں موصوف سے جب مِلا اور جہاں ملا ہر حال میں صرف "شاعر" پایا، اگرچہ ملازمت کی قید بند میں انسان کبھی کبھی ضرورتاً اپنی حالت کو بدل لیا کرتا ہے لیکن آفریں اِس شاعر کو کہ ملازمت کے پچیس سال پوری پوری پریشانیوں اور بے اطمینانیوں میں گزار دئیے لیکن اپنا فطری اور اصلی رنگ نہ چھوڑا، ۱۹۴۲ء کے ماہ دسمبر

میں آپ تحصیل رکابگنج ضلع ایٹہ میں تعینات تھے کہ یکایک چند گھنٹوں
کی علالت کے بعد آپ کے ایک نہایت ہونہار بچے نے جو
ایف۔ اے میں پڑھتا تھا، انتقال کیا یہ صدمہ جگر جیسے شاعر
کے لئے بہت زیادہ روح فرسا ثابت ہوا، زمانہ کی ناسازگاری
کی حد ہو چکی تھی، لمبی رخصت لے کر گھر چلے گئے ملازمت کے
لئے اب دل و دماغ نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نائب تحصیلداری
سے ابتدا کی تھی اور اب نائب تحصیلداری سے ہی قبل از وقت
پنشن لے رہے ہیں۔

حضرت جگر بریلوی کے والد اور دادا کا تو میں ذکر کر چکا آپ کے
نانا منشی گنگا پرشاد صاحب المتخلص بہ اوج بھی ایک صاحب کمال
بزرگ ہوئے ہیں۔ آتش لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اس طرح حضرت
جگر کا ددھیالی اور ننھیالی ماحول یکسر عالمانہ و شاعرانہ تھا گویا
حضرت جگر جہاں، فطرتاً ذوقِ شعر سے سرشار دل و دماغ لے کر
پیدا ہوئے تھے وہیں جس فضا میں آنکھ کھولی وہ بھی شاعرانہ
نغمات سے متکیف تھی اس کا اندازہ کہ حضرت جگر کیسے شاعر ہیں اور
کون رنگ ان کے یہاں جلوہ گر ہے ان کے کلام کے ملاحظہ کے
بعد ہی ہو سکے گا۔ آپ نے شاعری میں لسان الہند مرزا محمد ہادی
عزیز لکھنوی سے مشورہ کیا، علاوہ عزیز سے فیض تلمذ حاصل کرنے
کے آپ بہ سلسلۂ ملازمت جہاں رہے وہاں کے مشاہیر شعراء

وادبار سے صحبتیں رہیں کاروبارانہ اور تاجرانہ شاعری اور مشاعروں
سے ہمیشہ گریز کیا لیکن اساتذہ و مشاہیرِ شعراء کی صحبت اور یکجائی
کے اتنے جویا ہیں کہ دُنیا کی بہتر سے بہتر تفریح کو اِس کے مقابلہ میں
ہیچ متصور کرتے ہیں۔ آپ کا شمار مُلک کے نامور اور مستند شعراء
وادبا میں ہے، ادبی دُنیا میں آپ کسی مزید تعارف کے محتاج
نہیں آپ کے مضامین نظم و نثر زمانہ، نگار اور ہمایوں وغیرہ
جیسے معیاری رسائل میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُردو زبان سے
آپ کو عشق ہے، عمر کا اِس وقت تک کا حصہ اِسی کی خدمت میں
گزارا ہے، آپ نے سب سے پہلے اپنے بہنوئی رائے بہادر بدری
پرشاد صاحب وکیل و اسپشل مجسٹریٹ شاہ جہاں پور کی تاریخ ہند
کو ازسرِنو ترتیب دیا۔ یہ تاریخ کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل
تھی آپ کی دیگر تصانیف میں اُردوئے اور ہنود (ڈیڑھ سو صفحات)
یادگارِ رفتگاں (چار سو صفحات)، مضامین جگر (دو جلد) مجموعہ ظریفانہ
مضامین (اخلاقی پہلو لئے ہوئے) اور رسالہ صحتِ زبان اُردو ادب
میں ایک گراں مایہ اضافہ ہیں نظم میں مجموعہ غزلیات و رباعیات
مجموعہ منظومات مختلفہ، مثنوی پیام ساوتری اور بچوں کی نظمیں
بڑی جاذبِ توجہ اور دِل پذیر ہیں۔

حضرتِ جگر کا قبل از وقت پنشن لے لینا اگرچہ بعض حالات
کے تحت میرے لئے صدمہ کے باعث ہے لیکن خوش ہوں کہ

ہند و قوم کا ایک ایسا فرد کامل اور شاعر بے بدل ملازمت کی قیود سے آزاد ہو رہا ہے جس کی ہر جنبش قلم اُردو ادب و شعر کے لئے گراں مایہ ثابت ہوگی۔

سیّد رفیق مارہروی
خلف حضرت احسن مارہروی مرحوم
۱۰ر نومبر ۱۹۴۳ء

———— • ❋ • ————

مقدمہ

اُردو کے یوم آفرینش سے مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی اُردو زبان کی ترویج و توسیع اور اس کے ادب کی تدوین و تشکیل میں جی جان سے کوشاں رہے بلکہ بقول ڈاکٹر مولانا عبدالحق کے "اگر ہندوؤں کی اس میں شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی" ابتدائی زمانے میں اُردو اپنی ترقی اور اشاعت کے لئے قریب قریب تمام تر ہندوؤں کے ضخیم مذہبی صحیفوں کے اُن منظوم و منثور ترجموں کی مرہونِ منّت رہی جو ہندوؤں کے قلم کے کارنامے تھے اور جن کا سلسلہ اب تک بند نہیں ہوا ہے اِن ترجموں میں مذہبی عقیدت کارفرما تھی اِس لئے اِن کو عام قبولیت حاصل ہوئی یہ گویا اُردو کی مقبولیت تھی ترجموں کے بعد طبع زاد تصانیف کو لیجئے تو اِس ذخیرہ کا حساب و شمار ہی نہیں ہو سکتا شعر و ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندوؤں کے ذہنِ رسا اور فکرِ بلند نے معجزے نہ دکھائے ہوں۔ بعض شعبوں کے تو پیشوا بھی ہوئے۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ہندو بلند پایہ شاعر و انشاپرداز نہ ہوئے ہوں اگر کسی کو اِس میں یقین نہ ہو تو موجودہ دور سے پیشینوں کا اندازہ لگالے۔ مختصر یہ کہ کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے ہندوؤں کے ادبی کارنامے ہر زمانے

میں عظیم الشان رہے لیکن یہ ایک ناخوشگوار حقیقت ہے کہ ان کارناموں
کی باقاعدہ ترتیب و تدوین کی طرف آج تک کسی کو توجہ نہیں ہوئی
کسی قوم کا ارتقائے ذہنی و شعوری کس حد تک شعرا و ادبا کی فکر
رسا کا محتاج ہے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ شاعر اور ادیب
اپنی قوم کی تہذیب و تمدن کا امین و محافظ ہے۔ اس لحاظ سے
شعرا و ادبا کے احسانات کو کسی دوسرے کے خدمات سے کوئی
مناسبت ہی نہیں۔ اس لئے ادبی احسانات کو فراموش کر دینا
ایسا جرم ہے جو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کا احساس ہمارے
ملک میں بہت کم ہے اور اردو میں ہندوؤں سے متعلق کمتر۔
یوں تو زبان اردو کی تاریخوں اور شعرا کے تذکروں کی کوئی کمی نہیں
لیکن ایسی کوئی کتاب نہیں ملتی جس سے زبان و ادب کی درجہ
بدرجہ ترقی میں ہندوؤں کی خدمات واضح طور پر آئینہ ہو سکیں
اور اُن کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہو سکے۔ یہی نہیں بلکہ انفرادی
حیثیت سے بھی ان کے ادبی مراتب کا پتہ نہیں چلتا۔ چاہئے
یہ تھا کہ قوم اِن کی تصنیفات کو اُردو کے کتب خانہ میں قائم رکھتی
اور مصنفوں کو زندہ رکھتی مگر ہوا اس کے برعکس۔ اگر کسی شاعر
یا ادیب کو استطاعت ہوئی تو اس نے اپنا سرمایۂ فکر خیال شائع
کرا دیا مگر اس کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد رفتہ رفتہ وہ اور
اُس کی سب متاعِ فکر مٹا کر نیست و نابود ہو گئی۔ تذکرہ نویسی کی

رسم کے طفیل کچھ عرصہ تک بعض شعرا کے نام مع اُن کے دو دو چار چار اشعار کے دیکھنے میں آتے رہے۔ اِن سے اِن بزرگوں کی ادبی رفعتوں کا کیا اندازہ ہو سکتا تھا ہاں یہ ضرور تھا کہ اِن کے نام تلاش کئے سے مِل جاتے تھے۔ لیکن زمانے کی نظروں میں یہ بھی خار تھا۔ آگے چلکر یہ نشانات بھی مٹ گئے۔ نثر میں تو یہ حالت ابتدا ہی سے تھی۔ غرض ایک دور ایسا آیا کہ نظم و نثر دونوں شعبوں میں ہندوؤں کی خدمات فراموش ہو گئیں۔ اِس کی ذمہ داری ہندو اور مسلمان دونوں پر مشترک حیثیت سے عاید ہوتی ہے اگر بقول سرتیج بہادر سپرو اُردو کو اِن دونوں قوموں کا ایسا ترکہ مانا جائے جو ناقابل تقسیم ہے۔ سب سے بڑا نقصان جو اس ناقدر شناسی سے اُردو کو پہونچا وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی تصنیفات کے فنا ہو جانے اور ہندو مصنفین کی عظمتوں کے باقاعدہ اور مسلسل ثبوت قایم نہ رہنے سے اُردو کے مخالفین کو یہ طعن کرنے کا موقع ہاتھ آگیا کہ جب ہندوؤں کی اُردو میں کوئی پرسش نہیں تو وہ اُسے کیوں اپنے گلے کا ہار بنائے ہوئے ہیں۔

حضرت جگر بریلوی نے "یادِ رفتگان" ایسی کتاب لکھدی ہے جو اس ناقدر شناسی کی بڑی حد تک تلافی کر دیتی ہے اور اِس الزام کو بہت کچھ دور کر دیتی ہے کہ اُردو میں ہندوؤں کی کوئی پرستش نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جو کام آپ نے آج انجام دیا

ہے اُسے اُردو کی ادبی تدوین کے ساتھ ہی شروع ہو جانا چاہئے
تھا مگر خیر۔ اُردو کا جو ایک فرض انجام دینا تھا وہ انجام تو پا گیا جلد
نہ سہی کسی قدر دیر سے سہی ۔

اِس کتاب کی ترتیب و تالیف میں جس قدر محنت آپ نے
کی ہے اُس کا اندازہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ جو دشواریاں
آپ کے روبرو تھیں اُن کا کچھ ذکر آپ نے سبب تالیف کتاب
میں کر دیا ہے۔ اُن پر نظر رکھتے ہوئے آپ کی ہمت و جانفشانی
پر آفریں کہنا پڑتی ہے۔ ممکن ہے بعض مشاہیر اِس میں شامل ہونے
سے رہ گئے ہوں ۔ اِس فرو گذاشت میں وہ معذور تھے اِس لئے
کہ اُن خدمتگزاران ادب کے حالات و تصنیفات کا وہ کہاں سے
پتہ لگاتے جن کی کسی ادبی کاوش کا اب نام و نشان تک
باقی نہیں۔ نظم میں تو کچھ امداد تذکروں سے مِل بھی جاتی ہے
نثر میں تو کوئی روشنی ہنر و کمالات پر نہیں پڑتی ۔ دو چار نام
اگر کسی تاریخ زبان اُردو میں نظر آجاتے ہیں تو اُنھیں مستثنیات
سے سمجھنا چاہئے ۔ ایسے حوصلہ شکن حالات میں حضرت جگر
کی یہ کوشش بڑی ہمت و استقلال کا ثبوت دیتی ہے۔ اگرچہ
آپ نے اِس کے نا مکمل ہونے کا اعتراف کیا ہے پھر بھی یہ
تالیف ہر معنی میں مجموعی حیثیت سے بالکل مکمل ہے۔ اگر دو چار
مشاہیر کا شمار اِس میں نہ ہو سکا تو اِس فرو گذاشت سے کوئی نقص

کتاب میں پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی فروگزاشتوں سے کوئی تصنیف خالی نہیں۔ "یادِ رفتگاں" نے واقعی اسلاف کے عظام رمیم کے حق میں مسیحائی کا کام کیا ہے اور آئندہ کے لئے ایک نورانی شمع ہدایت روشن کر دی ہے۔

مصنفوں کے کلام پر جو تنقید کی گئی ہے وہ اصول تنقید کے عین ماتحت ہے۔ ہر شاعر اور ادیب کی تصنیف کو اس نظر سے جانچا ہے کہ اُس کے انداز تحریر کی خصوصیتیں تمام و کمال نمایاں ہو جائیں اُس کے معاصرین میں اُس کی جگہ قائم ہو جائے اُردو ادب میں اُسکی حیثیت متعین ہو جائے اور کل کتاب کے پڑھنے کے بعد معلوم ہو سکے کہ اُردو نظم و نثر کے بنانے یا بگاڑنے میں ہندوؤں کا کتنا حصہ رہا اور وہ حصہ کس قدر و قیمت کا مستحق ہے۔ آج تک کسی تذکرہ نویس نے اِن پہلوؤں سے ہندوؤں کی تصنیفات کو نہیں دیکھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی ایک مصنف کی تصنیفات کو بھی تمام و کمال کبھی مطالعہ نہیں کیا گیا صرف دو چار غزلیں یا نظمیں دیکھکر چار چھ رسمی الفاظ میں تنقید کا حق ادا کرکے اِن کا ذکر خیر ختم کر دیا گیا یہ تذکرہ نویسی نہیں فہرست نگاری ہے۔ اِس سے اُردو کی شہرت کو جو فائدہ یا نقصان پہونچا ظاہر ہے۔

حضرت جگر کی طرز تحریر کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ آپ بہ حیثیت سخنور و ادیب ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔

زمانہ "نگار" ہمایوں، وغیرہ اُردو کے تمام چوٹی کے رسالوں میں آپکے
مضامین نظم و نثر مدت سے شائع ہو رہے ہیں۔ آپ کے ادبی
مضامین فنی معلومات کا دفتر اور معنویت کے اعتبار سے بڑے
ٹھوس ہوتے ہیں۔ بعض مقالے تو آپ نے ایسے سپردِ قلم فرمائے
جو مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو ایک پرچے سے
کئی کئی پرچوں میں نقل ہو کر شائع ہوئے "اُردو زبان اور
صحت الفاظ" پر آپ کا مضمون بڑا جامع اور بغایت سود مند تھا
حکمت اور میر پر آپ نے بڑے بصیرت افروز اور معرکہ آرا
مقالے لکھے ایسے جو اُردو تنقید میں نمونے کی شان رکھتے ہیں۔
بڑے بڑے مبصروں نے ان کی داد دی۔ ملک کے مشہور و معروف
نقاد و شاعر حضرت اثر لکھنوی نے لکھا:۔
"زمانہ میں آپ کا مضمون میر پر مجھے بہت پسند آیا۔ اسی طرح حکمت
سبحانی پر جو کچھ آپ نے لکھا بہت خوب تھا۔ اور لوگوں نے بھی
اس موضوع پر خامہ فرسائی کی مگر وہ دقت نظر اور صحت مذاق
مفقود تھی" مدعا یہ ہے کہ اُردو دُنیا میں آپ کی ادبی فضیلت مسلم ہے
آپ کا مذاق موجودہ ترقی یافتہ دور کا صحیح مذاق ہے۔ آپ اردو
اُن دقیانوسی فنی پابندیوں کے دور کر دینے کے حامی بھی ہیں جن کے
باعث اس زبان کی ترقی میں بڑی رکاوٹیں پڑی ہوئی ہیں اور
اُن جدید رجحانات کے مخالف بھی جن سے ادب کی تہذیب اور

فطری شعور کو نقصان عظیم پہونچ رہا ہے اور جو ایک وبا کی طرح ملک میں پھیلتے جاتے ہیں۔ آپ کی نظر بڑی وسیع اور دقیقہ رس ہے دقت نظر اور صحت مذاق سے بعض اور خوبیاں بھی ہمدوش ہیں آپ کی طرز بیان نہایت جامع اور مانع ہے۔ جو بات کہتے ہیں بہت اختصار و قطعیت کے ساتھ۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقروں اور لطیف استعاروں میں معانی کے خزانے بھر دیتے ہیں مثلاً دہلی لکھنؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

"ہمیں فن کو بنظر فن دیکھنا چاہئے۔ اس نقطہ نظر سے دنیا جانتی ہے کہ لکھنو اپنی خصوصیات میں فرد ہے۔ اگر ہندوستان بھر میں کوئی مقام دہلی کا مقابلہ کرسکا ہے تو لکھنو۔ دہلی کی موثر سادگی اور صفائی کا جواب صناعی اور نفاست ہی ہو سکتا تھا۔ یہی صناعی و نفاست قدرت نے لکھنؤ کی سرزمین کو عطا کی اور یہاں کی خاک کے ذرے جب اڑے تو آسمان پر آفتاب بنکر چمکے"

اس تمام عبارت میں "موثر سادگی" کی دو لفظی ترکیب نے جس خوبی اور جامعیت سے دہلی کی شاعری پر تبصرہ کر دیا اس کی تعریف نہیں ہو سکتی اسی طرح حضرت نظر لکھنوی کے متعلق لکھتے ہیں۔ الفاظ خط کشیدہ غور طلب ہیں:۔

"ان کا کلام کیفیات قلب کا آئینہ ہے۔ بلند خیالی کا دفتر۔ ان کے

اشعار میں بے انتہا سوز و گداز ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ جو صدمے اُن کی جان پر گزرے معمولی نہ تھے اول تو اُن کی زندگی آرزو کی زندگی تھی اُس پر روح فرسا سانحات کا پیش آنا۔ غم و اندوہ رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ یہ اُن کی سلامتی ذوق تھی کہ اپنی آہ میں اُنھوں نے واہ کی شان نہیں پیدا ہونے دی۔
جامع اور بہت مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کا تبصرہ بے لاگ ہوتا ہے جو کچھ جس کے متعلق لکھتے ہیں صداقت کے قرینے پر نہ مبالغہ آمیز توصیف کا شائبہ ہے نہ تقصیر آمیز تنقیص کو دخل۔ صداقت کی تلخی پر حتی الامکان شیریں کلامی کا پردہ ڈال دینے کی سعی کرتے ہیں تاکہ دلآزارانہ درشتی نہ پیدا ہو جائے۔ کہیں ناقدانہ زعم ہمہ دانی کی انانیت کی جھلک نظر نہیں آتی۔ کہیں لب و لہجہ نہیں بگڑتا عبارت میں ایک دلکشی اور گیرائی ہے جس کی داد نہیں دی جاسکتی لفظ لفظ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں کیف و سرور کی طرح اُترتا چلا جاتا ہے۔ الفاظ کچھ اس قدر نرم لوچدار اور مفہوم کی مناسبت سے ایسے متوازن انتخاب کئے جاتے ہیں اور اس حسن سلیقہ سے ترتیب دیے جاتے ہیں کہ معنی و مفہوم کی کیفیت نیکر نقش کی طرح دل میں بیٹھ جاتے ہیں پھر لطف یہ کہ جس قسم کا کلام ہے اُسی قسم کا انداز تنقید بھی اگر کسی مصنف نے محاکاتی حسن نمایاں کیا ہے تو اُس کی تشریح و تحلیل میں آپ نے بھی تصویر کھینچدی ہے

اور صرف دو تین الفاظ میں۔ ذیل کے انتخاب میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے اور آپ کی مخصوص طرزِ نگارش کے جوہروں کا اندازہ کیجئے:۔

"مضامین وہی ہیں جو آتش و ناسخ کے زمانے میں عام تھے لیکن طرزِ ادا کی لطافت اور ترکیبوں کی شگفتگی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہی خوبیاں فنِ شاعری کی جان ہیں لفظوں کے خاکوں میں حسنِ ادا کی ایسی روح پھونکی گئی ہے کہ عالمِ تصویر پیدا ہو گیا ہے .... ذیل کے مصرعے تو نزاکت، لطافت اور رنگینی کے حسین و جمیل مرقع ہیں:۔

۶۔ دانتوں میں زیادہ ہے صفا درِ عدن سے۔
"۔ رخسارے منور ہیں کہیں صبح وطن سے۔
"۔ تو ذرے کتر لیتے ہیں سورج کی کرن سے۔

سورج کی کرن سے ذرے کتر لینا کتنی نادر اور لطیف بات ہے معلوم ہوتا ہے موتیوں کے بجائے شعر میں تارے جڑ دیئے ہیں پڑھئے اور دل و دماغ کو مستفیض کیجئے"۔

میں نے یادِ رفتگاں" کی چند بہت ہی نمایاں خصوصیتوں کی طرف کچھ اشارے کر دئے ورنہ اس کی خوبیوں پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ جہاں یہ تالیف اُردو زبان کی تاریخ میں ایک ایسی ادبی اور تاریخی ضرورت کو پورا کرتی ہے جس کے باعث اُردو مدتوں سے

موردِ الزام بنی ہوئی تھی اور اِس اعتبار سے بے نظیر تالیف ہے وہاں خالص ادبی محاسن کے اعتبار سے بھی اِس کی ذاتی حیثیت بہت وقیع ہے۔ اُردو ادب کو ہر معنی میں بجا طور پر اِس گرانقدر تالیف پر ناز ہو سکتا ہے۔

راجندر نرائن بسمل

شمشابادی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ بی

سببِ تالیفِ کتاب

اپنی کتاب "اردو اور ہنود" کی تصنیف کے دوران میں بہت سے ایسے ہندوؤں کا کلام میری نظر سے گزرا جو صاحب طرز اور اپنے وقت کے اساتذہ ہوئے اور جن کی بلند پایہ تصنیفات دفتر کا دفتر تھیں لیکن اب اِن کا کوئی نام جانتا ہے نہ کہیں کلام سُننے یا دیکھنے میں آتا ہے۔ سب مع اپنی ادبی متاع کے نابود ہو گئے۔ قدیم تذکروں میں اِن بزرگوں کے برائے نام حالات اور دو دو چار چار اشعار نظر آجاتے ہیں۔ اُردو ادب کا کتب خانہ اِن اہلِ کمال کی تصنیفات سے یکسر خالی ہے۔ اِس کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اِن کی ادبی خدمات کا گراں پایہ سرمایہ مجلدات کی صورت میں ہمیشہ باقی رہتا تاکہ اُردو کی نشوونما کا ہر رُخ اور ہر پہلو نمایاں ہو جاتا اور اس کی ترویج و توسیع اور اس کے مذاق کے ارتقا میں ہندوؤں کی مساعی کا پوری طرح اندازہ ہوتا رہتا۔ اور ظاہر ہوتا رہتا کہ ہندوؤں نے جو اُردو زبان کی خدمت میں اپنی زندگیاں گزاریں اور اپنے دِل و دماغ کے بہترین جوہر اس میں صرف کئے تو یہ خدمت محض نقالوں اور مزدوروں کی سی خدمت تھی یا ادبی مذاق کی تہذیب و تشکیل میں بھی عہد بہ عہد اس نے کچھ امداد کی۔ اُردو کا مذاق اِن کی مساعی سے بنا یا بگڑا۔ بنا تو کس حد تک اور

کن خصوصیتوں اور کیفیتوں کے ساتھ اور کس اعتبار سے۔ یہ سب اُردو کے مقتضیات تھے لیکن اِن کا پورا ہونا تو ایک طرف رہا ایک دور ایسا آیا کہ ہندوؤں اور اُن کے احسانات کو بالکل فراموش کر دیا گیا۔ اس میں سب سے پہلا قدم مولانا محمد حسین آزاد مولف "آبِ حیات" نے اُٹھایا دوسروں نے اِن کی تقلید کی۔ اس ترک و اخراج کے اسباب کیا تھے اِس پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں یہ بڑی تلخ اور طولانی داستان ہے[۱]۔

قدیم تذکروں میں جب ہندو پیشوایان ادب کے افکار و تخیلات کے نمونے میری نظر سے گزرے تو اِن میں سے بعض کو میں نے جواہرات سے کم نہ پایا۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ اِن تمام بکھرے بکھرائے جواہر پاروں کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے اور اِن چمن بندان ادب کو ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا جائے۔ ورنہ کون اِن کو کھوجنے اور جاننے پہچاننے کی زحمت گوارا کرے گا اور کس کو پڑی ہے کہ ایک ایک دو دو شعر کے لئے ضخیم تذکروں کی ورق گردانی کرے پھر اِن تذکروں تک ہر شخص کی رسائی کب ہوتی ہے۔ لہٰذا مختلف مقامات سے پھول چن کر یہ گلدستہ تیار کر کے پیش کرتا ہوں۔

۱ے جو حضرات اس پر مفصل بحث دیکھنا چاہیں وہ رسالہ زمانہ کے اُن مضامین کو پڑھیں جو سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک اُردو و ہندی، "ہندوستانی" کی بحث کے سلسلہ میں شائع ہوتی ہے

مصنفین کے انتخاب میں اپنے مذاق کی رہنمائی سے میں نے کام لیا ہے، اور ان کے کلام سے اُن کے مرتبہ کا اندازہ کیا ہے۔ جہاں کلام اس قدر دستیاب نہ ہو سکا کہ اُس پر کوئی قطعی رائے قایم کی جاتی وہاں اعلےٰ آدمیوں کی رایوں پر بھروسا کیا ہے جو اُن کے متعلق دستیاب ہو سکیں۔

مصنفین کی ترتیب میں کوئی خاص اصول مدنظر نہیں رہا ہے جس سلسلہ سے مضامین لکھے گئے ہیں وہی سلسلہ قایم رکھا گیا ہے

مجھے احساس ہے کہ یہ مجموعہ نا مکمل ہے اور بہت سے قابل اندراج مصنف اس میں شامل ہونے سے رہ گئے لیکن اب گیا جائے اُن بزرگوں کے حالات اور خصوصاً کلام کی عدم دستیابی نے معذور کر دیا۔ جہاں تک تذکرے ملے اُن سے مدد لی گئی۔ کئی اخباروں میں اشتہار دیا کہ ہندو مشاہیر اُردو کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا ہوں جو صاحب ہندو شعرا یا انشا پردازوں کے حالات و کلام بھیجکر اس خدمت میں میرا ہاتھ بٹائیں گے مجھے ممنون منت فرمائینگے لیکن صدائے برخاست۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہندوؤں کو ایسے کاموں کی طرف نہ کبھی توجہ ہوئی نہ ایسے خدمتگزاروں کی وہ قدر جانتے ہیں ایسی صورت میں جو کچھ بھی ہو سکا نہ ہونے سے بہتر سمجھنا چاہئے۔

شاعروں کی ذیل میں تو کئی حضرات کے متعلق کچھ لکھ بھی سکا ہوں نثر نگاروں کی ذیل میں تو بجز سرشار منشی پریم چند

اور منشی دیا نرائن نگم کے کسی اور کے متعلق کچھ نہ لکھا جا سکا۔
سرشار پر جو مضمون ہے "مضامین چکبست" سے ماخوذ ہے اور باقی
دونوں حضرات میرے ہی زمانے میں ہوئے ہیں اس خاص کمی کی
وجہ یہ ہے کہ نثر نگاروں کے حالات و تصنیفات کا پتہ لگانا نہایت
دشوار ہے قدیم و متوسط زمانوں کے متعلق تو ایسی کوشش کا بار آور ہونا
ناممکن سا ہے۔ آخر زمانے کے متعلق بھی ایسی مساعی کو نتیجہ خیز
ثابت ہونے کے لئے برسوں کی مسلسل چھان بین درکار ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو نثر اردو کی تاریخیں لکھی ہی نہیں گئیں
اور جو دو تین لکھی گئیں وہ نہایت نامکمل۔ ان میں سے دو جو مشہور
ہیں میری نظر سے گزریں۔ ایک مولوی محمد یحیٰ تنہا کی سیر المصنفین"
دوسری حضرت احسن مارہروی کی "تاریخ نثر اردو" اول الذکر میں
علاوہ سرشار کے جو دو چار ہندوؤں کا ذکر ہے وہ برائے بیت ہے
اور موخر الذکر میں جو چار چھ ہندو مصنفین کے نام اور ان کی ایک
ایک تصنیف کا ذکر و انتخاب ہے تو ان کے حالات کا پتہ نہیں۔
منشی پریم چند جیسے صاحب طرز و یگانہ روزگار ادیب و افسانہ
نگار کا اس میں ذکر نہیں۔

ادھر یہ دشواریاں ادھر سرکاری ملازمت کی وہ مجبوریاں
اور پابندیاں جن میں پھنس کر جاگرانہ مصروفیت اور ذہنیت
دل و دماغ کو اس قابل ہی نہیں رکھتی کہ اس میں کسی بھی علم فن

کی تکمیل کی خواہش پیدا ہو چہ جائیکہ مشاغل ادبی کی۔ اس پر مستزاد کتب خانوں سے دوری ناموافق ماحول۔ اِن موانع اور حوصلہ شکن حالات میں جو قدم میں نے اِس میدان میں اُٹھایا ہے اُسے مثال کے طور پر قدم اولین سمجھنا چاہئیے۔

بہر حال میری اِس ناچیز خدمت کو مکمل یا نامکمل جیسا کچھ بھی سمجھا جائے اتنا وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری یہ سعی اِس قسم کی خدمت کی انجام دہی میں پہلی سعی ہے جو اُردو کے جنم دن سے اُردو والوں پر فرض چلی آتی ہے اور جس کی طرف اب تک کسی کو توجہ نہیں ہوئی تھی۔

ہگر بریلوی
گوندنی چوک۔ بریلی۔

اُردو کی کہانیاں

اخلاقی حکایتیں۔ نمبر ۱ سے نمبر ۱ تک۔ اس میں فارسی عربی کتابوں سے مفید اخلاقی قصے لئے گئے ہیں۔ نہایت دلچسپ ہے۔ فی حصہ ۶/

الف لیلہ کی کہانیاں نمبر ۱ سے نمبر ۲ تک فی نمبر ۱۲/
با تصویر فی نمبر عہ/

دل خوش کرنے والی کہانیاں۔ ۶/

بتیسی۔ اس میں بچوں کی ہنسانے والی ۳۲ کہانیاں ہیں اسکا کور نہایت خوبصورت ہے۔ ۱۰/

مشغلے۔ اس میں حسب ذیل پیشے کہانیوں کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ آئی سی ایس۔ ایم ایل اے۔ جہازرانی۔ تجارت۔ وکالت۔ ڈاکٹری۔ انجینیری۔ اڈیٹری۔ معلمی۔ فوجی تعلیم۔ ہوائی جہاز۔ زمینداری یہ کتاب اسکول اور کالج کے طلبا کے لئے نہایت مفید ہے۔ ۱۲/

حالی۔ اس میں حالی کی سبق آموز کہانی ہے۔ ۳/

رشوت۔ اس میں کہانی کے پیرایہ میں رشوت کی خرابی بیان کیا ہے۔ ۱/۶

بہادر لڑکا۔ اس میں محمد علی بانی مصر کے مختصر اور سبق آموز حالات کہانی کے طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ ۴/

استقلال۔ اس میں ایک دلچسپ کہانی سے بچوں کی ہمت بڑھائی گئی ہے۔ ۳/

علم و تجارت۔ اس میں بچوں کو علم حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔ اور بتلایا گیا ہے کہ تجارت بھی بغیر علم کے پورے طور پر کامیاب نہیں ہوتی۔ ۴/

پریوں کی ہنڈیا۔ ۵/

پریوں کی کہانیاں۔ عہ/

طوطا درزی۔ ۸/

ہمارے ہتھیار۔ ۵/

جان برادر۔ ۱۰/

دکھ سکھ مجلد۔ از اعظم کریوی۔ عہ/

ہندوستانی افسانے مجلد۔ از اعظم کریوی۔ عہ/

آئینے مجلد۔ ریاض الحق صاحب علیگ کے افسانوں کا مجموعہ۔ عہ

خندۂ دل مجلد۔ از کوثر چاندپوری یہ ۲۰ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ عہ

دلچسپ افسانے۔ ۴۳ نہایت دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے اسکا حجم ۲۴۴ صفحہ ہے۔ از کوثر چاندپوری مجلد۔ للعہ

گل و لالہ۔ یہ کوثر چاندپوری کے تازہ ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجلد عہ/

بہار و چمن۔ یہ بھی کوثر چاندپوری کے تازہ ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجلد عہ

خندۂ برق۔ کوثر چاندپوری کے افسانوں کا مجموعہ (زیر طبع)

لیل و نہار۔ از کوثر چاندپوری (زیر طبع)

جعفری برادرس۔ انوار احمدی پریس الہ آباد

حضرت سرور جہان آبادی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرور جہان آبادی

ولادت سنہ ۱۸۷۳ء وفات سنہ ۱۹۱۰ء

پیلی بھیت کے ضلع میں ایک چھوٹا سا مگر پرانا قصبہ جہان آباد ہے یہاں کی سرزمین دیہاتی وضع قطع کی ہے اس میں کوئی خاص بات نہیں نہ کوئی مقام یہاں ایسا ہے جو کسی حیثیت سے باعث دلچسپی ہو نہ کوئی یادگار ایسی ہے جو گرد و نواح میں امتیاز رکھتی ہو قصبے میں ہر قوم کے لوگ بستے ہیں سکسینہ کایستھوں کے بھی کچھ خستہ حال گھر ہیں جو قدیم محلوں کے کھنڈروں پر پرانی اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں کایستھ آباد رہے ہیں وہاں علم و ادب کے چرچے کسی زمانے میں ضرور رہے ہیں۔ پرانے کایستھوں کی بستیوں کا ذکر آتے ہی شعر و ادب کا خیال بھی ذہن میں آجاتا ہے۔ جہان آباد میں بھی کسی زمانے میں کایستھوں کے گھروں میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ یہ تو کبھی سنا نہیں کہ یہاں اگلے وقتوں میں کوئی بڑا انشا پرداز یا شاعر ہوا ہو اور ہوا ہو تو ہمیں علم نہیں بہر حال اس میں شک نہیں کہ جہان آباد کے کایستھوں کو بھی فارسی زبان سے اسی طرح انس تھا

جس طرح اگلے زمانے کے اور عام کایستھوں کو اور جہاں کا کایستھوں کے پرانے محلوں کے کھنڈر اُن کی گزشتہ امارت و آسودہ حالی کا پتہ دیتے ہیں وہاں پرانے کایستھ گھرانوں کی تہذیب و معاشرت سے اُن کی علمی عظمت کا نشان بھی ملتا ہے۔ بعض دیگر مقامات کی طرح جہان آباد میں بھی فارسی کا شوق ایک چلا آتا ہے۔ پشت بالپشت ادبی شوق و شغف میں گزر جانے کے بعد آخر دل و دماغ کے ارتقا نے وہ صورت اختیار کی جس نے اُردو دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور جہان آباد جیسی گمنام بستی کو دُور دُور مشہور کر دیا۔ یہ مہر کمال حضرت سرور کے قالب عُنصری کے پردے میں طلوع ہوا۔

سمبت ۱۹۳۶ مطابق ۱۸۷۳ء میں سرور کی پیدائش ہوئی۔ دُرگا سہائے نام رکھا گیا حکیم پیارے لال آپ کے باپ کا نام تھا۔ آپ کا گھرانا پُرانے زمینداروں کا گھرانا تھا۔ یہ زمینداری اب مٹ مٹا کر بزرگوں کی نشانی کے طور پر باقی تھی۔ وجہ معاش کے لئے آپ کے والد نے طبابت کا سہارا لیا۔ گرد و نواح میں اچھے طبیب سمجھے جاتے تھے۔ طب آپ نے بزبان فارسی پڑھی تھی۔ آپ کے بیس[۱] لڑکے ہوئے جن میں پانچ پروان چڑھ کر زندہ رہے انھیں میں سرور تھے۔ شفیق باپ نے آپ کو جہان آباد اُردو اسکول میں داخل کرا دیا۔ آپ نے اوّل نمبر میں یہاں سے مڈل پاس کیا۔ فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں اچھی استعداد بہم پہونچائی کچھ انگریزی بھی نجی طور پر پڑھ لی۔ طب بھی اپنے والد ماجد سے سیکھی اور

---

[۱] یہ حالات سرور کے ایک قریبی رشتہ دار سے ملے جو میرے پاس لکھے ہوئے محفوظ ہیں۔
جگر بریلوی

بہت جلد اس فن میں ماہر ہو گئے۔ دق کے مریضوں کا خصوصیت سے علاج کرتے تھے اور پروردگار نے ہاتھ میں شفا دی تھی۔

آپ کا قد چھوٹا تھا اور جثہ نحیف۔ چہرہ کشادہ، پیشانی اونچی، ناک بڑی، بھونویں اور مونچھیں گھنی گھنی۔ چہرے کے خدوخال صاف اور نمایاں تھے آپ نے نہایت نیک اور معصوم طبیعت پائی تھی۔ مزاج میں حد سے زیادہ حلم و انکسار تھا۔ خیالات میں راستی پاکیزگی اور بلندی تھی۔ اخلاق نہایت شگفتہ تھا جس سے ملتے بڑے خلوص اور تواضع سے ملتے تھے۔ گھر سے جب باہر نکلتے نظر اوپر نہیں اٹھاتے تھے ہر بات میں سادگی و صفائی پسند تھے۔ لباس میں شیروانی زیادہ پہنتے تھے یا کھلے گلے کا لمبا کوٹ۔ غذا میں چاول اور بکری کا شوربہ مرغوب تھا خوراک بہت تھوڑی تھی۔ آپ کے معمولات میں تھا کہ صبح کو گھر سے نکلکر ایک عطار کی دوکان پر آ بیٹھتے اور ڈاکیہ کے منتظر رہتے۔ ڈاکیہ آتا کچھ منی آڈر دیتا اور کچھ خطوط۔ خطوط میں زیادہ تر نظموں اور غزلوں کی فرمائشیں ہوتیں منی آڈروں میں نذرانہ۔ بعض خطوط کے جواب میں وہیں بیٹھے بیٹھے نظمیں لکھ کر بھیجدیتے تھے۔

پیسہ آپ کے ہاتھ میں نہیں رکتا تھا ادھر آیا اُدھر گیا۔ اِس لئے ہمیشہ پریشان حال رہتے تھے کچھ عرصہ تک کسی رئیس زادے کے اتالیق رہے پھر دو تین سال دفتر زمانہ میں کام کیا۔ ادھر معیشت کی بے اطمینانی اُدھر شریفانہ وضعداریوں کا نباہنا، اُجلا رہن سہن، مزاج میں وارفتگی، بڑی کشمکش کا سامنا تھا جس سے مجبور ہو کر اپنی نظمیں کوڑیوں کے مول لٹانے لگے۔ آپ کی بہت سی

نظمیں اور بے شمار رباعیاں مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہوئیں انھیں نظموں میں ایک مجموعہ "اکسیر سخن" ہے جو کالیداس کے رتو سنگھار کا منظوم ترجمہ ہے اور نیچرل شاعری کا بے نظیر نمونہ۔ رسالہ زمانہ بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۱۵ء میں سرور اور شاکر کے عنوان سے ایک مفصل مضمون درج ہے اس میں خود شاکر صاحب کے خطوط سے ثابت کیا گیا ہے "اکسیر سخن" اور بعض دوسری نظمیں جو اُن کے نام سے شائع ہوئیں سرور کی تصنیف تھیں۔ اس کے بعد زمانہ اپریل و مئی سنہ ۱۹۱۵ء میں منشی نوبت رائے نظر لکھنوی نے اپنے ذاتی علم سے انھیں واقعات کی تصدیق کی۔

صرف پریشان حالی ہی آپ کا نوشتہ تقدیر نہیں تھی۔ قدرت نے آپ کو اندوہ و الم کے لئے چھانٹ لیا تھا۔ عین عالم شباب میں بیوی نے قضا کی۔ زندگی کی نشاط انگیزیوں اور آسائشوں کا خاتمہ ہو گیا۔ عزیز و اقربا نے ہر چند سمجھایا مگر آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ سچ ہے۔

ایک ہی بار عشق ممکن ہے   کہ جگر ایک زندگانی ہے

آپ کی بیوی دو سال کا ایک بچہ اپنی یادگار چھوڑ گئی تھیں یہی آپ کی روح کی راحت، زندگی کا سہارا اور آرزوؤں کی دنیا تھا نو سال کی عمر میں غمزدہ باپ کو یہ بچہ بھی داغ مفارقت دے گیا۔ یہ دو ایسے سانحات تھے جن سے آپ کا کلیجہ پاش پاش ہو گیا جب آپ اپنے لخت جگر کو سپرد خاک کر کے گھر پلٹ رہے تھے راستہ میں اپنے دوست ایک زمیندار منشی عبداللہ خاں کے مکان پر بیٹھ گئے۔ چہرے پہ مہر سکوت ہونٹ ٹھنڈی ہو گئیں آنکھیں خشک

معلوم ہوتا تھا ایک طوفان سینے میں دبائے بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر میں کلیجے کے ٹکڑے ایک کاغذ پر نکالکر رکھدیے جو "دل بیقرار سو جا" کا نغمہ بنکر ہندوستان کے گوشے گوشے میں گونج گئے۔ سنیئے۔

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دل بیقرار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سو جا

یہ تیری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا مرے رازدار سو جا

ابھی دھان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تڑپ کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سو جا

مجھے خوں رلا رہا ہے تیرا دمبدم تڑپنا
تیرے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سو جا

تجھے جن کا ہے تصور ارے مست جام الفت
انھیں انکھڑیوں کے صدقے میرے بادہ خوار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے شب غم بری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم دل بیقرار سو جا

اگرچہ سرور کو مقتضیات وقت کے مطابق اردو مڈل اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا لیکن آپ کے علمی مذاق کی تربیت باپ کے سایہ عاطفت میں ہوئی بلکہ شاعری کے ساتھ ساتھ ذہانت و ذکاوت بھی آپ کو قدرت نے بدرجہ اتم عطا کی تھی۔ عالم باپ کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھوڑے ہی دنوں میں فارسی کی تمام درسی کتابیں پڑھ لیں چوٹی کے اساتذہ شعرا کے دیوان بھی دیکھ ڈالے۔ شاعری بھی اوائل عمر سے ہی شروع کر دی اور اس فن میں کسی سے اصلاح[1] نہیں لی۔ جن کا لستھ گھرانوں میں فارسی کا

---

[1] خواجہ عشرت نے اپنے تذکرے ہندو شعرا میں سرور کے کسی استاد کا تذکرہ کیا ہے یہ غلط ہے جگر بسوی

چرچا رہا ہے وہاں تصوف بھی نسلاً بعد نسلٍ میراث میں چلا آیا ہے۔ سرورؔ پر
بھی تصوف کا گہرا رنگ چڑھا اور بچپنے ہی سے حسن بے رنگ کی محبت
آگ بن کر ان کے سینے میں روشن ہوئی اُس حسن بے رنگ کی محبت جس کے
جلوؤں پر پروانہ ہونے کے لئے کائنات بیتاب نظر آتی ہے۔

سرورؔ پیدائشی شاعر تھے آپ کا کلام ملک میں بے انتہا مقبول ہوا
آپ کی نظموں کا لوگوں کو بےچینی سے انتظار رہتا تھا۔ رسالہ "ادیب" اور رسالہ
"زمانہ" کے اوراق آپ کی نظموں سے خاص طور سے مزین ہوتے تھے۔ آپ کے
کلام کی کشش خواجہ الطاف حسین حالیؔ کو جہان آباد کھینچ لے گئی جب خواجہ صاحب
آپ کے مکان پر وارد ہوئے تو آپ زنانخانہ میں شراب کے نشہ میں چور ایک
ٹوٹی چارپائی پر مدہوش پڑے تھے آپ کے والد ماجد نے معزز مہمان کو اپنے
دیوان خانے میں ٹھہرایا اور بیٹے کو اٹھا کر غسل کرایا کپڑے بدلوائے
اور ملاقات کے لئے باہر بھیجا۔ بڑی دیر تک خواجہ صاحب آپ کی نظمیں
سن سن کر سر دھنتے رہے۔

آپ کو اپنے کلام کی اشاعت کا بڑا ارمان تھا۔ رسالہ ادیب الٰہ آباد
کے پریس میں آپ کی نظموں کا مجموعہ زیر طبع تھا اور آپ پروف صحیح
کرنے کے لئے الٰہ آباد جانے والے تھے کہ پیام اجل آپہونچا۔ دل کا ارمان
دل ہی میں رہ گیا۔ مرنے کے بعد دو جگہ سے آپ کے کلام کے مجموعہ
شائع ہوئے "جام سرور" دفتر رسالہ ادیب" سے اور "خمخانہ سرور" دفتر
زمانہ" سے۔ دونوں مجموعے ہاتوں ہات بک گئے چند ہی دنوں میں ناپید

ہو گئے ۔ کچھ عرصہ بعد قاضی محمد غوث فضا حیدرآبادی نے ایک مجموعہ خمکدۂ سرور کے نام سے غالباً[1] ۱۹۳۰ء میں شائع کیا ۔ اس میں پچھلے دونوں مجموعوں سے نظمیں جمع کی ہیں ۔ یہ مجموعہ اگرچہ بہت ناقص چھپا ہے تاہم قاضی صاحب کی ہمت و قدردانی پر دال ہے ۔ اتنے بڑے شاعر کو کچھ عرصہ کے لئے آپ نے مٹ جانے سے بچا لیا ۔

یوں تو آدمی ہمیشہ جینے کی لئے نہیں آیا ہے اور پیدا ہونا ہی مرنے کی تمہید ہے لیکن جو انسان اپنی طبیعی مدت حیات پوری کر کے مرتا ہے اُس کی موت قدرت کا دستور دیرینہ سمجھی جاتی ہے اُس کے بچھڑ جانے کا چنداں غم نہیں ہوتا لیکن جو قبل از وقت مر جاتے ہیں خصوصاً وہ جن کی ذات سے قوم کی کچھ اُمیدیں بندھی ہوں ، بڑا صدمہ پہونچاتے ہیں ۔ ہندوؤں میں نسیم[2] ، برق[3] اور سرور یہ تین ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اردو دنیا میں چکا چوند کا عالم پیدا کر دیا ۔ ان کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں ۔ لیکن عجب اتفاق ہے اور انتہائی بدقسمتی کہ تینوں کو عالم شباب میں ہی موت آئی ۔ نسیم کو ہیضہ ہوا برق کو طاعون اور سرور کو غم و اندوہ نے ڈھا دیا ۔ ضعیف الجثہ اور منحنی آدمی اس پر صدموں کی یہ شدت کہ عین شباب میں پہلے بیوی کو موت آئے پھر اکلوتا بیٹا داغ مفارقت دے ۔ گوشت و پوست کا پتلا کیا تاب

---

[1] غالباً اس لئے کہ کتاب پر سن تصنیف درج نہیں [2] پنڈت دیا شنکر نسیم [3] منشی جوالا پرشاد برق ۔

جگر بریلوی

لاسکتا ہے لیکن جب تک موت نہیں آتی زندگی کے دن اور رات تو کاٹنا ہی
پڑتے ہیں، وہ لاکھ تلخیوں سے سہی۔ انھیں تلخیوں کو گوارا کرنے کے لیے سرور
نے بادۂ ناب کا سہارا لیا۔ یہ بلا ایسے لپٹی وہاں آپ کے ایسی تمنائی کہ بستر
علالت پر بھی جو بستر مرگ ثابت ہوا نہ چھوٹی۔ ذات الجنب میں مبتلا تھے۔ بڑی
احتیاط سے علاج ہو رہا تھا۔ شراب کی سخت ممانعت تھی لیکن آپ بار بار
شراب مانگتے تھے جب ایک دفعہ خدمتگار نے بجائے شراب کے پانی کا گلاس
دیا تو ہنسکر فرمایا۔

بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے ۔۔۔ سمجھ لیا میرے ساقی نے بدحواس مجھے

آخر حالت ردی ہوتی گئی۔ علاج معالجہ کچھ کام نہ آیا۔ دعائیں بے اثر رہیں ۳
دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو روح قالب عنصری سے پرواز کر گئی۔ دنیائے ادب میں کہرام مچ گیا
نوحے اور وفات کی تاریخیں مدتوں تک نکلتی رہیں حضرت محشر لکھنوی
کی تاریخ خوب ہے۔

ختم کر محشر بس اتنا کہکے رسم تعزیت ۔۔۔ اب ملے گی مشکلوں سے مرنے والے کی مثال

کلام سرور پر تبصرہ کرنے سے پہلے چند نامور ادیبوں کی وہ رائیں پیش کرتا ہوں
جو وقتاً فوقتاً آپ کی شاعری کے متعلق ظاہر ہوتی رہی ہیں۔

الہ آباد یونیورسٹی اردو ایسوسی ایشن میگزین سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں جناب محمد سلیم صدیقی
(لکھنؤ یونیورسٹی) صفحہ ۳۵ پر لکھتے ہیں۔

"فطری شاعری کا سب سے اول اردو میں رواج دینے کا سہرا محمد حسین آزاد
اور حالی کے سر ہے لیکن ہندوؤں میں جس شخص نے انتہائی عروج تک پہونچایا وہ

سخنور باکمال شاعر نازک خیال منشی درگا سہائے سرور ہیں جنہوں نے اپنی جدت طرازی و معجز بیانی سے اردو شاعری کے قالب مردہ میں ایک نئی روح پھونکنے میں بیش قرار حصہ لیا۔ فطرت نگاری اور محاکاتی قدرت نے اس کو قابل فخر بنایا آپ کی رنگین مزاجی نے قدرت کی صناعی کو چار چاند لگائے اگر کہیں گل و بلبل کا ذکر بھی کیا ہے تو اعلےٰ مضامین باندھے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے حیات انسانی کا کوئی اہم واقعہ بیان کیا ہے۔ کلام میں بجائے پھیکے پن کے حد درجہ کی حلاوت اور شیرینی ہے جو دوسرے شعرا کے کلام میں خال خال ہے۔ جمکدہ سرور میں مولوی سید سجاد صاحب ایم۔ اے۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کالج حیدرآباد دکن لکھتے ہیں:۔

"عمدہ کلام کی پہچان کے لئے ملٹن نے تین شرطیں قرار دی ہیں یعنی یہ کہ کلام اصلیت پر مبنی ہو، سادہ ہو اور جوش سے بھرا ہو۔ سرور کے کلام میں ملٹن کی آخری شرط بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کوئی شعر یا کوئی نظم ایسی نہیں جس میں جوش کا دریا لہریں نہ لیتا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پہلو میں ایک حساس اور دراک دِل تھا جو کائنات کی ہر شے سے متاثر ہوتا تھا اور انسان کی حیات کے حالات کو دلچسپ تماشا سمجھ کر ان سے لطف اٹھاتا تھا۔ سرور کی زبان نہایت شستہ اور بیان لطیف ہے بندشیں درست اور تشبیہیں دلکش لیکن خیال میں کسی قدر تناکت پائی جاتی ہے"۔

اسی کتاب میں حضرت شبیر حسن جوش شاعر انقلاب لکھتے ہیں۔

"منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی کے مجموعہ کلام کو میں نے

جستہ جستہ پڑھا جس کا میرے دل پر خاص اثر ہوا مرحوم سینے میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے"

جھوٹی اور مہمل شاعری کو جو آجکل اُردو کی دُنیا میں ہر طرف غالب نظر آرہی ہے سرورؔ نے کبھی مُنہ نہیں لگایا وہ جو چیز محسوس کرتے تھے اُسی کو نظم کرتے تھے اور اس طرح نظم کرتے تھے کہ اشعار کے اندر ان کا دِل دھڑکتا ہوا نظر آتا تھا یہ بالکل درست ہے کہ سرورؔ کے سے شاعر کم پیدا ہوا کرتے ہیں"

اسی کتاب میں مولانا حسرت موہانی کی یہ رائے درج ہے۔

"سرورؔ جہان آبادی اُردو کے ایسے بلند پایہ شاعر تھے جن کی لاجواب نظمیں اُردو رسالوں کی زیبائش ہوا کرتی تھیں۔ ہماری نظر سے اُن کی کوئی ایسی نظم نہیں گزری جس کے پڑھنے کے بعد دِل سے بے اختیار تحسین و آفریں کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ نسیمؔ لکھنوی کی مرگ بے ہنگام کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے جس کا ماتم دُنیائے ادب کے ہر گوشے میں ہوگا اگر سرورؔ کی زندگی وفا کرتی تو خدا جانے اُن کی شاعری کا مرتبہ کہاں سے کہاں تک پہونچ جاتا۔ اِس قلیل مدت میں جو کچھ وہ کر گئے وہ بقائے دوام کی سند حاصل کرنے کو کافی ہے"

اِسی کتاب میں "سرورؔ کی نسبت" کے عنوان سے تحریر ہے:۔

"سرورؔ جہان آبادی کی نظمیں دِل میں جذبات کا تلاطم برپا کر دیتی ہیں اِن کی شاعری میں ایک بحرِ ناپیدا کنار کی سی روانی ہے۔ اِن کی طبیعت سمندر

کی طرح گہری ان کا خیال سرِ فلک پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح بلند تھا شعر کہنے بیٹھتے تو کاغذ پر اپنے جگر کے ٹکڑے نکال کر رکھدیتے۔ جو سوز و گداز ہم کو سرورؔ کے کلام میں ملتا ہے اُسے کسی دوسرے شاعر میں ڈھونڈھنا فضول ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں شاعری کے لیۓ بنایا تھا اور شاعری کے سوا انھیں کچھ اور آتا ہی نہ تھا" ڈاکٹر بیلی اپنی کتاب اے ہسٹری آف اردو لٹریچر میں لکھتے ہیں :-

"Surur Jahanabadi is one of the most remarkable of recent poets..He was an Indian first and foremost; being a Hindu he was able to enter into a phase of Indian life little touched by Quli Qutab Shah and Nazir."

"He was specially fond of nature-subjects and those which brought out the inherent tenderness of his character: His inaquiation was vivid and his command of language great. He liked simplicity and preferred vernacular Hindi words to those taken from Arabic and

Persian. He never had a poetical teacher and was, therefore, free from the fathers that bound many of his fellow poets. Urdu poetry referred a great loss in his premature death."

رسالہ نگار جولائی ۱۹۳۶ء میں مولانا نیاز فتحپوری صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں:
"خمکدۂ سرور" سرور جہان آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی محمد غوث صاحب فضا حیدرآبادی نے شائع کیا ہے سرور ان شعرا میں سے تھے جنھوں نے موجودہ دور شاعری کی طرح ڈالنے میں حصہ لیا تھا اور جن کی خدمات کو اردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی اس کے قبل ان کا مجموعہ کلام جام سرور اور خمخانۂ سرور کے نام سے زمانہ پریس کانپور اور انڈین پریس الہ آباد شائع کر چکے ہیں لیکن یہ ضرور نہیں کہ سرور ایسے شاعر کا ذکر بار بار نہ کیا جائے۔
سرور کے کلام کی مستی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ زندہ رہیگی اور دنیا کو کوئی حق حاصل نہیں کہ اسے فراموش کردے"

کلامِ سرور

کشتۂ عشق ہمہ تن سوز ہو وہی دل چاہیئے | شعر کہنے کے لئے عالم نہ فاضل چاہیئے

کوئی علم و فن ہو اس کے حاصل کرنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔
ایک وہ جو اس سے قدرتی مناسبت رکھتے ہیں دوسرے وہ جو بالکل مناسبت نہیں رکھتے۔ مناسبت کے بھی مدارج ہیں۔ بعض لوگوں کے

جوہر رفتہ رفتہ چمکتے ہیں اور عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے لیکن بعض
ہستیاں ایک آب و تاب کے ساتھ وجود میں آتی ہیں اور گرد و پیش
کی تاریکیوں میں چکا چوند کا عالم پیدا کرتی ہوئی آنِ واحد میں آنکھوں
سے اوجھل ہو جاتی ہیں جس طرح آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں۔ سرور
سرور بھی اسی طرح آسمانِ سخن پر نمودار ہوئے اور ادبی دنیا میں نور
برساتے ہوئے دیکھتے دیکھتے روپوش ہو گئے۔ سرور کے کلام پر تبصرہ کرنے
سے پہلے شاعری کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔ اس فن پر لوگوں نے
دفتر کے دفتر لکھے ہیں اور لکھے جا سکتے ہیں۔ میں بہت مختصر طور پر چند
سطریں لکھوں گا۔ اردو ادب میں تنقید کا سلسلہ انگریزی ادب کی برکت
سے پڑا اس لئے ہمارے بہت سے علما اور ادیب، وہ بھی جو انگریزی
نہیں جانتے، انگریزی مصنفوں کے اقوال سے شاعری کے معنی سمجھاتے
ہیں اور ملٹن، میکالے، فریڈرک رابرٹسن، کولرج، شیلی وغیرہ نے جو شاعری
کی تعریفیں کی ہیں ان سے اپنے بیانات کی وضاحت کرتے ہیں۔ میں نے
بھی بہت سے انگریزی شعرا کا کلام دیکھا ہے اور اس سے بے انتہا
محظوظ ہوا ہوں لیکن جو چیز میری روح میں بسی ہوئی ہے وہ تلسی داس،
سور داس، کبیر داس، میرا بائی وغیرہ کا متھا ہوا امرت ہے۔ اسی سے
میرا نظریۂ شاعری قائم ہوا ہے۔ میرا خیال بلکہ عقیدہ ہے کہ شاعر کا مقصد
حیات اس باطنی موزونیت اور یگانگت کو محسوس کرنا اور خود اس سے
ہم آہنگ ہو جانا ہے جو دنیا و جہان کے ذرے ذرے میں جاری

وساری ہے اور جس کے باعث ہر ذرہ ایک دوسرے سے مربوط و منسلک ہے۔ اس عالمگیر یگانگت اور ہمہ گیر موزونیت کے احساس میں سرور ابدی ہے اسی احساس کا نام شاعرانہ کیفیت ہے اور اس کے اظہار کا نام شاعری اسی باطنی یگانگت کا شاعر درس دیتا ہے درس ہی نہیں دیتا بلکہ اپنے نغموں سے اس ابدی لطف و سرور کی لذت بھی چکھا دیتا ہے۔ اس یگانگت اور موزونیت کی ترکیب ان اجزا سے ہوئی جنھیں نیکیاں کہتے ہیں اور جو ازلی حسن کا دوسرا نام ہے۔ شاعر کا ذہن رسا انھیں نیکیوں کا انکشاف کرتا ہے اس کی چشم بصیرت ان جوہروں کو تلاش کرتی ہے جن کی آب و تاب میں حسن ازل پرتو افگن ہے اس کی ذلت ان ملکوتی صفات کا سرچشمہ ہوتی ہے جو رشیوں منیوں اور پیغمبروں کا ورثہ ہیں اس کی وسعت نظر میں دونوں عالم ایک نقطہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اس کی شیریں بیانی سے پتھر پگھل جاتے ہیں۔ اس کے نغموں پر کائنات وجد کرتی ہے۔ اس کی زبان سے وہ راگ نکلتے ہیں جو نیند کے ماتوں کو اس طرح گدگدا کر بیدار کر دیتے ہیں جس طرح نسیم سحری کے جھونکے اور جاگنے والوں کی روح میں پیوست ہو کر ان کے شعور میں ازلی نور و سرور بھر دیتے ہیں۔

اوپر کی سطروں میں جو کچھ بھی کہا گیا وہ شاعری کی روح سے متعلق ہے۔ بہ اعتقاد فن شاعری الفاظ، بندش الفاظ اور طرز ادا کے توازن کا نام ہے جس کا مقصد تاثیر پیدا کرتا ہے۔ تاثیر کی مختلف صورتیں ہیں، جوش، روانی، شوکت، شیرینی، لطافت وغیرہ لیکن ایک خاص صورت تاثیر کی ہو رہی ہے

درد بغیر چوٹ کھائے ہوئے نہیں پیدا ہوتا چوٹ وہی دل کھا سکتا ہے جو نرم ہے پتھر کیا چوٹ کھائے گا۔ نرمی اور معصومیت ایک ہی جوہر کے مرکب ہیں۔ نرم اور معصوم دلوں میں بہت جلد ٹھیس لگتی ہے اسی ٹھیس سے درد پیدا ہوتا ہے جو بڑھتے بڑھتے ایک دن عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور تمام عالم اُس میں سما جاتا ہے۔

پہلے کر عشق مجازی تا حقیقت ہو عیاں راہ مشکل ہے سفر منزل بمنزل چاہئے

حُسن جہاں شاعری کا خالق ٹھہرا۔ دِل اُس جہان کی جلوہ گاہ۔ حسن و دل کے رابطہ کا نام عشق پڑا۔ اس رابطہ سے جو لاتعداد اور بے شمار لطیف و نازک کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ان کو محسوس کرنا اور بیان کرنا شاعر کا کام ہے محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کے لئے حکیمانہ اور فلسفیانہ دقیقہ رسی کی نگاہ محتاج ہے۔ اب کہہ سکتے ہیں کہ شاعر وہ ہے جو بچوں کی سی معصومیت، عاشق کا دِل اور فلسفی کا دماغ رکھتا ہو ان خصوصیات پر نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کہ سرور شاعر تھے صداقت سے زیادہ قریب نہیں بلکہ پھر کہنا زیادہ صحیح ہے کہ شاعری کی دیوی نے سرور کے قالب میں جنم لیا تھا۔ وہ ہمہ تن شاعر تھے، سرتاپا شاعر تھے۔ اُن کے رگ و پے میں خون کے بجائے شاعری کی کیفیتیں بجلی بنکر دوڑتی پھرتی تھیں۔

سرور نے شاعری کے میدان میں اُس وقت قدم رکھا جب پُرانی طرز کی شاعری کے خلاف آواز اٹھائی جا چکی تھی اور جدید رنگ یعنی نیچرل شاعری کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ انگریزی۔ تعلیم و تہذیب کے رواج

سے اہل ملک کے خیالات میں تبدیلیاں پیدا ہو چلیں تھیں۔ لوگ ہر علم و فن کو اس نظر سے دیکھنے لگے تھے کہ وہ کہاں تک مادی ترقی میں مدد دیتا ہے قوم کی بیچارگی، مفلسی اور زبون حالی بھی اسی خیال کی معاون ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ اردو شاعری کا مذاق نہایت پست اور مبتذل ہو گیا تھا۔ ایک بازاری عورت کے بناؤ چناؤ چھیل چھبیل، ناز نخروں اور چونچلوں سے زیادہ اس کی حقیقت کچھ نہیں رہی تھی حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا۔

غزل اور قصیدہ کا ناپاک دفتر | عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

سرور اردو شاعری کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

شاعروں نے اپنی طرز سے ڈھالا تجھے | کر دیا اس پر ملمع تھا جو کندن سا بدن
زلف میں شانہ کیا کاجل لگایا آنکھ میں | بھینی بھینی بدھیاں پھولوں کی گہنا زیب بدن
کچھ عجب انداز سے کھینچا ترا نقش وجود | کر دیا معدوم دونوں کو کمر کیا کیا دہن
رخ پہ گلگونہ ملا منہدی لگائی ہاتھ پہ | رنگدیا رنگ تصنع میں ترا سارا بدن

اسی سلسلہ میں آگے کہتے ہیں۔

او تخیل قوم او دلدادہ رنگ نشاط | او شہید جلوہ حسن بتان سیم تن
تا کجا سرگرم افکار پریشان کمر | تا کجا نکتہ طراز فکر مضمون دہن
او خود آرا تا کجا ترتیب بزم حسن و عشق | کب سے ہے اجڑی پڑی افسوس تیری انجمن
کچھ خبر بھی ہے تجھے اے بیخبر کے ملتے ہوئے | بن رہی ہے اب تری شہر خموشاں انجمن
اب تو سو کر اٹھ کہ سوتے سوتے صدیاں ہو گئیں | اب تو تو کروٹ بدل بدلا زمانے نے فیشن

اب تو کر دے مُرغِ دِل کو دامِ گیسو سے رہا — سامنے ہے خوشنما نیچر کے پھولوں کا چمن

پُرانے طرز کی شاعری کی جگہ جس شاعری نے لی اُس میں خاص موضوعات دو قسم کے ہوتے تھے ایک قدرتی مناظر اور ملکی متعلقات دوسرے قومی حالات و جذبات۔ قدیم شاعری پر ماتم کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ سرور کہتے ہیں۔

کچھ بھی آتا ہی نہیں ہرزہ سرائی کے سوا — ہند میں کہنے کو گو ہیں سیکڑوں اہلِ زباں
ان سے ہوتا کیا ہے مُنہ پر صاف کہہ دو برملا — جن کے مضمونوں میں حسن و عشق کی ہے داستاں
مل گیا کیا آگیا جو بات مضمون کمر — کیا ہوا باندھا دہان یار کو جو بے نشاں
میں بھی دیکھوں تو وہ اصنام خیالی ہیں کدھر — ہے کمر معدوم جن کی اور دہن ہے بے نشاں
جنبش لب سے ہوا زندہ نہ عاشق ایک بھی — سر ٹپک کر مر گئے لاکھوں مسیحائے زماں
کس کو اعجاز مسیحائی کا دعویٰ ہے تو — ڈالتا ہے کون دیکھیں قوم کے مردے میں جاں

سب سے پہلے آزاد اور حالی نے اِس دقیانوسی شاعری سے بیزاری ظاہر کی اور اس کے عیوب دکھائے۔ اس کی جگہ نیا رنگ بھی پیش کیا۔ اِن بزرگوں نے انگریزی نظموں کے ترجموں سے یہ شعور حاصل کیا اور انھیں سے نئے رنگ کا معیار قائم کیا۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ میں ننگے بوچے خیالات باقی رہ جاتے ہیں، زبان کی لطافتیں، نزاکتیں اور الفاظ کا نغمہ باقی نہیں رہتا اور اِن سب سے مِل کر جو شاعری کی روح پیدا ہوتی ہے وہ تو بالکل پرواز کر جاتی ہے لہٰذا ہمارے اِن موجدوں نے پاکیزگی خیال اور بلند بینی کو شاعری کا اصل جوہر سمجھ لیا اور اسی پر زور دیا خود بھی جو نمونے پیش کئے اُن میں

خیالات تو پسندیدہ ضرور ہیں لیکن وہ شاعری نہیں ہے نہ اُس میں حسن ادا ہے نہ لطف بندش، نہ سرور نغمہ سرورؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نیچرل شاعری کے بے جان قالب میں تاثیر کی روح پھونکی۔ اِس بچے کو جو ابھی محض ایک مضغہ گوشت تھا سڈول ہاتھ پانوں اور موہنی صورت عطا کی اور پھر بنا سنوار کر ایک حسین و جمیل دلھن بنا دیا۔ ایسی دلھن جس کی ہر ادا دلکش اور ہر انداز جاں نواز ہے جس کے حسن و جمال کے اثر سے آنکھوں کو نور، دِل کو سرور اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے کہ بہ اعتبار فن شاعری الفاظ بندش الفاظ اور طرز ادا کے توازن کا نام ہے جس کا مقصد تاثیر پیدا کرنا ہے بعض لوگ شاعری کو صرف فن کی نظر سے دیکھتے ہیں اور محاسن صوری میں اسے ختم سمجھتے ہیں بعض معنویت کو بھی شاعری کے ترکیبی اجزا میں شمار کرتے ہیں میری رائے میں حسن معنی اور حسن صورت دونوں ہی شاعری کے اجزائے لاینفک ہیں کیونکہ بغیر حسن معنی کے شاعری ایک جسم ہے بے روح۔ ایسی شاعری اپنے اعلےٰ مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ اس کے پرستاروں میں پیغمبرانہ شان نہیں پیدا ہو سکتی۔ اِن کو تلامذالرحمٰن کا لقب نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت سرورؔ کا کلام دونوں محاسن کا آئینہ ہے۔ اِس باکمال شاعر نے ارفع و بلند خیالات، گوناگوں ملکی خصوصیات وکیفیات اور حقائق و معارف کو دلی جذبات کی تصویروں میں نمایاں کر کے رنگین بیانی، مرصع سازی، اور نغمہ آفرینی سے حیات جاوید

بخش دی ہے اِس پُر بحرزخار کے سے جوش و روانی چمن شاداب کی سی تازگی و رنگینی، نسیم سحری کے سے اہتزاز و لطافت نے کلام کو طلسم خانۂ حیرت بنا دیا ہے۔ سوز و گداز کا تو عالم ہی نرالا ہے۔ حرف حرف اور نقطے نقطے میں محبت کی چنگاریاں ہیں۔

مندرجہ بالا خوبیاں اِس لطیف انداز سے کلام میں سموئی ہوئی ہیں کہ کسی خاص خوبی کے زیر عنوان مثالیں پیش کرنا فن تنقید کے ناقص ہونے کی دلیل بن جاتا ہے بہر حال کچھ عنوانات تو قایم کرنا ہی پڑینگے۔ اول معنویت کو لیجئے۔ شاعر کا کلام اُس کی سرشت و سیرت کا آئینہ ہوتا ہے جو کچھ وہ کہتا ہے اُس کے جذبات، خیالات، رجحانات اور معتقدات ہوتے ہیں ہر شعر سے خود اُس کے خمیر کا رنگ ٹپکتا ہے۔ شعر کی تہذیب و ترکیب اُس کے نظام باطن کی ترتیب و تہذیب کا نقشہ ہوتی ہے۔ ترنم اُس کی طبع حسن پرست کے کیف و سرور کی خاموش آواز کا نام ہے جس کی ابتدا موزونیت سے ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ شاعر کے کلام میں خود اُس کی روح تاثیر بنکر سمائی ہوتی ہے۔

یہ کہنا بہت تھوڑی بات ہے کہ سرور ازل سے ایک درد مند اور حساس دِل لیکر آئے تھے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اُن کے رگ و ریشہ میں درد ہی درد تھا اِس پر روح فرسا سانحات کا پیش آنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ناکامی یاس، حسرت، افسردگی و افسردہ حالی کا مجسمہ بنکر رہگئے۔ غم کی فراوانی نے غم کی غایت پوری کی اُن کی پاکیزہ سیرت پاکیزہ تر ہو گئی

اُن کا کلام اسی کا آئینہ ہے۔ اُن کی روح میں وہ تڑپ بھی جو حسنِ مجازی کے اثر سے حسنِ حقیقی کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ ہزار ہزار رنگ سے یہ آگ اُن کے کلام میں شعلہ زن ہے۔ اسے رسمی سوز و گداز نہیں کہہ سکتے ان کا دِل محبت کا آتشکدہ تھا اور کلام اُس کی گرمی و نور ہے۔

وہ داغ ہوں کہ شعلۂ برق فنا ہوں میں
وہ اشک خوں ہوں میں کہ ہوں طوفان طرازِ عشق
پروانۂ اجل ہوں میں اے شمع انجمن
مجھ سے نہ پوچھ قصۂ سوز و گداز عشق

محبت کی آگ اپنے سوا سب کچھ جلا دیتی ہے اور یہی اُس کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اِس میں نفس اپنے تمام لشکر کے ساتھ جل بُھنکر خاکستر ہو جاتا ہے۔ باطنی گہرائیوں میں نور پھیل جاتا ہے۔ طبیعت وہ آئینہ مجلا ہو جاتی ہے جس میں حسن کے جلوے بے نقاب نظر آتے ہیں یہ جلوے دریائے محبت کو ہر سانس پر متلاطم کرتے رہتے ہیں۔ دِل مضطربانہ و والہانہ انداز سے ایک ایسے جلوہ بے محابا کا تقاضا کرتا رہتا ہے جو بیک نمود طالب دیدار پر تجلی گرا کر اُسے اپنے آغوش میں لے لے۔ حضرت سرور کا دِل بھی لذت فنا کے لئے بیتاب تھا۔ ذرے ذرے میں حسن رنگین کی جلوہ نمائیاں اُن کے دِل کی بیتابیوں کو تجلیاں بنائے رکھتی تھیں اور وہ تڑپ تڑپ کر یہی آرزو کرتے تھے۔

جل کے لپٹوں تجھ سے میں اے شعلۂ جانسوز غم

وارفتگان محبت کی نگاہوں میں گل و خار کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ کانٹے اور پھول دونوں میں اُنھیں محبوب ہی کی دلآرا ادائیں نظر آتی ہیں

وہ دونوں میں اسی کے حسن کے کرشمے دیکھتے ہیں حضرت سرور کو جو "مار
یاسمین کے پیچ و خم" تڑپا دیتے ہیں اس کا یہی راز ہے وہ اس بیخودانہ
اور والہانہ الفاظ میں اس کے مخاطب ہوتے ہیں جو بے اختیار ایک
طولِ شبِ فراق کے مارے ہوئے عاشق کے منہ پر آجاتے ہیں جب
وہ اپنے محبوب جاں نواز سے دوچار ہوتا ہے۔ حسرت بھرے دل کا
پہلا ارمان بے اختیار زبان پر آجاتا ہے اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

آ کلیجے سے لگالوں تجھ کو مار یاسمین

اب وہ شاعر مار یاسمین کی ایک ایک ادا کو ڈوب ڈوب کر بیان کرتا
ہے اور جتنا ڈوبتا ہے حسن کی بھڑکتی ہوئی کرشمہ سازیاں اس کے دل
میں آگ لگاتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہے حسن پرستی۔

آ کلیجے سے لگالوں تجھ کو مار یاسمین — ہیں کسی گیسو کے خم تجھ میں کسی ابرو کے چین
یہ قیامت کی شکن اور یہ بلا کے پیچ و خم — آہ! کس کافر ادا کی تو ہے زلفِ عنبریں
ہے ترے حسنِ سیہ سے دل کو اک دلبستگی — قیس میں ہوں آہ تو ہے لیلائے محمل نشیں
آہ ظالم اُف رے تیری گرمیِ جانسوزِ حسن — دل کو پھونکے دیتی ہے تیری نگاہِ آتشیں
مجھ کو وہ لذت ہے ملتی آہ تیرے زہر میں — میں سمجھتا ہوں کہ ہے تیری زباں انگبیں
شب کو بانبی سے دلہن بنکر نکلتا یوں ہے تو — بال کھولے گھر سے نکلے جیسے کوئی مہ جبیں
گرمیوں میں جیسے صندل ہے حسینوں کو پسند — ڈھونڈھتا پھرتا ہے تو بھی یوں ہی شاخِ [illegible]
پھن اُٹھا کر آہ مستی میں وہ لہرانا تیرا — جیسے ہو جوبن کی متوالی کوئی ناز آفریں
سبزہ زاروں میں ہے شب گو اک عروسِ نیم [illegible] — دن کو بانبی میں ہے تو اک شاہدِ پردہ نشیں

او فسونگر آہ میں ہوں کشتۂ زلف دراز
مجھ کو ڈس لے تیرے ڈسنے کا مجھے شکوہ نہیں
تجھ سے میرے گیسوؤں والے کی ملتی ہے ادا
میری نظروں میں تو ہے تو سو حسینوں کا حسیں
او ستمگر آہ کب کالا سمجھتا ہوں تجھے
میں تو اپنا گیسوؤں والا سمجھتا ہوں تجھے

طوالت کے خوف سے صرف ایک بند نقل کیا گیا ہے۔ ایک ایک شعر سے شاعر کی قلبی کیفیتوں کا حال آئینہ ہے۔ بعض لوگوں کو ہنسی آئیگی کہ سانپ جیسے کیڑے میں بھی اتنا حسن ہو سکتا ہے کہ کسی کو بیتاب کر دے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بعض سانپ بہت حسین ہوتے ہیں اُن میں کالا بھی ایک ہے پھر حسن کا تعلق نظر سے بھی ہے۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مدعا یہ ہے کہ حضرت ہیرؔ و حسن قدرت کی کرشمہ سازیوں سے ایسے بیقرار ہو اُٹھتے تھے کہ سوا آتش عشق میں فنا ہو جانے کے انھیں اور کوئی مفر اس سے نہیں سوجھتا تھا۔ اُن کے دل کی یہی کیفیتیں "پدمنی کی چتا" میں اس رنگ سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ہیں قفس میں کچھ ہمارے بال و پر باقی ابھی
پھر بھی کرنا ایک دن تکلیف برق شعلہ بار
رہ گئی اب کے برس بھی حسرت دیدار گل
کٹ گئے کنج قفس میں آہ ایام بہار
ابر تر ہم دل جلوں کی خاک سے ہٹ کر برس
تیر باراں سے ہیں بڑھکر تیری چھڑیاں ناگوار
جل کے لپٹوں تجھ سے میں اے شعلۂ جاں سوز غم
ہو گئی نذر اجل اک لعبت سیمیں عذار

یہی جذبۂ فنا ہندو اعتقادات سے ملکر دیکھئے کتنے پُر درد انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ گنگا جی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

وہ دن بھی ہوگا۔ ہونگے جب ہم غریق رحمت
اور تیری نذر ہونگی یہ ہڈیاں ہماری
گنگا میں پھینک آنا بعد فنا اُٹھا کر
برباد ہو نہ مٹی او آسماں ہماری

آگے کہتے ہیں۔

آئے اجل کی زد پر جب اپنی عمر فانی
اور ختم رفتہ رفتہ ہو سیل زندگانی
دُنیا سے آہ جب ہو اپنے سفر کا ساماں
بالیں پہ اقربا ہوں سرگرم نوحہ خوانی
جب ہونٹھ خشک ہوں اور دشوار ہو تنفس
احباب اپنے مُنہ میں ٹپکائیں تیرا پانی

سنتے ہوئے جہاں سے ہم شاد کام جائیں
دُنیا سے پی کے تیری الفت کا جام جائیں

سرور چار دیوار عناصر کو زندان بلا سمجھتے ہیں زندگی کو اپنے اور اپنے محبوب کے درمیان ایک پردہ حایل۔ وہ ہزار ہزار انداز سے اس زندان سے رہائی پانے کے لئے نالہ و شیون کرتے ہیں قفس عنصری کو توڑ دینے کے لئے بیچین ہیں۔ اُس قفس عنصری کو جو روح کو اپنی اصل سے جدا رکھتا ہے۔ بار بار اُن کے نغموں میں یہی آواز گونجتی ہے۔

کہاں تھا میں میری قسمت مجھے کہاں لائی
عدم سے جانب ہستی کشاں کشاں لائی
گراں ہے ہجر ترا جان ناشکیبا کو
تلاش ہے تیرے جلوے کی چشم بینا کو
کرے نہ روح میری کیوں تیری طرف پرواز
کہ زیست ہے تیری قربت میں تفرقہ انداز
میں کاش عمر رواں تجھ کو چھوڑ کر بھاگوں
طلسم خانۂ ہستی کو توڑ کر بھاگوں

سرور کا دل حسن کے اثر سے ہر دم جلتا بلتا رہتا تھا۔ مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کی دلربائیاں اور دلفریبیاں اُن کے سینے میں ایک محشر شوق برپا رکھتی تھیں

وہ بے اختیار ان شیریں کاریوں اور کافرماجرائیوں کے راگ گا اٹھتے ہیں اور اپنی بیقراریوں کو رنگیں بیانی کا جامہ پہنا کر اس انداز سے نغمہ موزوں میں ادا کرتے ہیں کہ دل تڑپ اٹھتا ہے۔ سرزمین ہند کی برسات نہایت ولولہ انگیز موسم ہے۔ کس بیتابانہ انداز سے اس کے گزرے ہوئے کیف آفریں جلوؤں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دِل کے شوق نے حسب معمول اشعار میں چڑھے ہوئے دریا کا سا تموج پیدا کر دیا ہے۔

تو کہاں ہے آہ اے ناظورۂ ناز آفریں — اب وہ شوخی ہے نہ وہ نقش و نگار دلنشیں
اودی اودی اب گھٹاؤں کا وہ آنچل ہے کہاں — ہلکی ہلکی اب کہاں ہے وہ نقاب شبنمیں
آسماں پر اب کہاں وہ لکۂ ابر سیاہ — دوش نازک پر کہاں اب آہ زلف عنبریں
اب کہاں آنکھوں میں ڈورے وہ شفق کے سرخ سرخ — اب وہ مستانہ نگاہیں ہیں نہ چشم سرمگیں
ہلکی ہلکی آہ وہ ساون کی جھڑیاں اب کہاں — ابھرے سینے پر پسینے کے وہ چھینٹے اب نہیں
وہ سنہری اب کہاں بجلی کی چھاگل پاؤں میں — اب کہاں ہے گھنگروؤں کی وہ صدائے دلنشیں
اب کہاں کوئل کے نغموں کی سریلی تان وہ — ہائے وہ دلکش ترانے ہیں کہاں اے نازنیں
نیلگوں آنکھوں میں وہ سرمے کے ڈورے اب کہاں — سرمہ گوں اودی گھٹا سے اب کہاں حسنِ زمیں
کر رہی ہے لیلیٰ شب آہ اب آراستہ — چھوٹے چھوٹے خوشنما تاروں کی افشاں سے جبیں

اب کہاں تیری ادائیں اے عروس برشگال
ہائے وہ دلکش فضائیں اے عروس برشگال

محبت کی راہ میں اپنی ہستی مٹانے والے دنیا کو بے ثبات جانتے اور مانتے ہیں اور دنیا کی ہر شے سے عزت و فنا کا سبق لیتے ہیں۔ ہر تر ور کے دِل میں بھی عبرت

کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دُنیا کی بے ثباتی پر ایک مستقل نظم تحریر کی ہے اور عبرت و فنا کے مضامین آپ کے کلام میں عام ہیں۔ "دیوارِ کہن" میں تو عبرت کی جیتی جاگتی صورت بنا کر کھڑی کر دی گئی ہے۔ شاعر نے اس نظم میں ایک پرانی دیوار سے مخاطب ہو کر اپنے بچپنے کی مختلف حالتوں اور واقعات کو بیان کیا ہے اور ایسی جزئیات کو پیش کیا ہے کہ ہو بہو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک بھولا بھالا بچہ دیوار سے گال ملائے لپٹا کھڑا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں لیکن دیوار کی پناہ آغوشِ مادر بن گئی ہے۔ بہت جی چاہتا ہے کہ کچھ اشعار پیش کروں۔ لیکن نظم طویل اور مسلسل ہے۔ انتخاب میں وہ لطف نہیں آسکتا۔ پھر بھی دو چار سُن لیجئے۔

ملے تھے مجھ کو جو طفلی کے آہ دن دو چار / وہ گزرے گود میں تیرے ہی اے مری غمخوار

تجھی نے مجھ کو سکھائے خرام کے انداز / تجھی نے مجھ کو بتائے خرام کے انداز

وہ چھوڑ دینا لڑکپن میں مجھ کو دایہ کا / ترے سہارے سے چلنا وہ سیکھنا میرا

وفا کے اگلے وہ پیمان یاد ہیں تیرے / مربیہ! مجھے احسان یاد ہیں تیرے

مچل کے جب کسی شئے پر میں روٹھ جاتا تھا / کسی کی گود میں جب آہ میں نہ آتا تھا

تو تجھ سے لگ کے میں ہو جاتا تھا کھڑا دیوار / ملا کے تجھ سے میں روتا تھا غم زدہ رخسار

اُداس دیکھ کے مجھ کو گلے سے لپٹا کر / لگا کے سینے سے آنسو تھی پونچھتی اکثر

نہیں ہوں آہ لڑکپن کی وہ ادا بھولا / میں جب بڑا ہوا اور گیند کھیلنا سیکھا

آگے چل کر دیوار کی زبان سے کہتے ہیں۔

ہوا لپٹ کے جو دیوار سے جدا میں غریب / دکھا کے پیٹھ جو چپ چاپ چل دیا میں عجیب

نگاہ یاس سے پہلے میری طرف دیکھا
تمام زیست کے دن ہو چکے اجل ہے قریب
ہوں میہماں کوئی دن کی قضا ہے سر پہ سوار
مگر نہ دل سے بھلانا میری وصیت کو
جب آہ مجھ کو نہ تم اس جگہ کھڑا پاؤ
تو مجھ پہ ہو کے نہ اٹھلا کے یوں گزر جانا

زبان حال سے پھر یوں کہا کہ اے بیٹا
کہ پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھی ہوں میں غریب
نصیب تم کو نہ شاید ہو پھر میرا دیدار
کہ چھوڑے جاتی ہوں میں یادگار عبرت کو
زمین پہ خاک کا پتلا میرا پڑا پاؤ
کہ بے رخی کہیں عبرت سے تم نہ کر جانا

نہ بھول کر بھی اسے دیکھنا حقارت سے
کہ پاکتر نہیں صحبت ہے کوئی عبرت سے

سرور کے دل کی آگ اُن کے کلام کے لفظ لفظ میں جاری و ساری ہے۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی نے اسی کو یوں کہا ہے کہ اشعار کے اندر اُن کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ رنگینی و مرصع سازی بھی اس قدر ہے کہ کلام نگارخانہ بنا ہوا ہے۔ یہ بھی خدا کی دین ہے ورنہ سوز و گداز اور رنگینی دو متضاد چیزیں ہیں اور دونوں کا ساتھ ساتھ نباہنا ناممکن ہے، یہ قدرت سرور ہی کو عطا ہوئی کہ جو بات کہتے ہیں اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والے کا اِدھر دل تڑپ اُٹھتا ہے اُدھر دماغ شگفتہ ہو جاتا ہے۔ طوالت کے خیال سے مثالیں نہیں پیش کی جاتیں، بہرحال اس کے متعلق جو اشعار پیچھے لکھے جا چکے ہیں اُنھیں پر ایک مرتبہ نظر ڈالئے اور اگر آپ کے پاس مجموعہ کلام سرور ہے تو کہیں سے اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیجئے۔ یہ خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ ہرچند کہ رنگینی و مرصع سازی

سُرور کے کلام کی ممتاز خصوصیت ہے لیکن جب کبھی صفائی و سادگی پر اُتر آتے ہیں تو اور بھی ستم ڈھاتے ہیں۔ "دیوار کہن" "بھونرے کی بیقراری" "اُمید اور طفلی" "ستیاجی کی گریہ وزاری" وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔

اُردو شاعری میں فارسی کی کورانہ تقلید سے جو غیر فطری خصوصیات اور اجنبی تشبیہیں اور استعارے داخل ہو گئے تھے جدید مذاق نے اُن کو بھی ترک کرنا شروع کیا اور شاعری کو اصلیت کے قریب لانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ شعرا نے اپنے ملک کے دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، پرندوں پودوں اور پھولوں کو مطمحِ نظر بنایا۔ بلبل کی فریاد و فغاں کی جگہ کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دینے لگی۔ جیحوں سیحوں کی جگہ گنگا جمنا لہریں لینے لگیں۔ ہمالیہ کی چوٹی تمام دنیا کے پہاڑوں کی سرتاج نظر آئی۔ برسات کی بہاریں دلوں کو لبھانے لگیں۔ اس عظیم تغیر کا باعث تنہا انگریزی علم و ادب نہیں ہوا۔ ہندی ادب کی توسیع و اشاعت نے بھی اس مقصد میں بہت رہنمائی کی ہے۔ ہندی شاعری میں جہاں کوئل اور پپیہے کا ذکر آ جاتا ہے دریائے جذبات اُبل پڑتا ہے۔ ہندوستان کے پھولوں کا بادشاہ کنول ہے۔ بھونرا اسی طرح کنول کے ساتھ ہے جس طرح گل کے ساتھ بلبل اور چاند کے ساتھ چکور۔ سُرور نے کوئل، پپیہا، کنول اور بھونرے سے اپنی شاعری میں وہ کیفیتیں پیدا کی ہیں جو برسات کے رنگین مناظر اور فضاؤں میں واقعی ہمارے دلوں میں ان سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ "شمع و پروانہ" کی طرح "بھونرے کی بیقراری" پر بھی آپ کی

مستقل نظم ہے اور بڑی پیاری نظم ہے چند شعر سنئے۔

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی ــ نہ وہ موتیا کی ادا رہی
نہ وہ نسترن نہ سمن رہی ــ نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی
نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے ــ نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
نہ غزل سرا وہ کوئی رہے ــ نہ وہ قمریوں کی صدا رہی
نہ وہ سرو ہے نہ وہ آبجو ــ نہ وہ ہمصفیر ہیں خوش گلو
نہ بنفشہ ہے نہ وہ نازبو ــ نہ وہ جعفری نہ حنا رہی
نہ وہ صبح کی ہیں تجلیاں ــ نہ شفق کی آہ وہ جھلکیاں
نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں ــ نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی
نہ امنگیں ہیں وہ شباب کی ــ نہ وہ پتیاں ہیں گلاب کی
نہ ہوا میں بو ہے شراب کی ــ مجھے مست کرتی جو ثبا رہی
وہ کنول غضب کے تھے دلربا ــ جہاں اڑتے تھے مرے ہمنوا
مگر اب نہ ان کی ہے وہ ادا ــ نہ وہ بو رہی نہ صفا رہی

شاعری مذہب وملت کی قید سے آزاد ہے شاعروں کا ایمان وہ مشرب ہے جو دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کی روح سے مرکب ہوتا ہے۔ شاعری عظمتوں، نیکیوں اور سچائیوں کے سوا کسی چیز سے تعلق نہیں رکھتی اور محبت تو شاعری کی جان ہے۔ شاعر کے لئے مناظر فطرت کی دلکشی بھی وہی اثر رکھتی ہے جو متبرک مقامات، عظیم الشان تعمیریں اور مقدس ہستیاں جس سچے جوش کے ساتھ سرود مرلی والے سے گن گاتے ہیں

اسی جذبہ صادق سے محبوب خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ بیانؔ و یزدانی کی نعت
تضمین میں لکھتے ہیں۔

دل بیتاب کو سینے سے لگا لے آجا | کہ سنبھلتا نہیں کمبخت سنبھالے آجا
پانوں ہیں طول شب غم نے نکالے آجا | خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹائے آجا

بے نقاب آج تو او گیسوؤں والے آجا

نہیں خورشید کو ملتا ترے سایہ کا پتہ | کہ بنا نور ازل سے ہے سراپا تیرا
اللہ اللہ ترے چاند سے مکھڑے کی ضیا | کون ہے ماہ عرب کون ہے محبوب خدا

اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا

عشق کے بعد سرورؔ کے دل کا دوسرا جذبہ حب وطن تھا۔ وطن کی محبت بھی
اُن کے دل میں ہیجان پیدا کئے رہتی تھی یوں تو سب کو اپنا وطن عزیز
ہوتا ہے لیکن وہ سرزمین پاک جس کے ذروں میں سورج کا سا نور ہے
جس کی ہواؤں میں باغ جنت کی سی تازگی و سرور ہے جس کے پانی
میں امرت کی سی مٹھاس اور زندگی ہے جس کی خاک کے پتلوں کو فرشتے
سجدہ کرتے ہیں وہ پتلے جنھوں نے سارے جہان میں علم و عرفاں کی روح
پھونکی، تہذیب و تمدن کی بنائیں ڈالیں اور انسانیت کا سبق دیا
وہی سرزمین مصیبتوں کا گھر بنے، اس کی دولت لوٹائی جائے اس کے
سپوت پانوں تلے روندے جائیں ایسی حالت میں اگر ان سپوتوں کے
دل میں اس سرزمین کا درد نہ پیدا ہو تو وہ ماں کے دودھ کا حق
ادا نہیں کرتے۔

سرور جس میں نہ حب وطن کا ہو احساس   وہ دل ہو چور کہ بہتر ہے اس سے پارۂ سنگ

میرے خیال میں وہ حب وطن کے جذبات جن سے قومی وسیاسی روح ملک میں بیدار ہوئی سب سے پہلے سرور ہی نے اردو شاعری میں نظم کئے "عروس حب وطن" میں کہتے ہیں۔

ٹوٹیں وہ پانوں جنکو نہ تیری تلاش ہو   پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو جستجو تیری
وہ گھر ہوئے چراغ جہاں تیری ضو نہ ہو   وہ دل ہو داغ جس میں نہ ہو آرزو تیری
دنیا و آخرت میں نہ انجام ہو بخیر   تیرے سوا جو غیر کی ہو مجھ کو جستجو

سرور حب الوطنی کو اپنا دین وایمان سمجھتے ہیں۔ وطن کی عظمت گذشتہ کی یاد میں بار بار آہ وزاری کرتے ہیں۔ ابنائے قوم کی غفلت و پستی پر روتے ہیں۔ ان کی زبون حالی سے ان کا دل پاش پاش ہوتا ہے۔ وہ اپنی درد بھری صداؤں سے جوش اور ہمت کی روح پھونکتے ہیں۔

ارض و سما ہیں نور کے سانچے میں ڈھل گئے   سو کر اٹھو کہ غیر ہیں آگے نکل گئے
چار آئینہ حریف بیشکر سنبھل گئے   شیروں کے رزم گاہ میں تیور بدل گئے

تم بھی دکھاؤ جوہر پیکار رزم میں
مردانہ وار بڑھکے کرو وار رزم میں

لشکر کشوں کی صف میں تمہارا ہے انتظار   سینہ سپر ہو بڑھکے کہ ہے وقت کارزار
میدان کے دھنی ہو جوانو ہو ہوشیار   آگے تمہارے کس کو ہے دعوای گیرودار

سو کر اٹھو کہ قافلے والے نکل گئے
آگے بہت ہیں تم سے رسائے نکل گئے

سرور کا زمانہ سیاسی بیداری کے اعتبار سے ابتدائی دور سمجھنا چاہیئے انڈین نیشنل کانگریس کا وجود تو تھا لیکن اُس کی سرگرمی سالانہ اجتماع اور پلیٹ فارمی تقریروں تک محدود تھی۔ جو مراعات گورنمنٹ سے چاہی جاتی تھیں ہر سال ایک مرتبہ ایسی تقریروں میں دہرادی جاتی تھیں جن میں عملی تحریک کے بجائے فصاحت و بلاغت کا زور زیادہ ہوتا تھا اور سرکار برطانیہ کے رحم و کرم کا واسطہ دیکر مطالبات پیش کئے جاتے تھے، جو چند رعایتوں تک محدود تھے سوراج اور آزادی کی آرزوئیں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھیں اور جو کچھ سیاسی گرما گرمی تھی چند نفوس قدسیہ کے حلقہ تک محدود تھی اور وہ بھی اعتدال کے اندر۔ عوام میں سیاسی حرارت کی لہر نہیں دوڑی تھی۔ تحریر و تقریر میں بہت احتیاط برتی جاتی تھی قانونی شکنجہ کا بہت خوف تھا۔ البتہ بنگال اس سے مستثنےٰ تھا وہاں کرزن کی پالیسی نے آگ لگا رکھی تھی ملک کے باقی خطّے غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ سرور کے دل میں حب الوطنی کی آگ تو بھڑک چکی تھی وہ قوم کے درد سے بیچین تھے لیکن اظہار خیالات میں وہ وقت کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ انھوں نے زبان بندی سے سخت بیزاری ظاہر کی اور سیاسی خیالات و جذبات کو ایسے استعاروں میں پیش کیا جو اصل مفہوم کی کھلی ہوئی تشریحیں ہیں۔ لیکن جب کسی واقعہ سے اُن کے دل کو بہت صدمہ پہونچا تو غم و غصہ کی آگ نے استعاروں کے پردوں کو اکدم جلا ڈالا اور اُن کی زبان سے شعلے نکلنے لگے

"بدنصیب بنگال" میں کس جوش و خروش اور بے دلی کے ساتھ کرزن پر برس پڑے ہیں۔

آہ اے بنگال آلام و مصائب کے شکار — آہ اے کرزن کی پالیسی کے صید بیقرار

آہ اے نخچیر ناوک خوردۂ دست اجل — آہ اے خونیں جگر خونیں کفن خونی مزار

آہ اے محنت کش حرماں نصیب و دردمند — آہ اے برگشتہ ایام و پریشاں روزگار

آہ اے مجمر فروز آتش سوز دروں — آہ اے خوں نابہ ریز گریہ بے اختیار

آہ اے لذت چش ذوق مئے حب وطن — آہ اے جرعہ کش زہراب تیغ روزگار

آہ اے آماجگاہ ناوک جور فلک — آہ اے صید زبوں شوریدہ حال و بیقرار

آہ اے بنگال اے ذلت نصیب و مبتذل — کیا ہوئی وہ تیری عظمت کیا ہوا تیرا وقار

مل گئیں تیری وفائیں خاک میں ہائے ہائے — ہو گیا حکام کی نظروں میں تو بے اعتبار

اڑ رہی ہے آہ اب تیرے سیہ خانہ میں خاک — شام ماتم سے مبدل ہے تیری صبح بہار

تیرے پھولوں میں ہے عالم زخم دامن دار کا — خوں رلاتی ہے نگاہ شوق کو تیری بہار

اب نہ وہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کنج خوشنما — ہیں چمن میں کچھ خس و خاشاک عبرت یادگار

دل کو برماتا ہوا گزرا جگر سے کس کا تیر — ہو گیا تو کس شکار افگن کے ناوک کا شکار

کس کی تیغ ناز نے دل پر ترے چرکے دیے — مرغ بسمل کی طرح جو ہے زمیں پر بیقرار

کیوں پچھاڑوں پہ پچھاڑیں کھا رہا ہے ہائے تو — تیرے ارمانوں کا کس نے آہ کر ڈالا فشار

پھر گئی کرزن کی تجھ سے ہائے کیوں چشم کرم — جانفروشی تیرا شیوہ جاں نثاری تھا شعار

آسماں گردش میں ہے تیرے مٹانے کے لئے — دیکھئے ہوتا ہے تیرا حشر کیا انجام کار

کرزن بیداد خو اہل پولس حکام وقت — تو ہوا اُف اُف نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار

اسی طرح شہر آشوب میں کہتے ہیں۔

گیا بہار کا موسم خزاں کا دور آیا
شکست رنگِ گل و ارغواں کا دور آیا
پکارتی ہے صبا امتحاں کا دور آیا
سکوت نالۂ و ضبط فغاں کا دور آیا
کرے نہ شکوۂ صیاد و بلبل دلگیر
نہیں اجازت نالہ نہ ہو بلند صفیر

ہوائے دہر کی بگڑی ہے کچھ عجب تاثیر
ریاض قوم ہے اب انقلاب کی تصویر
وہ طائران چمن زاد تھے جو خوش تقریر
ترانہ سنجی کے باعث ہوئے قفس میں اسیر
غریب قید میں شام و سحر تڑپتے ہیں
قفس میں بند ہیں بے بال و پر تڑپتے ہیں

آگے چلکر لکھتے ہیں۔

ادھر ”نگار“[1] ”نشتر“[1] خدنگ جفا کا ہے نخچیر
کمند غم میں ادھر ”شبدیز“[2] ماتم ہے اسیر
دکھا رہی ہے عجب رنگ گردش تقدیر
کہ پائے اہل قلم میں ہے آہنی زنجیر
یہی ہے حال تو ہے قوم کا خدا حافظ
فلک کمیں میں ہے سر پر قضا خدا حافظ

مغربی تعلیم کے رواج سے جہاں نیا شعور اور بیداری پیدا ہوئی وہاں طرز معاشرت میں مغرب کی تقلید بھی ہونے لگی۔ اچھائیاں کم آئیں اور برائیاں بہت زیادہ۔ یوں تو آزادی بہت اچھی چیز ہے لیکن آزادی سے اگر مطلق العنانی مراد ہے تو اس سے زیادہ تباہ کن بھی کوئی چیز نہیں افسوس

---

[1] [2] دونوں اخبار تھے جو سیاسی تحریروں کے باعث قانونی زد میں آگئے تھے۔

کہ ملکی معاشرت میں اسی تباہ کن آزادی کا دخل ہونے لگا جس کا نتیجہ بے غیرتی،
بے راہ روی اور بے دینی ہے حضرت سرور جیسے پاک نفس اور نیک
نہاد شاعر کی آنکھوں میں یہ انقلاب کھٹکا انھوں نے اس کی مذمت
کی اور بڑے زور و شور کے ساتھ کی۔

وہ بزم ہے نہ وہ ساقی نہ وہ مئے گلرنگ — وہ ساز ہے نہ وہ مطرب نہ شور نغمۂ چنگ
نئے نئے نظر آتے ہیں روز و شب اب ہم — نئے نئے ہیں مناظر نئے نئے نیرنگ
مسوں کی آنکھوں نے افسوں کچھ ایسا پھونک دیا — کہ بت نظر نہیں آتے ہیں سیکڑوں فرسنگ
وہ لیڈیوں کے خدنگ نظر سے اب ہیں شہید — جو دل حسینوں کی تیغ ادا سے تھے چورنگ
ہوا میں ہو کوئی بیلون جس طرح اڑتا — اڑائے پھرتے ہیں دل یوں پری شان فرنگ
یہ سادگی نے کیا خون رنگ آرائش — کہ مہندی پھیکی ہے لاکھا ہے پان کا بدرنگ

- - - - - - - - - - - - - - - -

زباں سے گو نہ کہیں کھل کے شرم سے لیکن — حجاب و پردہ ہے اب مہ وشوں کو باعث ننگ
نہ اب وہ جبہ و دستار ہے نہ شان قبا — کہ سر پہ ہیٹ ہے زیب بدن ہے جاکٹ تنگ
مسوں کا ذکر ہے کہتے ہیں کس کو صوم و صلوٰۃ — وضو کے بدلے ہے ہوٹل میں بادۂ گلرنگ
نہ بتکدے میں وہ ناقوس کی صدائیں ہیں — نہ لہر اگلی سی اشنان کی ہے اب لب گنگ

. . . .

. . . .

سبق پڑھایا ہے تعلیم نے ہمیں الٹا — اٹھا کے طاق پہ رکھدی ہے عقل کی فرہنگ

سرور کے کلام کی بہت نمایاں معنوی خصوصیتوں پر مختصراً بحث کی گئی اب یہ بھی
دیکھنا لازمی ہے کہ شاعری کے فن میں انھوں نے کیا کیا۔ کلام سرور کے جو نمونے آپ نے

آپ نے پچھلے اوراق میں دیکھے اُن سے آپ بغیر متاثر ہوئے نہ رہے ہونگے یہی تاثیر شعر کی جان ہے۔ اِس تاثیر کے متعلق سوز و گداز کے سلسلہ میں جو کچھ ضروری تھا عرض کیا گیا۔ اسی تاثیر کی ایک صورت محاکات ہے۔ محاکات کے معنی ہیں نقالی اور بہ اعتبار شاعری اُس خوبی کو کہتے ہیں جو الفاظ کے ذریعہ کسی کیفیت کی تصویر کھینچدے خواہ وہ کیفیت داخلی ہو یا خارجی۔ مرئی ہو یا غیر مرئی۔ سرور کو اِس خصوصی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ قدرت کے دلچسپ مناظر، انسانی حسن کی کیفیتیں، اور دلی جذبات کو اِس قدرت کاملہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ عالم تصویر پیدا ہو جاتا ہے اور بسا اوقات زبان کی سادگی کے ساتھ ایسی لطافت، لوچ اور گھلاوٹ پیدا کر دیتے ہیں جس کو شاعری کی روح لطیف کہنا چاہیئے جس کو ہندی والے رس کہتے ہیں اور جو ہندی کو ہی نصیب ہے۔ جو اُردو میں سرور کا حصّہ ہے سرور نے اپنی شاعری میں اُن جزئیات اور خصوصیات سے کام لیا ہے جو ہندوستانی زندگی کا تار پود ہے زبان وہ لکھی ہے جو بول چال ہے اب اِن کی تمام شاعری ہم کو اپنے گھر کی اور اپنے گرد و پیش کی مانوس چیز معلوم ہوتی ہے اور ہمارے دل و دماغ میں فوراً اُتر جانے کے بعد کیف و سرور بنکر ہماری روح میں گھل مِل جاتی ہے۔ ہر نظم میں اِس کی مثالیں ملیں گی یہاں چند شعر نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

بھینی بھینی وہ نسیم فرحت افزائے سحر — پیارے پیارے بیل بوٹے ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوا
وہ سحر کا وقت وہ پھولوں کی بھینی بھینی بو — وہ نمک سبزے کی وہ شبنم کے قطرے واہ وا

چومتی تھی پیار سے پھولوں کا منہ باد سحر / گود میں لیکر کھلاتی تھی شگوفوں کو ہوا
بازوؤں کو تولکر اب سوئے گلشن اڑ چلے / سر جھکائے گھونسلوں میں تھے جو مرغان ہوا
نور چھن چھن کر برستا تھا در و دیوار پر / ایک عالم تھا زمیں پر لمعۂ انوار کا
کھلکھلا کر ہنس رہا تھا غنچۂ صبح بہار / پھرتی تھی گلشن میں اترائی ہوئی باد صبا
ٹھنڈی ٹھنڈی سبزۂ صحرا کی دلکش تھی لپک / بھینی بھینی بوئے گل میں تھی بسی باد صبا

اور دیکھیے۔

اُلجھے سلجھے بال مستانہ ادا متوالی چال / تیکھی چتون گورے گورے گال چھوٹا سا دہن
ننھی ننھی انگلیاں پتلی کمر بوٹا سا قد / اس پہ سونے میں سہاگا جامہ زیبی کی پھبن
گوری گوری ساق سمیں پیاری پیاری ایڑیاں / قد چھریرا جسم سانچے میں ڈھلا نازک بدن
ننھے ننھے دانت کلیاں موتیا کی خوشنما / پتلے پتلے نرم نازک ہونٹھ برگ یاسمن
دوش پر زرکش ردا چہرے پہ زرینہ نقاب / سیم قامت، سیم بر، سیمیں بدن، سیمیں ذقن
تھے لب رنگیں پہ مسی کی اداہٹ کے نشاں / اودے اودے فالسوں کا تھا شگفتہ اک چمن
لب میں تھی جاں پروری آنکھوں میں سحر سامری / قد میں تھی فتنہ گری رفتار میں تھا بانکپن

- - - - - - - - - -

دست قدرت نے بنائی تھی عجب زلف سیاہ / کس دیا گویا کسوٹی پر تھا کندن سا بدن

- - - - - - - - - -

گورے گورے ہاتھوں میں تھیں دھانی دھانی چوڑیاں / پیارے پیارے بازوؤں میں ہلکے ہلکے نورتن
بھینی بھینی بس کے آتی تھی تن نازک سے بو / صانع قدرت نے صندل کا بنایا تھا بدن
کیا کہوں اس نازنیں کا عالم حسن شباب / پھوٹ نکلی تھی جوانی جیسے سورج کی کرن

آخری شعر میں جس انداز سے تشبیہ پیش کی ہے اس کی تو داد ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح

یہ دریا دور تک موجیں مارتا ہوا چلا گیا ہے نظم میں ایک ناظورہ ناز آفریں کا سنگار ہے اور پورا سنگار ہے لیکن اس میں اُس زبان بازاری کی بو باس نہیں جو اُردو شاعری کا معشوق ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ سرور نے یہ عروس اُردو کی تصویر کھینچی ہے۔ دو چار شعر ایک اور نظم کے سُن لیجئے۔

نازنینوں کا وہ امریوں میں جھولا جھولنا وہ سُریلی آہ تانیں اور وہ ساون کی ملار
چوڑیاں وہ دھانی دھانی چندریاں وہ سرخ سرخ وہ جوانی کی اُمنگیں اور وہ ساتوں سنگار
ننھی ننھی انگلیوں میں اُف رے ساون کی حنا لمبی لمبی چوٹیوں میں آہ وہ بیلے کے ہار
آہ یہ اگلے مناظر یاد آ جاتے ہیں جب دل نکل پڑتا ہے پہلو توڑ کر بے اختیار

محاکات کے بعد دلآویز بندشیں اور دلکش ترکیبیں آتی ہیں وہ ترکیبیں جو ایک طرف فصاحت و بلاغت کی جان ہیں اور دوسری طرف صوتیاتی اثر سے اپنے مفہوم کی عکس کشی کرتی ہیں جن سے کہیں ترنم پیدا ہوتا ہے کہیں تابانی کہیں متانت کہیں جزالت اور کہیں شوکت و دبدبہ وغیرہ۔ سرور کے یہاں ان کی بھی فراوانی ہے

عقل دقیقہ رس کا دوڑا سمندر برسوں روندا کیا جہاں کے پست و بلند برسوں
ڈھونڈھا کیا تجھے میں زار و نزار و نژند برسوں بام فلک پہ پھینکی اُڑ کر کمند برسوں

تیرا پتہ نہ پایا او لامکان والے
سارے جہاں میں ڈھونڈھا سارے جہان والے

"عقل دقیقہ رس" کی وزنی اور بڑی ترکیب نے لامکان والے کی حقیقت کو اس کی شان برتر و بالا کے مطابق ارفع و دقیق ظاہر کر دیا۔ یہ انتہائے بلاغت ہے۔ اسی طرح "زار و نژند" کی ترکیب سے مضطربانہ تجسس اور

دشواری راہ متحقق و مستحکم ہوتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے اور شاعر کی قدرت مصوری کو دیکھئے۔

اودی اودی اب گھٹاؤں کا وہ آنچل ہے کہاں ___ ہلکی ہلکی وہ کہاں ہے اب نقاب شبنمیں
وہ سہانا آہ جنگل وہ نہال میوہ دار ___ میٹھے میٹھے وہ ثمر لذت فروش آنگیں
آہ اے خاک وطن اے خانۂ اردے ہنر ___ آہ اے جولانگہ برق تماشائے ہنر

ایسے صد ہا شعر پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن مضمون بہت طولانی ہوتا جاتا ہے۔ ایسے تبصروں میں صرف نمونے ہی دکھانا کافی ہوتا ہے۔ جو خوبی مندرجہ بالا اشعار میں ہے نظم "ادائے شرم" اُس کا ایک مکمل آئینہ ہے یہاں صرف ایک بند لکھتا ہوں۔

یہ نگاہ شرمگیں یہ تیرا انداز حجاب ___ نیچی نظریں ہیں تیری یا عقدۂ راز حجاب
لب میں ہے جاں پروری آنکھوں میں اعجاز حجاب ___ دوش پر آنچل ہے یا ہے پردۂ ساز حجاب

پاکدامانی کی تو سمٹی ہوئی تصویر ہے
جلوہ حسن تماشا سوز کی تنویر ہے

یہ نظم روی ورما کی ایک تصویر کے متعلق ہے جن لوگوں نے وہ تصویر دیکھی ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاعر نے اِس نظم میں کس بلا کی مصوری کی ہے۔ تصویر کو سامنے رکھکر ایک ایک مصرع نظم کا پڑھا جائے تو سرور کی قادر الکلامی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اوپر کے بند میں ایک ایک مصرع میں تصویر کا عالم ہے اور بیت میں لفظ "سمٹی ہوئی" نے تو قیامت کر دی ہے۔ اِس عجیب و غریب شاعر کے یہاں نازک خیالی کی بھی نادر مثالیں ملتی ہیں یوں تو نازک خیالی کو قصنعات شاعری میں سمجھنا چاہئے کیونکہ صداقت اور اصلیت سے اِس کو کوئی لگاؤ نہیں پھر بھی

یہ ایک قسم کی صفت خیال کی جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سرور نے یہاں بھی دلآویز بندشوں سے اپنی انفرادیت کا سکہ بٹھا دیا ہے۔

تو وہ ستونتی بھی اسے پروردہ دامان حسن ‫ ‫ نکلے ٹوٹا شیشۂ ہستی تیرا ایمان حسن
غم نہ طوفانِ حوادث کا کرا سے سرخوشِ حسن ‫ ‫ رنگ نسیان فنا میں ہو نہ خلوت کوش حسن

تشبیہ و استعارہ بھی معیار کلام کے اجزا تصور کئے جاتے ہیں اور اِن سے بھی شاعر کی رسائیٔ فکر کا اندازہ کیا جاتا ہے سرور کے کلام میں تشبیہوں اور استعاروں کی بھی اتنی فراوانی ہے کہ دوسری جگہ کم نظر آئیگی اور پھر اس برجستگی اور پختگی کے ساتھ اِن کا استعمال ہوا ہے اور ایسی دلآویز ترکیبوں میں کہ بعض جگہ تو تنہا ایک تشبیہ یا استعارے سے عالم تصویر پیدا ہو گیا ہے۔ اِس کے بہت سے نمونے پیچھے لکھے ہوئے اشعار میں ملیں گے۔ یہاں ایک نظم "بیر بہوٹی" سے دو تین بند پیش کئے جاتے ہیں۔

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا ‫ ‫ سُرخ ڈورا ہے کسی چشم فسوں پرداز کا
قطرۂ مضطر ہے خونِ کشتگان ناز کا ‫ ‫ قلب خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا
یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمین پر جلوہ گر
جام زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویر حسن ‫ ‫ خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیر حسن
یا عقیق سُرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیر حسن ‫ ‫ نقش نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویر حسن
جلوۂ گل ہے فضائے وادیٔ پرخار میں
سُرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

وادیٔ پرخار میں اک مجمرِ سوزاں ہے تو ۔۔۔ دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو
کشتِ زارِ حسن میں اک دانۂ مرجاں ہے تو ۔۔۔ یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

نازہے صحرا کو تیری شوخیٔ رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

سرور کو غزل کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ہر نظم نہایت نکھرے ہوئے رنگِ تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے حسن و عشق کی معاملہ بندیاں، جذبات کی شدت و لطافت، زبان کی رنگینی، نرمی اور دلکشی سب کچھ بدرجہ اتم موجود ہے۔ غزل سے صرف فرق یہ ہے کہ اشعار مسلسل ہونے کے باعث معنوی حیثیت سے مربوط ہیں اور لخت لخت نہیں جیسا کہ غزل میں ہوتا ہے۔ خالص غزل کے انداز پر بھی کچھ شعر ہیں لیکن اُن میں بھی مرکزِ خیال ایک ہی ہے مثلاً۔

دل میں آنکھوں میں ترے حسن کی ہے جلوہ گری ۔۔۔ یہ وہ شیشے ہیں کہ جن میں مئے وحدت ہے بھری
تو وہ خود بین و خود آرا کہ پسِ پردۂ ناز ۔۔۔ محو آئینۂ تمکیں ہے تری عشوہ گری
میں وہ سرگرم تحیر کہ دمِ آرائش ۔۔۔ تک رہی ہے ترا منہ میری پریشان نظری
دین و دنیا کا رہا ہوش نہ میخواروں کو ۔۔۔ تیری آنکھوں نے پلائی وہ مے بے خبری
اُس کے کوچے میں مری خاک کو کرنا برباد ۔۔۔ آخری تجھ سے وصیت ہے نسیمِ سحری
یادگار اپنی تجھے کنجِ قفس میں دمِ مرگ ۔۔۔ چھوڑے جاتے ہیں ہم اے حسرتِ بے بال و پری
اُٹھ گیا دامنِ صحرا سے ترا دیوانہ، ۔۔۔ سر ٹپکتی ہوئی اب پھرتی ہے شوریدہ سری

اسی میں ایک شعر ہے۔

تکتی ہے تیرے تصور میں دم بازپسیں　　　ہائے کس یاس سے منہ سب کا پہ بیتاب نظر

اس شعر میں جن نازک لطیف اور گہرے جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہے اُن کا لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے شاعر کہتا ہے کہ تیرا بیمار نزع کے عالم میں ہے اُسے تیرا تصور بندھ رہا ہے اور وہ قدرتی طور پر گھبرا گھبرا کر ان سب عزیز و اقربا کا منہ تک رہا ہے جو اس حالت میں اُس کے چاروں طرف جمع ہیں اس حسرت سے مُنہ تک رہا ہے کہ شاید ان میں سے کوئی جا کر اس حالت کی تجھے خبر کر دے اور آخری دیدار دکھانے پر مایل کر دے مگر کسی چہرے سے نہیں پایا جاتا کہ یہ اُمید پوری ہو۔ اس لئے نظر پریشان ہو ہو کر سب کا مُنہ تکتی ہے "منہ تکتی ہے" میں ایک لطیف معنی اور پنہاں ہیں وہ یہ کہ نظر بڑی حسرت سے ہر چہرے پر گرتی ہے کاشکے وہی تیرا چہرہ نکلے جس کا پہچاننا عالم نزع میں ہوش و حواس بجا نہ ہونے کے باعث دشوار ہے اسس پہچاننے کے لئے نظر کا پریشان ہو ہو کر سب کا مُنہ تکنا قیامت کا درد انگیز ہے۔ یہ ہے جذبات نگاری کا اعجاز۔

جس قسم کے اشعار ابھی پیش کئے گئے اسی قسم کی وہ نظم ہے جو "دلِ بیقرار سو جا" کے عنوان سے اوراق ماسبق میں کہیں درج کی گئی۔ ان اشعار میں رنگ تغزل کی روح کھینچ آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرور غزل گوئی کے لئے پیدا ہوئے تھے لیکن اس صنف کی پامالی اور رکاکت نے ان کو اس سے نفور کر دیا اور قدرت نے سچی اور صحیح نیچرل شاعری کی تکمیل اُن کے ہاتھوں کرا کے اُردو شاعری کو خصوصاً اور اُردو ادب کو عموماً وہ سرمایہ نفیس بخشا

جولا جواب ولا زوال ہے۔
شاعر اپنی قوم کا پیمبر ہی نہیں ہوتا بلکہ اُس کی زندگی کی قوتوں کا امین و محافظ بھی ہوتا ہے۔ اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اِس کی شاعری میں اِس کی قوم کے خیالات، رسمیات، روایات معتقدات، اخلاقیات و دینیات غرض کہ تہذیب و تمدن کے روشن اور تاریک جملہ پہلو محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بُرائیوں کو وہ جو کہتا ہے اور خوبیوں کو اُبھار کر اور سراہ کر اپنی قوم کی آئندہ زندگی کی قوت و مدت بڑھاتا ہے ہر قوم کا ادب اُنھیں خصوصیات سے مالا مال ہوتا ہے حقیقتاً ادب کی غائت یہی ہے لیکن اگر اُردو ادب کو اِس نظر سے دیکھا جائے تو ہندو قوم کی خصوصیات اِس میں نہیں پائی جاتیں۔ اِس کے وجود و اسباب چند در چند ہیں ان میں سے ایک اُردو سے ہندی الفاظ کا اخراج بھی ہے جن کا استعمال ہندو دھرم، دھارمک سنسکار اور ہندو معاشرتی زندگی کے اظہار کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ کہنا کہ ہندی الفاظ مخل فصاحت ہوتے ہیں فصاحت کے اصولوں سے بیگانگی ظاہر کرنا ہے۔ کوئی لفظ بذات خود نہ فصیح ہے نہ ثقیل اُس کے اسلوب استعمال پر فصاحت و ثقالت کا دار و مدار ہے۔ سرور نے اُردو ادب کے مسلمہ معیار سے جس میں سراسر ایرانی روح ہے، علیحدہ معیار قائم کیا وہ معیار جو ہندوستانیوں کی شاعری اور ادب کا ہو سکتا ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ سرور کی شاعری میں خالص ہندوستانیت رچی بچی ہے جس میں ہندوؤں کی معاشرتی خصوصیات کے بھی گونا گوں

پہلو ہیں چونکہ ان پہلوؤں کا اور ہندی زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے ہندی الفاظ کی آبرو بھی سرور نے اپنے یہاں قایم رکھی اور فارسی عربی الفاظ کے ساتھ انھیں اس طرح سمویا ہے کہ فصاحت و لطافت شاعر کا منہ چومتی ہے اور ناطقہ وجد کرتا ہے "لکشمی جی" میں کہتے ہیں۔

شبھ مہورت تھی عجب اور عجب سبھ تھی لگن ۔۔۔ کہ جب آکاش سے اُترا تھا تیرا سنگھاسن
نظر آئی تری صورت میں عجب حسن کی جوت ۔۔۔ تو نے دیوی ہمیں اپنے جو دکھائے درشن
اک چکا چوند کا عالم دم نظارہ تھا ۔۔۔ گورا گورا تن نازک تھا سراپا کندن
شعلۂ حسن دل افروز بھڑک اٹھتا تھا ۔۔۔ رخ روشن پہ جو پڑ جاتی تھی سورج کی کرن
تھی چمک آہ تیرے چاند سے رخساروں کی ۔۔۔ کسی مندر میں تھے یا گھی کے دئے دو روشن
ترچھی بانکی وہ کمانیں تھیں کڑی دونوں بھویں ۔۔۔ لئے پھرتے تھے کبھی بن میں جنھیں رام و لچھمن
دل کو چھینے لئے جاتی دم نظارہ تھی ۔۔۔ پیاری پیاری تھی عجب چاند سے مکھڑے کی پھبن
تیرے ماتھے پہ تھا چندن کا لگا یا ٹیکا، ۔۔۔ اپسراؤں نے کیا تھا ترے رخ پر اُبٹن
رخ تاباں پہ برستا تھا ترے نور ازل ۔۔۔ ٹپکے ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی بھرن
بھولی بھولی سی وہ صورت وہ ادائیں پیاری ۔۔۔ نیچی نیچی وہ نگاہیں وہ انوکھی چتون
کوکلا سی وہ تیری ہائے سریلی آواز ۔۔۔ میٹھے میٹھے ترے ڈوبے ہوئے امرت میں بچن
گوری گوری تھی جبیں برج کی سندر کوئی نار ۔۔۔ زلف تھی یا کوئی متھرا کی سکھی شیام برن
خوشنما کانوں میں کنڈل تھے تو ہاتھوں میں کنول ۔۔۔ اوڑھنی ہلکی سی ریشم کی تھی اک زیب بدن
تو اس انداز و ادا سے جو زمیں پر اتری ۔۔۔ دیکھنے والوں نے جھک جھک کے لئے تیرے چرن
مچ گئی دھوم تیری جلوہ گری کی پھر تو ۔۔۔ پھوٹ نکلی تیری شہرت کی زمانے میں کرن

لکشمی ہوں تمھیں دینے کو ہوں آئی درشن
اہل نظارہ سے تصویر تیری بول اُٹھی

سرورؔ کی بہت نمایاں خصوصیتیں دیکھنے کے بعد تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ ایک بالکل غیر معمولی شاعر تھے اُن کی شاعری کا حرف حرف شعر ہے۔ اُن کی جو نظم ہے بے مثل و بے نظیر ہے۔ کسی شاعر سے اُن کا مقابلہ و موازنہ نہیں ہو سکتا۔ مقابلہ اور موازنہ ہمجنس چیزوں میں ہوتا ہے۔ جو چیز سرورؔ نے بیش کی وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتی وہ اپنی طرز کے آپ ہی موجد تھے اور آپ ہی خاتم۔

کلام سرورؔ پر اب تک نفس شاعری اور اُس کے متعلقات کے اعتبار سے بحث کی گئی اس شاعری کا اُردو دُنیا میں کیا اثر ہوا یہ بھی معلوم کرنا لازمی ہے۔ رہنما اور پیشوا وہی ہوتے ہیں جو کثیر تعداد لوگوں میں کوئی اچھی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ سرورؔ نے بھی ادب میں ایک تبدیلی پیدا کی۔ جہاں اُن کی سحر بیانی نے روکھی پھیکی جدید شاعری میں تاثیر کی روح پھونکی اور اُسے خالص ہندوستانی ادب کے رنگ میں رنگا وہاں اُن کی بلند بینی اور پاکیزہ خیالی نے اُردو شاعری کے اخلاق و تہذیب کی بھی اصلاح کی سرورؔ کے زمانے تک عام اُردو شاعری غزل ہی میں محدود تھی اور غزل جیسی ناپاک ہوگئی تھی اُس پر ابتدائی اوراق میں کہیں اشارہ کیا جا چکا۔ یہ اُس غزل ہی کی برکت تھی کہ عورت کا تصور اس شاعری میں ایسا پیدا ہو جس سے گھن ہوتی ہے اور جو اُردو کی تہذیب پر ایسا دھبہ ہے کہ دھوئے چھُوٹ نہیں سکتا۔ سرورؔ نے شاعری کو ایکدم روحانی صفات سے مالا مال کر دیا اس کے اخلاق کو پاکیزہ اور بلند بنا دیا۔ "زن خوشخو" جیسی بلند پایہ نظم لکھکر

ہندوستانی تہذیب میں عورت جس دیوی کا نام ہے اُس کا نمونہ پیش کیا۔ ادھر خیالات کی بلندی اور پاکیزگی اُدھر زبان کا جادو آپ کی نظمیں لوگ آنکھوں سے لگاتے تھے۔ جس نے بھی آپ کا کلام ایک نظر دیکھ لیا اُس کی نظر سے وہ مبتذل، پامال اور سوقیانہ شاعری گر گئی جو اُس زمانے میں عام تھی۔ شاعر اور غیر شاعر سب پر اِس کا اثر ہوا۔

سرور آنجہانی کا وجود ادبی دنیا کے لئے ایک خاص برکت تھا آپ کے سوز و گداز نے اُردو شاعری کو ایک مقدس چیز بنا دیا۔ آپ کی فکر رسا نے عروس شعر کو وہ رنگینی و آرائش بخشی جو بالکل انوکھی چیز ہے اور جس کی آب و تاب نے تمام پرانے زیوروں کو ماند کر دیا آپ کی سحر کاری کے نقش و نگار اُردو سے مٹ نہیں سکتے۔ شاعری کے پردے میں آپ نے ایسی چیز پیش کی ہے جو عشق حقیقی کی لذت اور تڑپ کا سرچشمہ ہے۔ بلند خیالی کا آسمان ہے اور رنگینی و لطافت کا چمن بے نظیر۔ افسوس ایسا نادر وجود ایسی گراں پایہ ہستی ہم سے ایسی جلد جدا ہو گئی کہ ہم اُس کے دل نواز اور جاں پرور نغموں کو اچھی طرح سُن بھی نہ سکے اُن کا لطف لینا تو درکنار۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص جس کا سینہ ایک آگ سے ہر دم جلتا رہتا ہے، جس کی آنکھوں سے خون کے فوارے رواں ہوں جس کی رگ رگ میں چنگاریاں لگی ہوں جس کے رونئیں رونئیں میں تڑپ ہو اتنا بھی جی جائے تو غنیمت ہے۔ پروردگار کا شکر ہے کہ وہ اپنی زندگی کے سمندر کا متھا ہوا ایک انمول رتن شاعری کے رنگ میں ہمیں ترکہ میں

دے گیا ہے اب یہ ہمارا فعل رہا کہ اس رتن کو قوم کے تاج میں لگائیں یا خاک میں ملائیں مگر یہ یاد رہے:-

اب ملے گی مشکلوں سے مرنیوالے کی مثال

نظرؔ لکھنوی

ولادت ۱۸۶۶ء　　　　وفات ۱۹۲۳ء

چشم و چراغ دہر تھا پوچھتے ہو نظرؔ کو کیا
سرمہ ہے اس کی خاک بھی دیدۂ اعتبار میں

لکھنؤ کی سرزمین بھی عجیب سرزمین ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ دہلی کو ہزار ہا سال سے فرمانروایان ہند کی راج دھانی ہونے کا شرف حاصل ہے اس اعتبار سے اُس کا اور لکھنؤ کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن تاجداران اودھ کے عہد میں لکھنؤ کو بھی وہ بات نصیب ہوئی جس کی خصوصیتیں یادگار زمانہ رہیں گی۔ یہ انھیں تاجداروں کی فیاضیاں اور ہنر نوازیاں تھیں کہ اب تک یہاں کی خاک کے ذروں پر کمال اور اہل کمال کے نقش بہت ہیں۔ ایسے ایسے علوم و فنون نے یہاں فروغ پایا جن کو زمانہ بھول چکا تھا۔ ایسی ایسی صناعیوں کو عروج ہوا جو انسانی عقل کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں یہ تمام علم و ہنر اور صناعیاں اُس وقت کی سوسائٹی کا زیور تھیں۔ انھیں میں ایک فن شعر بھی تھا۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اُس وقت کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا اور اُس رنگ کا شاعری پر اور شاعری کا اُس پر کیا اثر پڑا

منشی نوبت راے نظر لکھنوی

اگر اس سوسائٹی میں برائیاں تھیں اور اگر شاعری نے سوسائٹی کو اور سوسائٹی نے شاعری کو خراب کیا تو اس کا جواب وہ زمانہ ہے جو کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ ہمیں فن کو بہ نظر فن دیکھنا چاہئے۔ اس نقطہ نظر سے دنیا جانتی ہے کہ لکھنؤ اپنی خصوصیات میں فرد ہے۔ اگر ہندوستان بھر میں کوئی مقام دہلی کا مقابلہ کر سکا ہے تو لکھنؤ دہلی کی موثر سادگی اور صفائی کا جواب صناعی اور نفاست ہی ہو سکتا تھا۔ یہی صناعی و نفاست قدرت نے لکھنؤ کی سرزمین کو عطا کی اور یہاں کی خاک کے ذرے جب اُڑے تو آسمان پر آفتاب بنکر چمکے۔

اسی لکھنؤ کی سرزمین میں نظر آنجہانی کے آبا و اجداد خاک کے پیوند ہوئے وہ جنھوں نے اپنے وقت میں علم و ادب میں نام پیدا کیا۔ انھیں گمنام بزرگوں کی یادگار نظر آنجہانی تھے۔ آپ کا نام نوبت رائے تھا سکسینہ کا یستھوں کے گھرانے میں آنکھ کھولی فارسی گھٹی میں ڈالی گئی۔ کچھ دنوں بعد مولوی صاحب نے مکتب کی رسم ادا کی۔ علم و ادب کی بسم اللہ ہوئی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت و فطانت کی چمک چہرے پر نمودار تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں فاضلانہ استعداد بہم پہونچائی۔ انگریزی بھی لکھنے پڑھنے کے قابل سیکھ لی۔ اُس زمانے میں گلی کوچے اور گھر گھر شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ آئے دن مشاعرے ہوتے تھے نظر کو ذوق علم و ادب اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہی تھا فطرت نے ملکۂ شاعری اور ودیعت کر دیا۔ شعر کہنا شروع کیا ۱۸۸۲ء میں آغا مظہر کے شاگرد ہوئے جن کا سلسلہ شاعری مصحفی تک پہونچتا ہے۔ ذہین طبیعت

طراز سے بھرنے لگی اور وہ کمال پیدا کیا جس پر لکھنؤ کی سرزمین کو بجا طور پر
ناز ہو سکتا ہے۔

ہندو خیال کے مطابق لکشمی اور سرسوتی میں بیر ہے اور ایک دوسری
کی سوت مانی جاتی ہے۔ اِس سوتیا ڈاہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے بہرحال
یہ تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں سخنوروں کو آسودگی نصیب
نہیں ہوتی۔ ایک دو مثالیں، ممکن ہے، اِس کے برعکس بھی ہوں اُنھیں
مستثنیات سے سمجھنا چاہیے۔ عام طور سے ارباب سخن کو بے اطمینانی ہی کی
زندگی بسر کرتے دیکھا۔ پھر ایک ہندو شاعر کے لئے تو فارغ البالی اور آسودہ
حالی خواب وخیال تھا۔ یہ تو ضرور ہوا کہ نظر نے بڑی عزت و وقار کے ساتھ
زندگی بسر کی لیکن معیشت کی طرف سے بیفکری بھی نصیب نہ ہوئی۔
وہ شاعر تھے ادیب تھے قلم پر اُن کی معاش کا انحصار تھا۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے
اپنا مشہور رسالہ "خدنگ نظر" نکالا جو بہت سال بعد مالی مشکلات کے باعث
بند کرنا پڑا۔ خدنگ نظر میں ابتداءً غزلیں ہی شائع ہوئی تھیں جن کے
لئے خاص طور سے مشاعرے کئے جاتے تھے۔ خدنگ نظر کے ٹیٹل پر
پہلے یہ شعر ہوتا تھا۔

مانوس ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ
بہلائیں دِل کو سیر خدنگ نظر سے آپ

کچھ عرصہ بعد یہ شعر لکھا جانے لگا۔

نکلا ہے بن سنور کے خدنگ نظر نہ ہو — یاں دِل دھڑک رہا ہے کسی کی نظر نہ ہو

کچھ دنوں بعد خدنگ نظر میں مضامین نثر کا بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں
منشی دیا نراین نگم آنجہانی اڈیٹر رسالہ زمانہ نے آپ کو کانپور بلایا اور زمانہ کے اسٹاف
میں شامل کر لیا۔ ۱۹۱۰ء میں آپ انڈین پریس الٰہ آباد میں چلے گئے۔
وہاں سے ادیب کا اجرا کیا۔ ڈیڑھ سال بعد ۱۹۱۱ء میں وہاں سے مستعفی
ہو کر لکھنؤ چلے آئے۔ تھوڑے دنوں بعد پھر کانپور آ کر زمانہ کے اسٹاف میں
شامل ہو گئے۔ اب کے مرتبہ اخبار آزاد کی ترتیب اور نگرانی بھی، جو زمانہ
کے ہی دفتر سے ہفتہ وار نکلتا تھا اور اب بھی نکلتا ہے آپ کے سپرد ہوئی
۱۹۱۴ء میں پھر لکھنؤ چلے آئے۔ ظاہر ہے غربت کا زمانہ ناساز گار رہا
لکھنؤ میں رائے بہادر منشی پراگ نراین بھارگو مالک مطبع نولکشور و اودھ
اخبار کی قدردانی سے اخبار تفریح کی ادارت آپ کے سپرد ہوئی۔ تھوڑے
دنوں بعد لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور اخبار "اودھ اخبار" کی ادارت
بھی آپ کو مل گئی۔ اودھ اخبار میں آپ نے اس قدر تن دہی اور دماغ
سوزی سے کام کیا کہ آپ کی صحت خراب ہو گئی اور اس سے تعلق منقطع
کرنا پڑا۔ اس کے بعد پنڈت برج ناتھ شرغا ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ کی
تحریک سے اخبار خادم ہند سے وابستہ ہو گئے غالباً ۱۹۱۵ء میں۔ یہ
اخبار امن سبھا کی طرف سے نکلتا تھا۔ نظرؔ نے اس پرچے کو پسندیدہ اور
معتبر پرچہ بنا دیا۔ لیکن یہ اخبار آپ کی قابلیتوں کے اظہار کے لئے
تنگ اور ناموزوں میدان تھا۔ اہل ملک جانتے ہیں امن سبھا کس
ڈھونگ کا نام تھا۔ اس کے صحیفے کو چمکانے کے لئے نظرؔ کو آزادی تحریر

کا کتنا خون کرنا پڑا ہوگا اور طبیعت کے قدرتی بہاؤ کو کس قدر دبانا اور بدلنا پڑا ہوگا۔

نظرؔ دبلے پتلے میانہ قد بزرگ تھے۔ رنگ گندمی تھا۔ لباس میں سادگی تھی مگر مزاج میں بے انتہا صفائی اور نفاست تھی۔ تصنع اور بناوٹ سے بہت دور تھے۔ کسی قسم کی نمود و نمائش نہیں پسند کرتے تھے طبیعت بہت غیور خود دار تھی اور متین تھی۔ اخلاق بڑا شگفتہ تھا۔ ہر بات میں حسن اور لطافت مدنظر رکھتے تھے۔ یہی حسن و لطافت کا جوہر شاعری، مصوری اور خوش نویسی میں کمال بنکر چمکا۔ شاعر تو تھے ہی تصویر بڑی چابکدستی سے کھینچتے تھے۔ خط نہایت پاکیزہ اور روشن تھا چوسر اور گنجفہ کا شوق تھا شطرنج تو خوب ہی کھیلتے تھے۔

فکر معیشت سے کبھی نظرؔ کو نجات نہیں ملی جیساکہ لکھا گیا۔ صحت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ دمہ کا مرض گھن کی طرح لگا ہوا تھا۔ جس نے آخرالامر جان لیکر پیچھا چھوڑا۔ خانگی صدمے بھی ایسے ایسے پہونچے کہ کلیجہ پاش پاش ہو گیا۔ کوئی لڑکا تو آپ کے تھا نہیں۔ ماں تھیں ایک بیٹی تھی اور ایک نواسہ۔ یہی نواسہ آپ کی آنکھوں کا نور تمناؤں کی کھیتی، زندگی کا سہارا اور روح کی راحت تھا۔ پہلے نواسہ ہی کو اجل آئی۔ نظرؔ کا کلیجا پھٹ گیا کمر ٹوٹ گئی۔ نگاہوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ اس سانحہ پر ایک نوحہ آپ نے لکھا جو واقعی دل ہلا دینے والا ہے۔ اپنی حالت کا بالکل سچا نقشہ کھینچا ہے لکھتے ہیں۔

تھمو تھمو کہ اس اجڑے مکان کا تھا یہ چراغ
بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ
تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ

فغانِ بلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

اور یہ امر واقعہ ہے کہ نظر کے باغ سے ہمیشہ کے لئے بہار رخصت ہوگئی۔ لیکن قدرت کو ترس نہ آیا۔ تھوڑے دنوں بعد ماں کا انتقال ہوا لکھتے ہیں۔

اشک خونیں بارہا ٹپکے تھے آنکھوں سے مگر
اِس قدر سرخی نہ تھی خونِ تمنا میں کبھی
ہوگیا آغوشِ مادر بھی جدا آج اے نظرؔ
اب ملیگی ایسی راحت پھر نہ دنیا میں کبھی

لیکن صدموں کی ابھی انتہا نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے بھائی کے داماد منشی ماتا پرشاد آپ کے پڑوس میں رہتے تھے اُن کا ایک چار سال کا بچہ تھا۔ نظر اپنے کھوئے ہوئے نواسہ کو اس بچہ میں دیکھنے لگے اور اپنے زخموں کا مرہم اِس کی محبت میں حاصل کرنے لگے۔ بیشتر اسے اپنے پاس رکھتے۔ بڑے لاڈ پیار سے کھلاتے پلاتے اور پاس سلاتے۔ تھوڑے دنوں بعد اجل نے اسے بھی تاکا دفعتہً ایک روز چھت سے گرا۔ چار دن بعد جان نکل گئی۔ ایسے روح فرسا سانحات کی کون تاب لا سکتا ہے جتنے دِن جیئے آزردہ جیئے آخر خود بھی یہ کہتے ہوئے ایک روز دُنیا سے رخصت ہوگئے۔

اے انقلابِ عالم تو بھی گواہ رہنا
کاٹی ہے عمر ہم نے پہلو بدل بدل کر

حضرت محشرؔ لکھنوی نے تاریخ کہی۔

کلکِ محشرؔ نے لکھا سالِ وفات
شاعرِ کامل نظرؔ سے چھپ گیا

جیسا عرض کیا گیا نظر ملا کے ذہین و طباع تھے اس پہ علمی انہماک۔ سخنوری وانشا پردازی کو کمال پر پہونچا دیا۔ جتنے اخبار اور رسالے آپ کی ادارت میں نکلے سب کی کایا پلٹ دی اور ایسا سنوارا کہ ادبی تہذیب کا نمونہ بن گئے۔ رسالہ ادیب نے تو وہ معیار پیش کیا جو رسالہ کا نصب العین ہے۔ آپ کی انشا پردازی کے متعلق منشی دیا نراین نگم ایڈیٹر زمانہ کے جوبلی نمبر میں لکھتے ہیں۔

"گو انگریزی میں اسکول کا معمولی کورس بھی ختم نہ کیا تھا لیکن دقیق سے دقیق مضامین کا بخوبی ترجمہ کر لیتے تھے......

.... آپ کی پہلی تنقید نقاد لکھنوی کے نام سے جون ۱۹۰۵ء کے زمانہ میں مثنوی گلزار نسیم کے متعلق شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ کی اکثر عالمانہ تنقیدیں شائع ہوتی رہیں۔ نیر شکوہ آبادی، داغ دہلوی، رجب علی سرور پر آپ کے مضامین اپنا جواب نہیں رکھتے۔ زمانہ میں ایک سلسلۂ مضامین اُردو رسالوں کے حصۂ نظم کی تنقید کا بھی شروع کیا گیا تھا یہ نظر صاحب ہی کا لکھا ہوتا تھا۔ وفات کے ماہ سوا ماہ قبل خطوط اکبر پر آپ نے ایک آزاد اور عالمانہ تنقید زمانہ میں لکھی تھی۔"

یہ تنقید دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو میں تنقید نگاری افراط و تفریط کی نذر ہو جاتی ہے۔ جب لوگ تعریف کرنے پر آتے ہیں تو اپنے ممدوح کی عظمت ثابت کرنے کے لئے ایسی ایسی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں جن سے اُس کی تصنیف کو دور کا بھی لگاؤ نہیں ہوتا۔ یہ اکابر پرستی

یا بیہودہ رشتہ ہے تنقید نگاری نہیں، تنقید بے لاگ ہونا چاہئیے۔ نظر نے
ایسی ہی تنقیدیں لکھی ہیں اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی دکھا دیا ہے
صحت مذاق اور وقت نظر کے اعتبار سے بھی آپ کی تنقیدیں قابل تقلید نمونہ ہیں
آپ کس پایہ کے انشاپرداز تھے اس کا صحیح صحیح اندازہ اُس وقت ہو سکتا ہے
جب آپ کے ناول اور تمام وہ مضامین جو اُس وقت کے معیاری رسالوں
کا زیور تھے جمع کر کے ادبی دُنیا میں پیش کئے جائیں یہ فرض اُردو والوں کا تھا سو
نہ آپ کے مضامین نثر باقی ہیں نہ تصنیفات نظم۔ اگرچہ بقول حسرت موہانی نظر
شاعری کے علاوہ نثر کے بھی اچھے انشاپرداز تھے اور اوایل عمر سے آخر وقت
تک آپ ملک کی بہترین خدمت میں مصروف رہے لیکن ہم نے تو اب تک
آپ کا نام بھی کسی معتبر تذکرے میں نہیں دیکھا مجموعہ کلام کا شایع ہونا تو
در کنار۔

اچھا کلام کسی تعارف یا تمہید کا محتاج نہیں ہوتا وہ خود پکار اُٹھتا ہے
کہ میں کیا ہوں۔ کلام نظر کے متعلق بھی ہم کسی موشگافی سے کام لینا نہیں چاہتا
سوا اس کے کہ اُس کی ممتاز خصوصیات کی طرف کچھ اشارے کر دئے جائیں
آفتاب خود اپنی دلیل ہے۔ نظر کے کلام کو دیکھنے والا بغیر اُس سے متاثر ہوئے
نہیں رہ سکتا۔ یہ تاثیر ہی کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ لکھنؤ سے مقام
میں نظر نے اپنی مخصوص جگہ پیدا کر لی تھی اور بعض مشاعرے تو اُنھیں کے
ہات رہے۔ ایک مرتبہ رشید لکھنوی کے شاگرد نواب مرزا ملک نے
مفتی گنج میں بڑا دھوم دھام کا مشاعرہ کیا۔ طرح تھی کیا ہے ہوا ہے

جس وقت نظر نے ذیل کا مطلع پڑھا مشاعرہ اُلٹ گیا اور صبح ہوتے ہوتے دور دور اس مطلع کی شہرت ہو گئی۔

یا دلِ ہے میرا یا تیرا نقشِ کفِ پا ہے
غُل ہے کہ اک آئینہ سرِ راہ پڑا ہے

اسی طرح ایک مشاعرے میں ذیل کے مطلع کی دھوم ہو گئی تھی اور یہ حاصل طرح بھی مان لیا گیا تھا۔

نزع میں دیکھا جو اُن کو اپنے پاس آتے ہوئے
اُٹھ گئے اک بار دونوں ہاتھ تھراتے ہوئے

ملک کے بلند پایہ ادیبوں نے آپ کی شاعرانہ و ادبی فضیلت کا اعتراف کیا، محمد سلیم صدیقی (لکھنؤ یونیورسٹی) اُردو ایسوسی ایشن میگزین سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء کے صفحہ نمبر ۱۲ پر لکھتے ہیں۔

"نوبت رائے نظر حسن کی نظر عنایت ہمیشہ اُردو پر مبذول رہی اپنے زمانے کے مشاہیر شعرا میں تھے۔ اِن کے لئے اگر یہ کہا جائے کہ ہر فن میں طاق تھے تو غلط نہ ہوگا۔ اچھے شعر جو دوسروں کے یہاں خال خال پائے جاتے ہیں ان کی اُن کے کلام میں فراوانی تھی تنقیدی اور تحقیقی مضامین بہت ہی بصیرت افروز ہوتے تھے"

مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں۔

"آپ کی شاعری میں زبان اور بیان کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور اُردو زبان کی تاریخ میں صفیؔ، عزیزؔ، محشرؔ، ثاقبؔ، ناطقؔ، چکبستؔ، کی طرح آپ کا شمار بھی اساتذہ لکھنؤ میں کیا جائیگا"

مولوی مہدی حسن ناصری۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر فیلو الہ آباد یونیورسٹی اپنی تالیف نصاب جدید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، "پھر عزیزؔ، ثاقبؔ، نوبت رائے نظرؔ،

چکبست وغیرہ نے اپنی وسعتِ خیال اور شیرینیٔ مقال سے دُنیائے شاعری میں ایسے بیش بہا اضافے کئے کہ بایدو شاید"

مرزا محمد عسکری بی۔ اے نے رائے بہادر رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب اے ہسٹری آف اُردو لٹریچر کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں ایک ضمیمہ اُن شعرائے حال کے متعلق تھا جو صاحبِ تصنیف سے نظر انداز ہو گئے تھے۔ اس میں نظرؔ کے متعلق مترجم لکھتے ہیں۔

"کچھ اندوہ و یاس ہی پر موقوف نہیں نظرؔ کے کلام میں سلاست زبان، لطف بیان، اعلیٰ تخیل، غرض کہ جملہ محاسن شاعری علی الخصوص وہ سب چیزیں جو غزل کی جان ہیں پوری طرح موجود ہیں۔ وہ غزل ہی خوب کہتے تھے اور اسی صنف میں وہ اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اور وہ لوگ اُن کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے .... "علاوہ شعر و شاعری کے وہ فن تنقید میں اور نثر نگاری میں بہت ممتاز تھے ......"

مندرجہ بالا مبصروں اور ادیبوں نے کلام نظرؔ کے متعلق جو کچھ کہا ہے یہاں اُسے ذرا تفصیل سے دکھانے کی ضرورت ہے۔ نظرؔ کی شاعری کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے اُن کے زمانے کی لکھنؤ کی شاعری کا رنگ دیکھنا ضروری ہے۔ لکھنؤ کی شاعری ہمیشہ سے خارجیت کے لئے مشہور رہی۔ اس میں خیالات کے گل بوٹے تو بہت ہیں۔ زبان کی رنگینی و نزاکت بھی خوب ہے لیکن جذبات نہیں اور اگر ہیں تو برابر نہ ہونے کے۔ لکھنؤ کے متغزلین کے بادشاہ آتشؔ خیال کئے جاتے ہیں لیکن آتشؔ

آتش نے خود شاعری کو مرصع سازی تک ختم سمجھا ہے۔

ع۔ شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

نظر کے اوائل عمر میں لکھنؤ کی فضا امیر و جلال کے نغموں سے گونج رہی تھی اُن کے بعد امیر مینائی نے مدت العمر اپنے اُستاد اور اسلاف کے رنگ کو جلا دی۔ اِدھر حالی، آزاد اور سرور جہان آبادی جدید شاعری کی نبیاد ڈال رہے تھے اور گل و بلبل، زلف و عارض، شانہ و آئینہ، تیر و شمشیر، قاتل و بسمل کے خلاف جہاد کی تعلیم دے رہے تھے۔ عام لوگوں کو بھی اس دفترِ پارینہ سے کراہت ہو چلی تھی یہاں تک کہ بعض حلقوں میں لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کرنا شعر و ادب کی سند سمجھا جاتا تھا۔ زمانے کی مخالفت جس میں کچھ صداقت بھی نہیں لکھنؤ والوں کو بھی محسوس ہوئی اُنھوں نے بھی پرانی شریعت میں ترمیم ضروری سمجھی اور پرانی ڈگر سے انحراف شروع کیا۔ اصلاح کی نبیاد پڑی اور غزل جواب تک حسن و عشق کے سوقیانہ و بوالہوسانہ خیالات کا دفتر تھی بلندی کی طرف مایل ہوئی۔ صداقت و جذبات نگاری، اور بلند خیالی شعرا کا مطمح نظر ہو چلا۔ صداقت و جذبات نگاری سلاست و سادگی کی مقتضی ہوئی اب مرصع سازی و سادگی میں ایک الجھاؤ پیدا ہو گیا جس میں بھنسکر بلند خیالی و صداقت تصنع کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور جذبات کو تو مرصع سازی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نظر نے اس الجھاؤ کو صاف کیا اور ایسا صاف کیا کہ یہ آن کا

امتیازی طرہ ہوگیا۔ اس اصلاح کے لئے لکھنؤ ہمیشہ نظرؔ کا ممنونِ احسان رہے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نظرؔ کے معاصرین کے یہاں اصلاحی خصوصیات نہیں۔ ضرور ہیں لیکن خال خال اور جذبات نگاری کا مفہوم اکثر و بیشتر موت، میت، لاشہ، بیمارِ غم، ہنگامِ نزع، آخری ہچکی وغیرہ وغیرہ کے خیالات میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ قدامت پرستی ترک کر دینا آسان کام نہیں۔ ارادہ کرتے کرتے بھی نسلیں گزر جاتی ہیں یک لخت اس سے دامن چھڑا لینے والے کم ہوتے ہیں۔ نظرؔ نے اپنے کلام میں پرانے لکھنوی رنگ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا۔

حضرت نظرؔ فطری شاعر تھے۔ اُن کا مستقل رنگ جذبات نگاری ہے اُن کا کلام کیفیاتِ قلب کا آئینہ ہے، بلند خیالی کا دفتر ہے۔ اُن کے اشعار میں بے انتہا سوز و گداز ہے۔ اس کی وجہ تھی۔ آنچہ از دِل خیزد بر دِل ریزد جو صدمے اُن کی جان پر گزرے معمولی نہ تھے۔ اول تو یوں ہی اُن کی زندگی آزردگی کی زندگی تھی اُس پر روح فرسا سانحات کا بیش آنا غم و اندوہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ یہ اُن کی سلامتی ذوق تھی کہ اپنی آہ میں اُنھوں نے واہ کی شان نہیں پیدا ہونے دی۔ یہاں اُن کا شاعرانہ اعجاز تھا کہ قلب کی المناک کیفیتوں کو ایسی پاکیزہ اور دلکش زبان میں ادا کیا کہ دِل تڑپ اُٹھتا ہے۔ کس غضب کا مطلع کہا ہے۔

ضبط سے دِل نزار رہتا ہے اندرونی بخار رہتا ہے

شعر وہ ہے جو سنتے ہی دِل میں اتر جائے اور اُس پر جتنا غور کیا جائے

اتنا ہی لطف زیادہ آئے - اندرونی بخار میں یہی وسعت ہے - اس میں طرح طرح کی ایذاؤں کا درد پنہاں ہے - یہی وہ رنگ ہے جسے سہل ممتنع کہتے ہیں - اور دیکھئے -

یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا　　　اب بہت بیقرار رہتا ہے

شعر نہیں نشتر ہے اور دیکھئے -

قطع امید ہو تو صبر آئے　　　روز اک انتظار رہتا ہے

ہائے ہائے امید کی ستم آرائی دل کو کس انداز سے بیان کیا ہے - انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک طرف سے امید منقطع ہوتی ہے تو دوسری طرف سے نئی نئی امیدیں پیدا ہوتی ہیں جن کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا - سلسلے ہی کو شاعر انتظار کے جادو طراز لفظ سے تعبیر کرتا ہے اگر منقطع ہو جائے تو زندگی کا سہارا ہی جاتا رہے - اس صورت میں جبکہ امید کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں تو صبر بھی کیونکر آئے - ایسی ہی شاعری کو سادگی و پرکاری کہتے ہیں -

دل کی حالت نہیں بدلنے کی　　　اب یہ دنیا نہیں سنبھلنے کی

دنیا کے لفظ میں قیامت کے انداز اور معنی ہیں -

دل سوزاں کو شمع کیا کہئے　　　اس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی

عشاق دل کو شمع ہی کہتے ہیں لیکن دل سے شمع کو کوئی مناسبت نہیں - جو لطف جلنے کی حسرت میں ہے وہ جلنے میں کہاں - کیا بات کہی ہے

کچھ اور اشعار سنئے -

دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی — زندہ ہوں اب کہ مردہ یہ بھی خبر نہیں ہے
یاس و ناکامی سے بحس قلب مضطر ہو گیا — اب تیرا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا
یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی — دل میں سناٹا نہ تھا وحشت کبھی ایسی نہ تھی
تباہی دل کی دیکھی ہے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے — ہو اب کیسی ہی بستی ہم اُسے ویرانہ کہتے ہیں
کوئی مجھ سا مستحق رحم و غمخواری نہیں — سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

کون شخص ہے دنیا میں جو سب سے زیادہ اپنے کو ناکام و نامراد اور مستحق الطاف خدا وندی نہ سمجھتا ہو۔ ایسے ہی اشعار کو الہامی کہتے ہیں۔

اُس کو رحم آئے کہاں یہ ناامیدی ہے مگر — دل کو خوش کرتا ہے شغل گریہ و زاری ابھی

جب انسان دکھ میں روتا ہے تو درپردہ اُس کے دل میں یہ امید کارفرما رہتی ہے کہ دکھ دینے والے کو مجھ پر رحم آجائے گا اس سے اس کا دل یک گونہ تقویت پاتا ہے اور کچھ بہل جاتا ہے ورنہ بجز خود فریبی کے اس میں کچھ بھی نہیں کیونکہ اُس بانی و بیداد و ستم سے رحم و کرم کی توقع خواب و خیال ہے کس قدر گہری اور نازک کیفیت کو کتنی سلیس اور موثر زبان میں ادا کیا ہے

قفس سے چھٹ کے ہوا باغ باغ دل کیسا — بہار دے گیا اجڑا ہوا نشیمن بھی

بے پناہ شعر ہے۔

ٹپکا نہ ہوگا قطرہ آخر بھی آنکھ سے — اے غم ہزار شکر کہ اب دل نہیں رہا

ہوئی ہے کیا جانے کیا بُرائی تعذر ہے پاتے نہیں رہائی

گلوں کی بو تک نہ اُڑ کے آئی ادھر کی شاید ہوا نہیں ہے

اِس شعر کی لذت اُن خستگان محبت کی دل سے پوچھو جو کسی کے واسطے

اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں زندگی بھی اُس کی راہ میں برباد کر چکے ہیں پھر بھی اُن کی طرف نگاہ کرم نہیں ہوتی اور قید و بند ہستی سے رہائی نہیں ملتی۔ اِس شعر سے ایسی چوٹ لگتی ہے کہ دِل تڑپ اٹھتا ہے

اتنی ہی رہ گئی ہے اب کائنات دل کی — دیکھو گے جب تم آ کر کچھ اضطراب ہوگا

دِل کی دُنیا کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ اُس کا کسی کی بے اعتنائیوں سے بالکل مٹ جانا اور مٹ مٹا کر ملنے سے اضطراب میں سمٹ آنا قیامت کا درد انگیز ہے "کچھ اضطراب" کی لذت بیان نہیں ہو سکتی۔

نہ چھیڑ اے ہمنشیں ناکامیٔ حسرت کا افسانہ — کہ اب تو بات کرنے سے بھی دِل میں درد ہوتا ہے

اب کچھ بلند بینی کے نمونے بھی ملاحظہ ہوں۔

گردش دہر بھی اک گردش پیمانہ ہے — ذرے ذرے میں ترا جلوہ مستانہ ہے

حالت محفل عشرت ہے رقم سب اِس میں — ایک دفتر کے برابر یہ پروانہ ہے

پرتو مہر کہاں ذرۂ ناچیز کجا — کیوں یہ دِل حسرتیٔ جلوۂ جانانہ ہے

جہاں میں چار دِن رہکر فقط بوئے وفا دینا — گلبن سے میں سبق لیتا ہوں آئین محبت کا

نہ ملتا مدعائے دِل درم ملتا جو منعم سے — مگر اِک داغ بنکر وہ کف سائل میں رہ جاتا

نہ ہوتی جلوہ گہ ناز کی وسعت معلوم — گو میں ہر ذرے کو اک دیدۂ حیراں سمجھا

یہی اک قطرۂ خوں حاصل ارض و سما ہوتا — بنا ہے دِل جو سینے میں نہ ہوتا دِل تو کیا ہوتا

زباں شمع نے رسوا کیا سوز محبت کو — مناسب تھا کہ خاموشی میں یہ مطلب ادا ہوتا

آشنا ہوتے ہیں سوز شمع کی منت کشی کیسی — جلے جو آگ میں اپنی اُسے پروانہ کہتے ہیں

معاذ اللہ تیرا حسن تیری بزم عشرت میں — یہ وہ محفل ہے جس میں شمع کو پروانہ کہتے ہیں

بند آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شے دہر کی — عالم رویا میں فرقِ خواب و بیداری نہیں
پردہ اٹھا دے اک دن تو حجابِ ہستی — پاتا ہوں اس کو دل میں دیکھا مگر نہیں ہے
دیدنی ہے صحبتِ ہم جنس باغِ دہر میں — پیار سے منہ رکھ دیا انگور نے انگور پر
وہ دل ہے بزمِ عالم میں نظرؔ اک سازِ شکستہ — نہ چھیڑے تارِ ہستی پر جو نغمہ اس کی عادت کا
جلوۂ بے ثبات ہوں رونقِ کائنات ہوں — پھول ہیں رنگ و بو ہوں میں جوش ہوں میں بہار کا
خزاں انجام ہے سب کی بہارِ چند روزہ کا — بہت روتا ہوں صورت دیکھ کر گلہائے خنداں کی

نظرؔ کے کلام میں بے انتہا تاثیر ہے۔ واردات قلب ہوں یا حقائق و معارف اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ شعر دل میں پیٹھ جاتا ہے سوز و گداز اور درد کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں کچھ ایسی پاکیزگی لوچ اور گیرائی ہے کہ دل محو ہو جاتا ہے۔ طرز ادا میں ایسی چستی و برجستگی ہے کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔ یہی گرمیٔ تاثیر کا نتیجہ ہے کہ کوئی شعر شعریت سے خالی نہیں یہ بھی نظرؔ کا امتیازی جوہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول حضرت سلیم صدیقی اچھے شعر جو دوسروں کے یہاں کم پائے جاتے ہیں ان کی ان کے کلام میں فراوانی ہے۔

نظرؔ کی قادر الکلامی کا اندازہ کرنے کے لئے وہ سہرا دیکھئے جو غالبؔ و ذوقؔ کے معرکہ آرا سہروں پر آپ نے فی البدیہہ کہا تھا۔ ایک دوست کے یہاں شادی میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے محفل رقص و سرود آراستہ تھی۔ آپ سے سہرا لکھنے کے لئے اصرار کیا گیا۔ آپ علیحدہ ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے اور چند ہی لمحوں میں ایک مرصع سہرا لکھکر پیش کر دیا۔ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے اعتبار سے غالبؔ و ذوقؔ کے سہروں کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے

لیکن اُن میں دلآویزی کا پتہ نہیں۔ نظر نے نزاکت آفرینی کے ساتھ ایسی دلاویز
زبان میں سہرا لکھا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ اور ایک شعر تو ایسا کہدیا ہے جو
صداقت، لطافت اور خوبی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

دستِ نازک تیرے مالن کوئی چومے آکر　　کہ ہے آرائشِ نوشہ کا تیرے سر سہرا

غالب کے دیوان کا مشہور مطلع ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

صد ہا شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ نظر کہتے ہیں۔

ذکرِ الفت پر نتیجہ یہ ہوا تقریر کا　　میں بھی چپ ہوں وہ بھی چپ عالم ہے اک تصویر کا
آتے آتے رک گیا ہے دم جو مجھ دلگیر کا　　آہ بھر کے منتظر ہوں آہ کی تاثیر کا

دونوں مطلع لاجواب ہیں۔ شعریت کے ساتھ ساتھ ان میں مصوری
بھی بلا کی ہے۔ اس مصوری یا محاکات کی بہت مثالیں
نظر کے یہاں ملتی ہیں دیکھئے۔

نزع میں دیکھا جو اُن کو اپنے پاس آتے ہوئے　　اُٹھ گئے اک بار دونوں ہات گھبرائے ہوئے

یہ شعر اپنے مفہوم کی ایک مکمل اور متحرک تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے
یہ مصوری اور شاعری دونوں کا اعجاز ہے۔

معاصرین کا موازنہ بھی تبصرہ نگاری کا جزو ہے۔ لیکن اس میں بہت طوالت
ہے۔ بہرحال نظر کے چند اشعار کے ساتھ ساتھ اُن کے بعض معاصرین کی ہم طرح
غزلیں پیش کئے دیتا ہوں۔ ناظرین خود اپنی استعداد و مذاق کے مطابق لطف
اُٹھائیں۔

فطرت

بہار میں ہے یہ ناز آفریں ادائے بہار
قدم زمیں پہ رکھتی نہیں ہوائے بہار

غضب ہے شعلہ فشاں گرمیٔ ادائے بہار
جدھر سے آگ لگی ہے اُڑی ہوائے بہار

وہ ایک تم کہ سراپا بہار و نازشِ گل
وہ ایک میں کہ نہیں صورت آشنائے بہار

بلا سے پیتے ہی پیتے چمن میں مرجاؤں
کسے اُمید ہے پھر آئے یا نہ آئے بہار

زمیں پہ لالہ و گل نکلے آشکار ہوا
چھپا نہ خاک میں جب حسن خودنمائے بہار

وہ ایک دل جو کھلا اور کھل کے مرجھایا
ہے ابتدائے بہار اور انتہائے بہار

تعلق گل و شبنم ہے رازِ الفت بھی
اُنھیں ہنسائے جہاں تک ہمیں رلائے بہار

عزیز لکھنوی

چھپے ہو تم تو بھلا پھر کہاں سے آئے بہار
حجاب اُٹھاؤ تو چلنے لگے ہوائے بہار

اثر پذیر ہوا حسن خودنمائے بہار
چمن میں روح نباتی بنی ہوائے بہار

قفس میں مرگئے یہ کہکے مبتلائے بہار
ادھر نہ آئے گی شاید کبھی ہوائے بہار

قفس میں رہ نہیں سکتے پھر آشنائے بہار
ذرا سی بھی کہیں سن لی اگر ہوائے بہار

جہاں میں دید کے قابل ہے اب تماشائے بہار
قفس کو لیکے اُڑی ہے میری ہوائے بہار

یہ اپنا اپنا مقدر یہ اپنا اپنا نصیب
زمانے بھر کو ہنسائے ہمیں رلائے بہار

یہ آج کس کی جوانی کو میں نے دیکھا تھا
میری نگاہ کو تکتے ہیں آشنائے بہار

ارے کھلے ہوئے پھولوں کے توڑنے والے
چمن میں کوئی نہیں درد آشنائے بہار

ہر ایک ذرہ مشہد سے خوں اُبلتا ہے
یہی ہے تیرے شہیدوں کی انتہائے بہار

وہی ہمارے لئے پھول ہیں تر و تازہ
قفس میں پھول کے آنسو اگر رلائے بہار

مبارک اہل چمن کو ہو ذوق خود بینی
اسیر کنج قفس کیا ہے آشنائے بہار

کلی سے پھول بنا پھول سے بنی پتی
وہ ابتدائے بہار اور یہ انتہائے بہار

نسیم کھولدے دروازہ صحن گلشن کا
وہ آرہے ہیں دکھاتے ہوئے ادائے بہار

بہار جس کو سمجھتے ہو وہ ہے اور ہی شئے
نگار خانہ ہستی ہے اِک ادائے بہار

دونوں استادوں کی غزلیں خوب ہیں ہوائے بہار کے قافیوں میں نظر کا دوسرا اور عزیز کا چوتھا شعر بہت ہی خوب ہے۔ عزیز نے آشنا کے قافیہ میں کئی شعر نکالے ہیں۔ یہ کس کی جوانی الخ خالص لکھنوی رنگ کا شعر ہے۔ مبارک اہل چمن کو الخ بڑے پایہ کا شعر ہے۔ نظر نے اس قافیہ میں بے پناہ شعر کہدیا ہے

وہ ایک تھم کہ سراپا بہار و نازش گل
وہ ایک ہیں کہ نہیں صورت آشنائے بہار

بالکل اسی رنگ کا نظر کا شعر انتہا کے قافیہ میں ہے۔

وہ ایک دل جو کھلا اور کھلکے مرجھایا
ہے ابتدائے بہار اور انتہائے بہار

اسی زمین میں نظر نے ایک بہاریہ غزل کہی ہے اس میں ذیل کا شعر تشبیہ و محاکات کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔

چمک رہی ہے یہ ابر سیاہ میں بجلی
چڑھا ہوا ہے کسوٹی پہ یا طلائے بہار

نظرؔ

کاروبار عشق کی کثرت کبھی ایسی نہ تھی
دل نہ تھا تو تنگیٔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

یاس سے ویرانی حسرت کبھی ایسی نہ تھی
دل میں سناٹا نہ تھا وحشت کبھی ایسی نہ تھی

اُن کے وعدے پر ہمیں جینا پڑا ہے حشر تک
ورنہ طولانی شب فرقت کبھی ایسی نہ تھی

جان ہی لینے لگی مایوسی صبح وصال
دل جگر میں درد کی شدت کبھی ایسی نہ تھی

دیکھ ڈالے زندگی میں وصل و فرصت کے طلسم
غم کبھی ایسا نہ تھا راحت کبھی ایسی نہ تھی

آپ نے بیمار پرسی کی تو جینا ہے وبال
ورنہ مرنے کی مجھے حسرت کبھی ایسی نہ تھی

بامزہ ہے کس قدر انکار اُن کا وصل میں
تجھ میں اے خون جگر لذت کبھی ایسی نہ تھی

دل کو کیا سمجھا دیا نومیدی جاوید نے
پردہ دار غم شب فرقت کبھی ایسی نہ تھی

زندگی کی کشمکش سے مر کے کچھ پائی نجات
اس سے پہلے اے نظرؔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

عزیزؔ

دیکھتے تھے آپ اور عبرت کبھی ایسی نہ تھی
اب جو ہے بیمار کی حالت کبھی ایسی نہ تھی

چاندنی ہے آپ ہیں اور پھول دامن میں بھرے
آج ہے جیسی مری تربت کبھی ایسی نہ تھی

دیکھ کر وہ نزع کی تکلیف اُن کا التفات
زندگی بھر میں ہمیں راحت کبھی ایسی نہ تھی

اُٹھ گئے تیمارداروں سے یہ کہہ کر دم شناس
نبض بیمار شب فرقت کبھی ایسی نہ تھی

بخش دے اے ضبط جرم نالۂ بے اختیار
تھی کشمکش اک درد کی شدت کبھی ایسی نہ تھی

کچھ تو ہے بیٹھے ہوئے ہیں واعظان شہر سب
ورنہ میخانے میں تو صحبت کبھی ایسی نہ تھی

سوچتا ہوں اسکو دیکھوں اور لرز جاتا ہوں پھر — میرے دل میں ضعف کی شدت کبھی ایسی نہ تھی
مر گیا بیمار صبح ہجر آ آ کے لب پر بس — تجھ سے امید اے شب فرقت کبھی ایسی نہ تھی
داغ دل ہے اک نشان حسرت مردہ عزیز — دیدہ کے قابل کوئی تربت کبھی ایسی نہ تھی

نظر

سوزاں غم جاوید سے دل بھی ہے جگر بھی — اک آگ کا شعلہ کہ ادھر بھی ہے ادھر بھی
وہ انجمن ناز ہے اور رنگ تغافل — یاں مرحلۂ آہ بھی اندوہ اثر بھی
اپنی شب ہجراں میں نہیں دخل تغیر — باطل ہے یہاں فلسفۂ شام و سحر بھی
سنتا ہوں کہ خرمن سے ہے بجلی کو بہت لاگ — ہاں ایک نگاہ غلط انداز ادھر بھی
وہ شمع نہیں ہیں کہ ہوں اک رات کے مہماں — جلتے ہیں تو بجھتے نہیں ہم وقت سحر بھی
ہوتا نہیں حل مسئلۂ حسرت دیدار — حالانکہ ہے ماہیت اجزائے نظر بھی
جینے کے مزے دیکھ لئے تیری بدولت — اب او دل ناکام تمنا کہیں مر بھی
اللہ ری شب وعدہ پریشانیٔ خاطر — بیتاب سحر تک رہی آنکھوں میں نظر بھی
بس ایک نظر اور کہ اب ختم ہے قصہ — پھر ہو گی نہ تم کو مرے مرنے کی خبر بھی
اب یاس ہے ایسی کہ نہ وہ رنگ نہ تاثیر — پانی دم گریہ ہے نظر خون جگر بھی

عزیز

رہنے دو کہ ہے قابل عبرت مرا گھر بھی — آئے گا کبھی تو کوئی سیاح ادھر بھی
واعظ ہے صراط آپ کی گو بال سے باریک — دیکھا ہے کبھی جادۂ ناسور جگر بھی

کھولا جو نہیں دست حنا بستہ اُنھوں نے — ٹھہرا ہے ابھی اپنی جگہ خون جگر بھی

کچھ دور وہ ہمراہ جنازے کے چلینگے — کیا دیر ہے بیمار محبت کہیں مر بھی

کونین ہے بیتاب تیرے جلوۂ رُخ سے — ہے ایک تماشا جو اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

مرکز کی کشش روح کو دیتی ہے یہ تعلیم — اِس طرح نکل جا کہ نہ ہو تن کو خبر بھی

مانا کہ کسی سے نہ کرونگا میں کوئی بات — چھپتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر بھی

بیٹھا ہے جھکائے ہوئے سر دیر سے کوئی — بیمار شب غم کوئی کروٹ تو اِدھر بھی

ہے یہ بھی خبر جذبۂ تاثیر کے مالک — محتاج ہے تیرا کوئی مایوس اثر بھی

دنیا نہ عزیز آنکھ کو گردش دم آخر — بیٹھے ہیں سرہانے تیرے ارباب نظر بھی

ثاقب لکھنوی

بیتابیٔ دل دیکھکے تڑپا ہے جگر بھی — ہاں اے قدر انداز کوئی تیر اِدھر بھی

تم دیکھ لو چھپکر مجھے ہوگی نہ خبر بھی — وہ زخم ہے دل میں جو اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

میری شب غم کیوں ہے زمانے سے نرالی — دُنیا ہے یہاں شام بھی ہوتی ہے سحر بھی

دل ہو گیا مجروح کماں اب نہ اُٹھاؤ — تھم جاؤ اِسی تیر پہ مرتا ہے جگر بھی

صیاد سے باتیں کروں یا ذکر نشیمن — شق ہو نہ کہیں دل کہ اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

یارب یہ سکت دل کی صداؤں میں کہاں تھی — نالوں میں کچھ آواز ملاتا ہے جگر بھی

اے آتش غم تو نے کسی کو نہیں چھوڑا — اِک داغ لئے آتی ہے دامن میں سحر بھی

چُپ دیکھکے خوشدل نہ سمجھ اہل جہاں کو — ظالم تیرے کردار سے دیتی ہے خبر بھی

لُٹکر بھی وہی بھیڑ ہے پہلو میں غموں کی — دِل کھو کے میں سمجھا کہ کوئی شے ہے جگر بھی

برباد نہ کر عشق میں بربادیٔ غم کو — جی جائے تمنا ترے مرنے سے تو مر بھی

گو رازِ تجلی تھا نہاں پردۂ غش میں — ہم دور سے دیکھا کئے کیا شے ہے خبر بھی

تنہا ہے دعا اب وہ دوانی ہے کہ توبہ — بیٹھا ہے کسی امن کے گوشہ میں اثر بھی

چین اب کسی کروٹ مجھے آتا نہیں اے دل — لے آ گیا ظالم تیری باتوں میں جگر بھی

گلشن کی طرف منہ کئے بیٹھا ہوں قفس میں — شاید کوئی دمساز نکل آئے ادھر بھی

اے جان بتا تجھ کو کروں کس کے حوالہ — تلوار بھی گردن پہ ہے قاتل کی نظر بھی

نظر کا ہر شعر رنگ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے اور دل پر اثر کرنے والا۔ ذیل کا شعر تلخیٔ زیست اور اندوہِ ناکامی کی آخری حد ہے۔

جینے کے مزے دیکھ لئے تیری بدولت — اب اے دلِ ناکام تمنا کہیں مر بھی

یہ شعر بھی بے پناہ ہے۔

تکتا ہوں کہ خرمن سے ہے بجلی کو بہت لاگ — ہاں ایک نگاہ غلط انداز ادھر بھی

نظر

راحت کی جگہ گلشن امکاں نہیں دیکھا — کس گل کو یہاں خار بداماں نہیں دیکھا

بیساختگیٔ جوشِ جنوں داد طلب ہے — چل نکلے ہیں گو ہم نے بیاباں نہیں دیکھا

جس بحر میں ڈوبی دلِ مایوس کی کشتی — اس میں کبھی اٹھتے ہوئے طوفاں نہیں دیکھا

ہر ذرہ میں جب اک نئی دنیا نہیں دیکھی — پھر تو نے کچھ اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

جب رخ سے نقاب اس نے سرِ بزم الٹ دی — پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا

آتی ہیں کدھر سے تیری وحشی پہ بلائیں — کھلتے ہوئے پر بھی درِ زنداں نہیں دیکھا

جب جام ہوا بادۂ جاں بخش سے خالی — ہستی کا کوئی سلسلہ جنباں نہیں دیکھا
ہر سال نظرؔ فصل جنوں آتی ہے لیکن — مدت سے تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

ثاقب

دل کہتا ہے غم کا کوئی ساماں نہیں دیکھا — ہاں سچ ہے ابھی کوچۂ جاناں نہیں دیکھا
محویت نافہم یہ غزہ نہیں زیبا — کس چہرے سے آئینہ کو حیراں نہیں دیکھا
ٹھہروں میں تو کیا قافلہ غم کو لئے ہوں — جس میں یہ سمائے وہ بیاباں نہیں دیکھا
بھولا ہے عبث دیکھکے داماں جراحت — اس دل نے میرا چاک گریباں نہیں دیکھا
پہلے خلش دل کے کہاں پاس تھی ان کے — ہاں خون میں ڈوبا ہوا پیکاں نہیں دیکھا
کیوں رشک مسرت کو نہ ہو مجلس غم پر — اس بزم کو عالم میں پریشاں نہیں دیکھا
ہاتھوں کی خطا ہو کہ مقدر کی جفا ہو — جو چاک نہ ہوتا وہ گریباں نہیں دیکھا
چھٹتے نہ پر امید رہائی تو نہ جاتی — گھٹتے ہوئے لیکن در زنداں نہیں دیکھا
ہم نے تو کبھی مردمک چشم سے پہلے — اشکوں میں جو ڈوبا ہو وہ انساں نہیں دیکھا
جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی — بے سوئے ہوئے خواب پریشاں نہیں دیکھا
ثاقبؔ انھیں کیا یاد کریں ہم کہ جنھوں نے — بھولے سے سوئے گور غریباں نہیں دیکھا

نظرؔ

کوئی مجھ سا مستحق رحم و غمخواری نہیں — سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں
ہر قدم پر باغ عالم میں بچھا ہے دام حسن — کون ایسا ہے جسے ذوق گرفتاری نہیں

دیکھئے گر غور سے دنیا ہے غفلت کا طلسم
یہ بھی خواب عشق ہے فرقت سے بیداری نہیں

جان دیکر بھی جو بات آئے تو ارزاں جانئے
سہل ایسی جنس الفت کی خریداری نہیں

عشق کی ناکامیوں نے اس قدر کھینچا ہے طول
میرے غمخواروں کو اب یارائے غمخواری نہیں

مجھ سے ضبط درد الفت کی شکایت ہے فضول
اے دل ناداں تجھے احساس خودداری نہیں

میری حالت دیکھکر کیوں تم نے ٹھنڈی سانس لی
بیکسوں پر رحم آئین ستمگاری نہیں

ہر طرف سے یہ صدا آتی ہے ملک حسن میں
یہ وہ دنیا ہے جہاں رسم وفاداری نہیں

ہو گیا شاید کہ صرف سوز غم سب خون دل
آنسوؤں کا اب وہ دریا آنکھ سے جاری نہیں

اس کو رحم آئے کہاں یہ ناامیدی میں امید
دل کو خوش کرنا ہے شغل گریہ و زاری نہیں

ہم ہیں چپ بیٹھے ہوئے لیکن ہے دل مصروف عشق
اس عدیم الفرصتی کا نام بیکاری نہیں

نیند آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شے دہر کی
عالم رویا میں فرق خواب و بیداری نہیں

مدتوں ہم بھی رہے محرم فروش سوز دل
ڈھونڈھئے تو راکھ میں اب کوئی چنگاری نہیں

ترک دنیا پر ملی یاران شاطر سے نجات
کنج عزلت میں نظر کچھ خوف عیاری نہیں

ثاقب

کون ان لاکھوں اداؤں میں مجھے پیاری نہیں
نام لوں کس کس کا مجھ کو ایک بماری نہیں

آگ کتنی لیکے نکلا تھا میرا دود جگر
وہ فضا ہے کون جس میں کوئی چنگاری نہیں

یاس سے کیوں دیکھتے ہیں دوست آثار دل
پوچھتے ہیں کیا مجھے تو کوئی بیماری نہیں

ہاتھ رکھکر اک ذرا دیکھو تپ غم کا اثر
یہ تمہارا ہی جلایا دل ہے چنگاری نہیں

دل نے رگ رگ سے چھپا رکھا ہے راز عشق دوست
جس کو کہدے نبض ایسی میری بیماری نہیں

قید ہو کر میں نے کھولی ہمصفیروں کی زباں — کس گلستاں میں میرا ذکرِ گرفتاری نہیں

نظر

سن لو کہ رنگ محفل کچھ معتبر نہیں ہے — ہے اک زبان گویا شمع سحر نہیں ہے
مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے — وہ اک سکون خاطر جو بیشتر نہیں ہے
ہو لاکھ چارہ سازی لیکن اثر نہیں ہے — ہاں درخور مداوا زخم جگر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی — زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے
آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑنا ہے باقی — اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
پردہ اٹھا دے اکدن لوائے حجاب ہستی — پاتا ہوں اس کو دل میں دیکھا مگر نہیں ہے
مرنے پہ جسم خاکی کیا ساتھ روح کا دے — راہ عدم میں غافل گرد سفر نہیں ہے
کیا گو مگو ہیں اے دل اسرار بیخودی بھی — سب کی خبر ہے مجھ کو اپنی خبر نہیں ہے
دنیا سے جا رہے ہو کیا لیکے اے نظر تم — زاد سفر نہیں ہے رخت سفر نہیں ہے

ثاقب

پیری میں بھی شب غم تجھ سے مفر نہیں ہے — اک عمر کٹ چکی ہے اور پھر سحر نہیں ہے
گلشن کا رنگ دو دن اک حال پر نہیں ہے — کل جنکے آشیاں تھے آج ان کا پر نہیں ہے
فرقت کا بزم الفت پر کچھ اثر نہیں ہے — او جانے والے دل ہے یہ رہگزر نہیں ہے
اس چشم معرفت سے وہ کس طرح چھپینگے — کوئی حجاب جس کی حد نظر نہیں ہے
برباد ہو نہ یارب وہ منزل محبت — جس کے سوا غموں کا دنیا میں گھر نہیں ہے

نیند اڑ گئی جو اُن کی میں کیا بچھ کے خوش ہوں — میری فغاں تو وہ ہے جس میں اثر نہیں ہے
مدت سے شکل عشرت ڈوبی ہوئی ہے غم میں — یہ دیدۂ جہاں میں کس وقت تر نہیں ہے
آفت کی منزلوں میں دل کا خدا نگہباں — گم ہے نشان جادہ اور راہبر نہیں ہے
نازک مزاجیوں کی حد اور کیا بتاؤں — میں کیا کسی سے اُن کی سیدھی نظر نہیں ہے
میں تو اُجڑ گیا ہوں جلنے سے آشیاں کے — گلچیں ترے لئے بھی اچھا ثمر نہیں ہے
خاموش تھا تو ثاقب دی چپ کی داد سب نے — نالہ کیا تو وہ بھی کچھ با اثر نہیں ہے

نظرؔ نے علاوہ غزل کے دیگر اصناف سخن میں بھی لکھا ہے۔ جدید رنگ کی بھی نظمیں ہیں یہ سب سرمایہ آپ کی قادر الکلامی پر دال ہے لیکن خصوصیت آپ کو غزل ہی میں حاصل ہے۔ نظرؔ کا کوئی مجموعہ موجود نہیں۔ العصر، خدنگ نظر، ادیب اور زمانہ وغیرہ کے پرانے پرچوں میں اِن کی منظومات کی زیارت ہو جاتی ہے مدتیں ہوئیں منشی دیا نراین نگم آنجہانی نے غزلیات نظرؔ کے دو قلمی نسخے ہندوستانی اکیڈمی کی طرف سے فراہم کئے تھے لیکن اُن کی اشاعت کی آج تک تو نوبت آئی نہیں آئندہ کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ میں نے جو کلام پیش کیا ہے وہ بیشتر حسرت موہانی کے ایک جزو کے انتخاب سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ متفرق غزلیں میری بیاض میں نکل آئیں کچھ اشعار میں نے پیش کر دئے پھر بھی سیری نہیں ہوئی اگر کل مجموعہ غزلیات سامنے ہوتا تو اور بہت سے جواہرات پیش کرتا لیکن افسوس اب کہاں سے لاؤں۔ بہرحال ایک غزل اور سناتا ہوں۔

غزل

وہ سمجھے ہیں ہماری آہ سوزاں بے اثر ہوگی — یہ بجلی کوند جائیگی تو دنیا کو خبر ہوگی

سوادِ شامِ غم سے روح گھبراتی ہے قالب میں
نہیں معلوم کیا ہوگا جو اس شب کی سحر ہوگی

ابھی مرنا بہت دشوار ہے غم کی کشاکش سے
ادا ہو جائیگا یہ فرض بھی فرصت اگر ہوگی

معاف اے ہمنشیں گر آہ کوئی لب پہ آجائے
طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ دردِ جگر ہوگی

نہیں طولِ الم سے اختصارِ زندگی ممکن
یہ مشکل سہل ہوگی موت ہی جب چارہ گر ہوگی

قفس سے چھوٹکر پہونچے نہ ہم دیوارِ گلشن تک
رسائی کس طرح تا آشیاں بے بال و پر ہوگی

بیاں جب کرکے روئیگا ہمارے سوزِ پنہاں کا
یقیں ہے آگ کا شعلہ زبانِ نوحہ گر ہوگی

برنگِ شمع ہیں ہم بھی مسافر بزمِ ہستی میں
جو ہوگی شام دنیا میں تو عقبیٰ میں سحر ہوگی

فقط اک سانس باقی ہے مریضِ ہجر کے تن میں
یہ کانٹا بھی نکل جائے تو راحت سے بسر ہوگی

خموشی کیا بری تھی کیوں زباں تک رازِ دل آیا
یہ کیا معلوم تھا فریاد اپنی بے اثر ہوگی

نظرؔ اپنی تسلی کے لئے کافی ہے یہ مصرع
کہاں تک دہر میں بے قدریٔ جنسِ ہنر ہوگی

اوجؔ بریلوی

اوجؔ تخلص گنگا پرشاد نام، کایستھ سکسینہ بریلی کے رہنے والے تھے اور وہیں کلکٹری میں صدر ناظر تھے۔ فارسی کا علم بزرگوں سے میراث میں ملا تھا اردو کے بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ آتشؔ لکھنوی سے تلمذ تھا تمام عمر علمی شوق و شغف میں بسر کی طب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ولادت کی تاریخ نہیں معلوم ہو سکی ۱۸۹۲ء میں انتقال فرمایا سنہ ۱۹۱۶ء میں آپ کا ایک دیوان آپ ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا میری نظر سے گذرا تھا اور ایک نسخہ طب کا موسوم بہ "مجربات اوجؔ"۔

یہ بھی قلمی تھا۔ دیوان ضخیم نہیں تھا۔ دو تین سو غزلیں ہوئیں۔ میں نے انھیں ابھی سرسری دیکھنا ہی شروع کیا تھا کہ دیوان کے مالک منشی ہنومان دیال، حضرت اوج کے پوتے نے لگاتار واپسی کے تقاضے کر دئے۔ بادل ناخواستہ واپس کر دینا پڑا۔ بہت چاہتا تھا کہ کچھ انتخاب لے لوں لیکن مجبوری تھی۔ کئی سال بعد اپنی ایک تصنیف کے سلسلہ میں جب مجھے ہندوؤں کے ادبی کارناموں کی جستجو درپیش ہوئی تو دیوان اوج کا بھی خیال آیا۔ منشی ہنومان دیال سے دیوان مانگا جواب ملا کہ گم ہو گیا صدمہ ہوا لیکن چارہ ہی کیا تھا۔ اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد ۱۹۲۴ء میں جب میں نے ان کے کاغذات کی دیکھ بھال کی تو ان میں ایک غزل حضرت اوج کی بھی مل گئی یہ محض حسن اتفاق تھا بلکہ تائید غیبی کہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن نظر پڑ گئی جس سے اس کی عظمت و جلال کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ورنہ سورج تو ڈوب ہی چکا تھا۔ غزل میں چھبیس شعر ہیں۔

غزل

لڑتا ہوں میں جو بحث میں مردان سخن سے
تو مصرع شمشیر نکلتا ہے دہن سے

سرخی میں نہیں کم ہے وہ لب لعل یمن سے
دانتوں میں زیادہ ہے صفا در عدن سے

پہلے تو ڈرایا مجھے مژگاں کے تمن سے
پھر اس نے بزن بول دیا اپنے دہن سے

وحشت ہے طبیعت کو غزالان ختن سے
دیوانہ ترا بن میں بھڑکتا ہے ہرن سے

پیشانی پہ ہر وقت شکن رہتی ہے جس کی
وعدہ ہے ملاقات کا اس عہد شکن سے

کیا زلف کے کوچے میں ہوا چلتی ہے الٹی
جمعیت خاطر ہے وہاں پیچ و شکن سے

دے جلد مجھے روح فزا دودھ کے ساقی
جان آئی لبوں پر ہے اسی شوق میں تن سے

ہیں شام سے غربت کی سیہ تر تیرے گیسو
رخسار سے منور ہیں کہیں صبح وطن سے

کیا قہر و قیامت کی یہ رفتار نکالی
باہر ہوے جاتے ہیں قدم ان کے چلن سے

تیغ نگہ مست سے میں قتل ہوا ہوں
خمیازہ ہے پیدا مرے زخموں کے دہن سے

اک عمر سے اس زلف کے حلقہ میں پھنسا ہے
تشبیہ مرے دل کی ہوئی سانپ کے پھن سے

جائیگی نہیں بعد فنا وحشت خاطر
مر جائینگے تو تار نکالے گی کفن سے

اب وعدہ خلافی کا گلہ ہے عبث اے دل
کیوں شرط محبت کی بدی عہد شکن سے

مغلوب ہزاروں کو کیا ہم نے اکیلے
جب بحث پڑی بالی کی مرغان چمن سے

شیروں کی ڈکاریں نہ سمجھ دشت میں تیلے
یہ قیس کے نالے کی صدا آتی ہے بن سے

مستانہ کوئی شعر سناؤں تجھے ساقی
تازہ ہو دماغ اپنا جو صہبائے کہن سے

غربت میں گئی گھل کے، بدل شکل ہماری
پہچانے نہیں جاتے ہیں یاران وطن سے

پر بھی نہ پرندے کا ملا فصل خزاں میں
ملتا ہوا صیاد گیا ہات چمن سے

کیا سیر نظر آتی ہے پھولے ہیں جو ٹیسو
اپنی تو جنوں طبع اچٹتی نہیں بن سے

کیوں تازہ مضامین نہ ہوں ہر مصرع تر میں
مانوس طبیعت ہے میری گرم سخن سے

جب چاند سے چہرے پہ چھڑکتے ہیں وہ افشاں
تو ذرے کتر لیتے ہیں سورج کی کرن سے

وابستہ ہیں عشاق کے دل سیکڑوں اس میں
گیسو کی ترے ٹھیک ہے تشبیہ رسن سے

اے دل تو اگر سیر کرے سبزہ خط کی
کیا غم ہے اگر بچ کے ذرا چاہ ذقن سے

موچ آئیگی تلوار نہ لے ہاتھ میں اے گل
نازک یہ کلائی ہے تری شاخ سمن سے

اس زور سے کب گنج سے چلتی ہے ہوائی
آہوں کے شرر منہ سے نکل جاتے ہیں ان سے

نل عشق کے چوسر میں ہوا اوج سے مغلوب وہ حسن کی شطرنج میں جیتے ہیں دمن سے

ان اشعار میں سب سے پہلے دیکھنے کی چیز وطنی رنگ و بو ہے جس کی طرف مدت کے بعد اب شعرا کو توجہ ہوئی ہے۔ شاعر ایرانی رنگ و روغن کے ساتھ ساتھ جو اُردو کا خمیر ہے اپنے وطن کی چیزوں کو بھی نہیں بھولا ہے نل اور دمن کو بھی قیس اور لیلٰے کے پہلو میں اُس نے جگہ دی ہے لعل یمن اور در عدن کے ساتھ ساتھ ٹیسو کے پھول بھی چُنے گئے ہیں۔

مضامین تو وہی ہیں جو آتش و ناسخ کے زمانے میں عام تھے لیکن طرز ادا کی لطافت اور ترکیبوں کی شگفتگی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہی خوبیاں فن شاعری کی جان ہیں۔ لفظوں کے خاکوں میں حسن ادا کی ایسی روح پھونکی گئی ہے کہ سالم تصویر پیدا ہو گیا ہے۔ جس قدر محاکاتی حسن حضرت افق کے یہاں ایک غزل میں نمایاں ہے دوسروں کے یہاں ڈھونڈھنے سے کم نظر آئے گا۔ ذیل کے مصرعے تو نزاکت لطافت اور رنگینی کے حسین و جمیل مرقعے ہیں۔

ع۔ دانتوں میں زیادہ ہے صفا در عدن سے
ع۔ رخسارے منور ہیں کہیں صبح وطن سے
ع۔ تو نے ہے کتر لیتے ہیں سورج کی کرن سے

سورج کی کرن سے ذرے کتر لینا کتنی نادر اور لطیف بات ہے معلوم ہوتا ہے موتیوں کے بجائے شعر میں تارے جڑ دیئے ہیں پڑھئے اور دل و دماغ کو مستنیر کیجئے۔ ذیل کا شعر بھی قابل غور ہے۔

ناز‌ک یہ کلائی ہے تیری شاخ سمن سے
موج آ ہی گئی تلوار نہ لے ہاتھ میں اے گل

پہلے مصرع کی ترکیب کچھ ایسی ہوچیدار ہے کہ پڑھتے ہی موج آنے کی جھلک خیال میں آجاتی ہے دوسرے مصرعے میں "شاخ سمن" کی ترکیب میں جو لچک ہے وہ نازک کلائی کا نقشہ اور موج آنے کی حرکت کی تصویر دونوں بیک وقت نظر کے سامنے پیش کردیتی ہے شعر کی لطافت اس سے زیادہ تحلیل کی متحمل نہیں بس پڑھئے اور لطف لیجئے۔

ملتا ہوا صیاد گیا ہاتھ چمن سے
پر بھی نہ پرندے کا ملا فصل خزاں میں

شعر کیا ہے نشتر ہے۔ چمن کی بربادی اور صیاد کی حسرت ستم رانی کی تصویر سلیس اور پردرد انداز میں کھینچ دی گئی ہے شاعر کا اعجاز ہے سہل ممتنع اس کو کہتے ہیں۔ پھر لفظ لفظ سے جو حسرت ٹپکتی ہے بیان سے باہر ہے غور کیجئے اور سر دھنئے۔ خدا جانے ایسے ایسے کتنے جواہر پارے کلام اوج میں ہونگے، مگر افسوس ہزار افسوس ہم ان سے محروم ہوگئے۔

دل بریلوی

ولادت ۱۸۵۱ء
وفات ۱۹۲۳ء

زمانہ ہوا ایک شریف سکسینہ کالستھ خاندان کی ایک نیک ذات خاتون مع اپنے بچوں کے قنوج سے آکر بریلی میں آباد ہوئیں۔ بچے بڑھے، پڑھے، پھلے پھولے عزت و ثروت والے ہوئے۔

اِس خاندان کے چشم و چراغ رائے بہادر منشی درگا پرشاد۔ بڑے ذکی اور ذہین سنسکرت، عربی فارسی، انگریزی چاروں زبانوں میں منتہی۔ اِسی علمیت و قابلیت کی بدولت انسپکٹر مدارس جیسے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے۔ ہندوستانیوں میں سب سے پہلے یہ عہدہ آپ ہی کو تفویض ہوا۔ لکھنؤ آپ کا صدر مقام تھا۔ چھاؤلال کے پُل پر اپنی نجی کوٹھی میں رہتے تھے پنشن لیکر اپنے وطن مالوف بریلی میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ سرکار اور نیز پبلک نے آپ کی گرانبہا خدمات کی بڑی قدر کی اور بہت سے اعزاز دونوں کی جانب سے آپ کو عطا ہوئے بریلی کو آپ کی ذات بابرکات پر بجا طور پر ناز تھا۔ ۱۸۹۷ء میں وفات پائی۔

آپ کے بڑے بیٹے حضرت دِل تھے۔ کنہیالال نام ۱۸۵۰ء میں بریلی میں پیدا ہوئے یہیں بڑھے۔ سانولا رنگ، میانہ قد بلند کشادہ پیشانی، گول چہرہ، فراخ سینہ بھرے ہوئے مونڈھے اُبھرے ہوئے بازو، گٹھا ہوا گرتی جسم اس پر لکھنؤ کی وضع کی دوپلی ٹوپی، چھ کلیا انگرکھا، چوڑ میدار پائجامہ عجب زیب دیتے تھے۔ حضرت دِل بلا کے ذہین اور طباع تھے طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فارسی کے درسیات گھر پر پڑھے، انگریزی میں کیننگ کالج لکھنؤ سے انٹرنس کی سند حاصل کی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ذہانت و ذکاوت کے جوہر بچپنے ہی سے چمکنے لگے۔ اِسکول میں داخل ہوتے ہی اپنے ہم جماعتوں میں ممتاز ہو گئے۔ انگریزی اور فارسی درسیات میں مشکل مقامات کے مطالب استاد آپ سے بیان کراتے تھے اور دیگر طلبا کو وہی لکھاتے تھے۔ سلسلۂ تعلیم انٹرنس کے آگے نہ چل سکا

ریاضی اُس وقت لازمی مضمون تھا اور ریاضی سے آپ کی طبیعت کو وحشت ہوتی تھی آپ کو ادبیات سے دلچسپی تھی۔ کہنے کو تو انٹرنس پاس کیا تھا لیکن علم و ادب میں وہ کمال حاصل کیا کہ باید و شاید۔ انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں کے جید عالم تھے تمام عمر دونوں زبانوں کے ادبیات کے مطالعہ میں گزری۔ انگریزی میں انگریز زباندان آپ کی تحریر اور اسلوب تقریر پر عش عش کرتے تھے۔ فارسی میں اچھے اچھے مولویوں نے آپ سے درسیات پڑھے۔ طب کا بھی شوق تھا یہ فن لکھنؤ کے طبیب حاذق سید محمد خاں سے سیکھا تھا اور کامل دستگاہ پیدا کی تھی۔ پرور دگار نے ہات میں شفا بھی دی تھی اپنے کنبہ والوں اور عزیز احباب کا علاج کرتے تھے کبھی اس فن کو ذریعہ معاش نہیں بنایا آپ کا عقیدہ تھا کہ طبابت کار خیر میں سے ہے اسے معیشت کا وسیلہ بنانا گناہ ہے ایک وقت وہ بھی آیا جب اس عقیدہ کی آزمائش ہوئی۔ مرنے سے سترہ اٹھارہ سال پیشتر آپ کا زمانہ بگڑا اور ایسا بگڑا کہ پھر نہ سنبھلا ذرائع معاش سب بند ہو گئے۔ مشکلوں پر مشکلوں کا سامنا ہوا بلاؤں پر بلائیں نازل ہوئیں زندگی تلخ ہو گئی لیکن آپ کے عقاید و اعتقادات میں تزلزل پیدا نہیں ہوا عزیز و احباب نے ہر چند سمجھایا اور کوشش کی کہ اس گاڑھے وقت میں طبابت کا سہارا لیا جائے لیکن مزاج کی پختگی اور ثبات کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی۔ سختیوں پر سختیاں سہیں لیکن جو نہ کرنا تھا نہ کیا۔

آپ کے خصایل و فضایل کے متعلق میں کیا لکھوں خاک کا ذرہ جلوہ خورشید کے متعلق کیا زبان کھول سکتا ہے مگر مقتضائے مقام کے اختیار سے کچھ لکھنا بھی ہے۔ جو کچھ ممکن ہوسکے گا لکھونگا۔ ہاں یہ عرض کردوں کہ اِس میں جذبہ فرزندی کو بالکل دخل نہ ہوگا۔ محض اظہار حقیقت مقصود ہے۔ تواضع، انکسار، راست کرداری پاکبازی نیک نفسی جود و سخا آپ کی طبیعت کے خمیر تھے۔ خودداری گھٹی میں پڑی تھی بس پر مستزاد توکل استغنا، رضا و تسلیم اور شان درویشی تھی۔ تصوف آپ کا مسلک تھا زبانی تصوف نہیں آپ کا ہر فعل و عمل اس کا شاہد تھا زبان پر ہر وقت یہ شعر رہتا تھا۔

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن　　که در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ہر لحظہ، ہر ساعت "دل بیار و دست بکار" پر عمل تھا حق یہ ہے کہ آپ نے عارف باللہ کا مرتبہ پایا تھا اور متعدد واقعات آپ سے ایسے ظہور میں آئے جنھیں صحیح معنوں میں کشف و کرامات کہہ سکتے ہیں۔

ملکوتی صفات کے ساتھ ساتھ قدرت نے آپ کو ایسے جوہر بھی عطا کئے تھے جو تہذیب و تمدن کا زیور سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا شعر و ادب کا ذوق تھا۔ جس پر آگے کچھ روشنی ڈالی جائیگی یہاں ایک ایسے وصف کا ذکر کیا جاتا ہے جو معاشرت کو بڑا پر لطف بنا دیتا ہے وہ وصف بذلہ سنجی ہے۔ یہ بھی ملکہ شاعری کی طرح خداداد چیز ہے آپ کے مزاج میں ظرافت تو تھی ہی جیسا لکھا جاچکا ہے مگر اِن ظرافت

کے بیلو بڑے شگفتہ اور متین تھے۔ بات بات میں آپ گل کھلاتے تھے۔
بہت سے لطیفے آپ کے یادگار ہیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے آپ کسی اسکول میں
سیکنڈ ماسٹر تھے۔ وہاں کے ہیڈ ماسٹر نے چند روز کی رخصت لی اور
آپ اُن کی جگہ کام کرنے لگے جب وہ واپس آئے اور اپنے کلاس میں
درس دینے کے لئے گئے آپ بھی وہاں جا نکلے۔ ادھر اُدھر کی باتوں
کے بعد اُنھوں نے فرمایا مسٹر کنھیالال کوئی تازہ شعر نہیں سناتے۔ آپ نے
وہیں بیساختہ فرمایا۔

یہ کل کی بات ہے اے دلِ جہاں پُر شور بلبل تھا — خدا کی شان ہے اُس جا صدائے بوم آتی ہے

انٹرنس پاس کرنے کے بعد آپ بھی سررشتہ تعلیم میں منسلک ہوئے۔ اسکول ماسٹری سے
ابتدا کی۔ ذاتی قابلیت اور حسن کارگذاری کی بدولت بہت جلد ڈپٹی انسپکٹر
مدارس کے عہدے پر فائز ہو گئے جب رائے بہادر مرحوم مغفور پنشن لے کر
بریلی میں قیام فرما ہوئے تو آپ نے اُن کی حفاظت اور خدمت کی خاطر
ملازمت سے استعفیٰ دیدیا ثروت و امارت نے گھر ہی میں رائے بہادر
جنت آشیانی کے دشمن پیدا کر دے تھے۔ آپ ان کی زندگی خطرہ میں تھی
ادھر تمام عمر سرکاری ملازمت میں دل و دماغ مصروف رکھنے سے
صحت بالکل خراب و خستہ ہو چکی تھی۔ پیرانہ سالی ضعف اور تردداتِ
کی حالت میں اطمینان اور راحت کی اُنھیں ضرورت تھی احساس فرائض
فرزندی نے آپ کو مجبور کیا کہ ایسے نازک وقت اور اندیشہ ناک حالت
میں اپنے ضعیف و رنجور باپ کی خدمت کریں اور اُن کی بیش قیمت

جان کی حفاظت کریں۔ اولاد کی بخنگی نے فوراً ملازمت سے سبکدوش
کر دیا ملازمت بھی وہ ملازمت جو آسودہ حالی کا ذریعہ اور عزت و وقار
کا وسیلہ تھی۔ ممکن ہے آجکل کے حضرات اسے ناعاقبت اندیشی پر محمول کریں
لیکن اگلے زمانے کے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ اولاد پر والدین کے کیا
حقوق ہیں اور ان حقوق کو جان و مال کے ساتھ ادا بھی کرتے تھے۔
۱۸۹۷ء میں رائے بہادر آنجہانی کا انتقال ہوا آپ کے تین بیٹے
تھے۔ وصیت کی رو سے آپ کی سب جائداد اور مال و متاع کے مالک
حضرت دل ہوئے اس کے وجوہات تھے جن کی صراحت کی یہاں ضرورت
نہیں دوسرے بھائیوں نے در عدالت کھٹکھٹایا۔ دیوانی بریلی سے آپ
کے خلاف فیصلہ صادر ہوا۔ الہ آباد ہائی کورٹ سے آپ کے موافق اور
پریوی کونسل سے پھر آپ کے خلاف۔ بیس بائیس سال تک یہ ناخوشگوار
قضیہ چلتا رہا۔ بلکہ ایک بلائے بے درماں بنکر خاندان پر نازل رہا
جس نے لاکھوں کی جائداد خاک میں ملادی بڑے بڑے گانوں گرانوں
کوڑیوں کے مول بکے، ہزاروں کا مال و متاع برباد ہو گیا۔ بنگلے،
مکانات اور دیوان خانہ سب نکل گئے۔ رہنے کو گھر تک نہ رہا۔
جب مصیبت آتی ہے لگاتار آتی ہے۔ آپ کا بھی جب وقت بگڑا
تو بگڑتا ہی چلا گیا آخر یہ نوبت پہونچی کہ بیان نہیں ہوسکتی اذیتوں
اور مصیبتوں کی انتہا ہوگئی۔ جان پر بنی آبرو پر بنی جینا دشوار ہوگیا
لیکن اس مرد میدان رضا و تسلیم نے اُف نہیں کی ہر مصیبت کو صبرو

شکر کے ساتھ سر پر لیا اور ہر تکلیف کو مسکراتے ہوئے برداشت کیا۔ پوست واستخوان کا جسم ان جانکاہیوں کی تاب کیا لاتا۔ صحت بگڑنے لگی۔ قوےٰ مضمحل ہوگئے۔ تاب وتواں جواب دے چلی، فالج کا دورہ ہوا بمشکل تمام پہلی بار تو صحت ہوگئی نو سال بعد دو دورے ایک ہی ماہ کے اندر ہوگئے۔ فالج سا مہلک مرض جسم میں قوت نہیں اس پر علاج ومعالجہ سے اجتناب دوڑ دھوپ دوا دعا کچھ کام نہ آئی قدرت کا منشا پورا ہوکر رہا روح نے قالب خاکی سے منہ موڑ لیا۔

شاعری سے آپ کو طبعی مناسبت تھی اُس پر لکھنؤ کی بود وباش اور کاملین فن کی صحبتیں سونے میں سہاگا ہوگئیں۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ مولانا غلام حسین قدرؔ بلگرامی شاگرد غالبؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ قدرؔ کو اپنے ذہین نوجوان شاگرد سے بہت اُنس تھا اور اپنے ہونہار شاعر کی بہت ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ ادھر خلقی ذکاوت وجودت اُدھر باکمال اُستاد کی ہمت افزائیاں سمند ناز تھا اور تازیانہ طبیعت بجلی کی طرح چمکنے لگی۔ جواہر افکار روز افزوں آب وتاب کے ساتھ ڈھل رہے تھے دفعتہً ایسا دھکا لگا کہ ساری جولانیاں خاک میں مل گئیں امنگیں مٹ گئیں۔ دل ٹوٹ گیا یعنی مکان میں چوری ہوئی مال واسباب کے ساتھ آپ کی بیاض بھی چوری گئی۔ کئی سال کی مشق دماغ سوزی سے جو مجموعہ افکار تیار کیا گیا تھا یوں لوٹا گیا۔ اب چوروں کو اس سے کچھ حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو وہ نذر آتش کر دئے

گئے ہوں یا کسی پنساری کے حوالے۔ بہر حال یہ جواہر پارے لٹنا تھے لٹ گئے یہ صدمہ آپ کو ایسا شاق گزرا کہ پھر شعر کہنے کی قسم کھالی اور تادم مرگ اردو میں شعر نہیں کہا۔ آخر عمر میں کچھ فارسی میں ارشاد فرمایا تھا وہ بھی ضائع ہو گیا۔ تقریباً پچاس باون سال کی عمر سے ایک کتاب تصوف میں لکھنا شروع کی اور کئی سال کی دماغ سوزی سے اسے ختم کیا پھر کئی سال اِس کے جلا دینے میں صرف ہوئے۔ شریعت وطریقت، عشق، دِل، صحبت اولیا وغیرہ وغیرہ اُس کے موضوعات تھے صدہا صوفیائے کرام کے اقوال و اشعار کے حوالے دئے گئے تھے یہ صحیفہ آپ کو جان سے زیادہ عزیز تھا مگر یہ بھی کیا کہا جائے کس طرح گم ہو گیا۔ غرض اِس بلند پایہ ہستی کے بیش بہا افکار سے کچھ بھی باقی نہ رہا۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ جب آپ کی غزلوں کی بیاض چوری گئی آپ نے شعر کہنے کی قسم کھالی۔ یہی نہیں کہ شعر کہنا ترک کر دیا بلکہ جو کچھ یاد تھا اُسے بھی بھلا دیا۔ اگر کوئی آپ سے شعر سنانے کی درخواست کرتا تو آپ کو تکلیف ہوتی اور بڑے پُرلطف حیلوں سے ٹال جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنا سب ہی کلام آپ نے حافظہ سے محو کر دیا۔ دس پانچ اشعار پھر بھی داغ دل کی طرح نقش رہ گئے تھے وہی کبھی کسی نے بہت اصرار کیا تو سُنا دیتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

خونِ گردن جوش پر ہے تیغ قاتل چاہئے ۔۔۔ کشتیٔ عمر رواں ٹھہرے وہ ساحل چاہئے

کس کو خورشید اور کس کو ماہ کامل چاہیئے — تیری صورت ہر دم آنکھوں کے مقابل چاہیئے
شعر کہنے کے لئے عالم نہ فاضل چاہیئے — کشتۂ عشق صنم ہو بس وہی دل چاہیئے
پہلے کر عشق مجازی تا حقیقت ہو عیاں — راہ مشکل ہے سفر منزل بمنزل چاہیئے
عشق کیا کوئی کریگا دل تمہارے سامنے — سوزِ غم سے دل جلانے کے لئے دل چاہیئے

ان پانچ اشعار میں شاعری کے کون سے جوہر نہیں۔ جذبات کی پاکیزگی خیالات کی بلندی، جوش، روانی، موسیقیت سب ہی کچھ موجود ہے اور سب پر طرہ وہ سوز و گداز ہے جو شاعری کی جان ہے اور جس کی تدبیر بھی شاعر نے خود بتا دی ہے۔

شعر کہنے کے لئے عالم نہ فاضل چاہیئے — کشتۂ عشق صنم ہو بس وہی دل چاہیئے

ان دو مصرعوں میں شاعری کے متعلق جو قول فیصل دیدیا گیا ہے محققین فن نے مختلف پہلوؤں سے اس پر دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں۔ چوتھے شعر کی صداقت و معنویت کے متعلق کچھ لکھنا حقیقت و مجاز جیسے نازک مسئلہ کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرنا ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ یہی لکھدینا کافی ہے کہ حضرت قدر نے اس شعر پر چار صاد کئے تھے اور تحریر فرمایا تھا "واہ رے کنھیا جوان کیا خوب کہا ہے"۔ واقعی یہ شعر داد سے مستغنی ہے۔

الٰہی آمرِ ناز طالع نامہرباں کب تک — خدایا جوشِ وحشت یہ زمیں یہ آسماں کب تک
عمر بھر کس شوق سے تیرا کئے دریائے عشق — وائے قسمت جب کنارے آئے ساحل ہٹ گیا
ناامیدی یہی کہتی ہے جدھر جاتا ہوں — آرزو کیوں لئے آتا ہے ادھر کچھ بھی نہیں
الٰہی ہم تو خیر ساقی کوثر مناتے ہیں — کہ جسکے فیض سے ہر دم نیا عالم بناتے ہیں

چندر بھان برہمن[1]

ولادت ۱۵۷۴ء	وفات ۱۶۶۶ء

چندر بھان نام برہمن تخلص تھا۔ اِن کی پیدائش کس جگہ ہوئی تذکرہ نویسوں میں بہت اختلاف ہے کوئی آگرہ کوئی لاہور اور کوئی کشمیر اُن کا مولد بتاتا ہے والد کا نام دھرم داس تھا جو اکبر کے زمانے میں غالباً کشمیر سے آگرہ آئے اور شاہی ملازمت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے منصب دار ہو گئے برہمن اس ترکہ سے کب محروم رہ سکتے تھے چنانچہ دونوں زبانوں میں ماہر ہوے۔ ابتداءً افضل خاں شیرازی وزیر شاہجہاں کے متوسلین میں شامل ہوے رفتہ رفتہ اس کے یہاں دیوان مقرر ہو گئے۔ افضل خاں کے فوت ہو جانے پر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کے متعلقین و متوسلین حضور میں پیش ہوں۔ جب برہمن کی باری آئی تو انھوں نے ایک رباعی بھی خوشخط لکھکر بادشاہ کے حضور میں پیش کی۔ رباعی۔

شاہے کہ مطیع او عالم گردد	ہر جا کہ سریست ازو خم گردد
ازبسکہ بدورش ازلی یافت شرف	خواہد کہ شرف نیر اعظم گردد[2]

بادشاہ بہت خوش ہوے۔ برہمن کو اپنے یہاں اہل قلم میں منسلک

---

[1] یہ مضمون بیشتر سید رفیق احمد مارہروی کے اُس مضمون سے ماخوذ ہے جو رسالہ زمانہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔ اور جس کی تحقیق کے سلسلہ میں متعدد تذکروں کے حوالے دیئے گئے ہیں [2]۔ یہ رباعی زمانہ میں اسی طرح تحریر ہے۔ جگر بریلوی

کرلیا۔ کچھ دنوں بعد برہمن داراشکوہ کے اتالیق مقرر ہو گئے جب سعداللہ خاں وزیر شاہی کا انتقال ہوا۔ شاہجہاں نے برہمن کو رائے کا خطاب دیا اور دفتر شاہی کا میر منشی مقرر کر دیا۔ داراشکوہ کے قتل کا برہمن کو بڑا صدمہ ہوا اور کیوں نہ ہوتا اُدھر اُس کے خصائل حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ ادھر اُستادی شاگردی کا رشتہ اِس پر وہ خونیں مناظر اور قیامت خیز ہنگامے جو تاج و تخت کے لئے اورنگزیب اور اُس کے بھائیوں میں رُونما ہوئے اور برہمن کی نظروں سے گزرے اُن کا دل دُنیا ہی سے اُچاٹ ہو گیا شاہی خدمات کو خیرباد کہا اور بنارس جاکر باقی تمام عمر ریاضت و عبادت میں گزار دی۔ ۱۶۶۶ء میں انتقال کیا۔

برہمن فارسی کے جید عالم تھے اُن کا شمار مشاہیر اساتذہ میں تھا ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے روایت ہے کہ ایک مرتبہ داراشکوہ نے شاہجہاں سے کہا کہ برہمن نے ایک عجیب شعر کہا ہے۔ بادشاہ نے کہا ہم بھی سُنیں۔ برہمن بلائے گئے اور اُنھوں نے وہ شعر پڑھا۔

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار   بہ کعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

بادشاہ کے چہرے پر شکن پڑ گئی۔ سعداللہ وزیر تاڑ گیا اور فوراً عرض کیا۔

خر عیسےٰ اگر بمکہ برند   چوں بیاید ہنوز خر باشد

بادشاہ مُسکرا دیئے۔

ایک اور روایت ہے کہ عالمگیر نے کسی مندر کو مسمار کرا کے مسجد بنوائی۔

برہمن نے اِس پر بادشاہ کو فوراً یہ شعر سُنایا۔

کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

بعض لوگ اِن روایتوں کو طرح طرح سے غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں صرف اِس خیال سے کہ سلاطین مغلیہ کی سطوت و جبروت کب ایسی بیباکیوں کی متحمل ہو سکتی تھی خصوصاً عالمگیر کا حسِّ مذہبی۔ لیکن یہ بات نہیں۔ اکبر اور بیربل کی روایتوں سے تو یہ کہیں زیادہ مہذب روائتیں ہیں۔ ہم اُس کو شاعرانہ لطیفوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے اِسی کے ساتھ مغل فرمانرواؤں کی علم دوستی اور ادب نوازی کی روایتوں پر بھروسا کرکے اُن کو ان معاملات میں کسی تنگ نظری کے لئے موردِ الزام نہیں بنا سکتے۔ ہم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ایسی شاعرانہ شوخیوں پر برافروختہ ہو کر وہ کوئی اخلاقی جرم کر بیٹھتے۔

اگرچہ برہمن فارسی کے شاعر تھے لیکن اُنھوں نے اُردو میں بھی بہت کہا۔ مسٹر محمد سلیم صدیقی متعلقہ لکھنؤ یونیورسٹی نے الہ آباد یونیورسٹی کے اُردو ایسوسی ایشن میگزین بابت سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء میں ایک مضمون غیر مسلموں کی اُردو خدمات کے متعلق لکھا ہے اُس میں صفحہ ۷ پر پنڈت چندربھان کی اُردو گوئی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"آپ کا دیوان جو نوادرِ روزگار سے ہے اِس میں فارسی کے غیر مانوس الفاظ بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ غزلیں بیشتر ہیں۔ اُردو شاعری کا باوا آدم ولی دکنی کو مانا جاتا ہے ولی سنہ ۱۶۷۲ء میں

پیدا ہوئے اور برہمن ان سے چھ سال قبل مر چکے تھے اور اُردو میں ایک دیوان مرتب کر گئے۔ اِس سے ثابت ہے کہ اُردو شعر کے جنم داتا برہمن تھے۔ برہمن کا دیوان اب ناپید ہے چند شعر تذکروں میں یادگار چلے آتے ہیں۔

خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

پیا کے نام کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے

پیا کے نام عاشق کون قتل با عجب دیکھو ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

خوباں کے باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالا ہے

برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا بن
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

یہ نہ جانوں کہ میری آنکھ سے آنسو ٹپکا
نشتر عشق لگا جس سے کہ لوہو ٹپکا

راجا نول رائے وفا [۱]

سید رفیق احمد مارہروی خلف حضرت احسن مارہروی مرحوم راجا نول رائے وفا پر زمانہ بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں اپنا مضمون یوں شروع کرتے ہیں
"زبان اپنی ہے خواہ یہ کہیئے کہ ہندوؤں کا کلام "خالی از فصاحت ہے یا یہ کہ ہندوؤں کو اُردو لکھنا نہیں آتی لیکن واقعات اس کی تردید کرتے ہیں"

۱؎ یہ مضمون سید رفیق احمد مارہروی کے مضمون مطبوعہ رسالہ زمانہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء سے ماخوذ ہے۔ جگر بریلوی۔

اِس کے بعد صاحب مضمون نے چند سطروں میں اِس امر پر بحث کی ہے کہ ہندو اساتذہ کی تعداد کم کیوں ہے اِس کے بعد وفات کے حالات لکھے ہیں جو مختصراً یہ ہیں۔

"نول رائے نام وفا تخلص تھا۔ باپ دادا اٹاوہ کے موروثی قانون گو تھے سکسینہ کایستھوں کے چکوا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نول رائے کا ابتدائی زمانہ راجا رتن چند کے پاس گزرا۔ رتن چند ذات کے بنئے تھے اور سید عبداللہ خاں صوبہ دار الہ آباد کے یہاں دیوان تھے ذاتی قابلیت اور کارکردگی کی بدولت نول رائے بھی راجا ہوئے احمد شاہ کے عہد حکومت میں (۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک) جب عبدالمنصور خاں صفدر جنگ کو اودھ اور الہ آباد کی صوبہ داری ملی راجا نول رائے دونوں صوبوں میں اُن کے نائب رہے۔ راجا ایک زبردست مدبر منتظم اور سیاست داں تھا۔ وہ بہادر سپاہی بھی تھا اور شاعری میں تو اپنا جواب نہیں رکھتا تھا قیام الدین قائم تذکرہ مخزن نکات میں لکھتے ہیں
• مقبول خاطر ارباب صفا لالہ نول رائے متخلص بہ وفا جوانیست نوخاستہ بجمیع صفات آراستہ وپیراستہ جدت ذہن وجودت فہم اصابت رائے ولطافت مزاج بہ مرتبہ اتم دارد"

وفا اردو فارسی دونوں میں فکر کرتے تھے اور دونوں میں دیوان یادگار چھوڑے سید رفیق احمد لکھتے ہیں۔ "منشی دیبی پرشاد نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ راجا نول رائے وفا نے اردو فارسی کے دو دیوان یادگار چھوڑے تھے

افسوس مجھے راجا کے دواوین دیکھنے کی سعادت نصیب نہ ہوسکی بہرحال اُن کا جس قدر کلام نظر سے گزرا بیتاب کئے اور تڑپائے بغیر نہ رہ سکا۔ میری ذاتی عقیدت اگر کوئی معنی رکھتی ہے تو کہنے دیجئے کہ راجا نول رائے اپنے وقت کا اُستاد تھا اس کا کلام اس کے ہمعصر شعراسے ملا لیجئے اسے بہت بلند پائیں گے یہ وہ رنگ ہے جو آپ کو صرف میرؔ کے یہاں مل سکتا ہے۔ اور بس!

سید رفیق احمد آگے لکھتے ہیں۔

"سلطنت مغلیہ کے تنزل کے زمانے میں صوبہ الٰہ آباد اور اودھ کے قرب وجوار میں پٹھانوں کا بڑا زور تھا اُن کی دو زبردست ریاستیں روہیلکھنڈ اور فرخ آباد میں تھیں اور ان کا اقتدار صفدر جنگ کیلئے خدشہ کا باعث تھا وہ ہمیشہ اُن کی بربادی کے منصوبے کیا کرتا تھا روہیلکھنڈ کے نواب علی محمد خاں کے زمانے تک کوئی صورت کامیابی کی نہ ہوئی ان کے فوت ہوتے ہی صفدر جنگ کو موقع مل گیا اُس نے اور راجا نول رائے نے جوڑ توڑ کرکے مرحوم نواب کے بیٹے سعد اللہ خاں کو فرخ آباد کے نواب قاسم خاں سے بھڑا دیا اس جنگ میں قاسم خاں مارا گیا صفدر جنگ فوراً اس کے ملک پر نول رائے کو لے چڑھ دوڑا۔ بیوی بچوں کو گرفتار کیا اور ریاست پر قابض ہوگیا۔ محمد خاں کی زوجہ (بی بی صاحبہ) راجا نول رائے کے سپرد ہوئیں۔ قنوج لے جاکر نوتی محل میں اُن کو نظر بند کر دیا گیا کچھ عرصہ کے بعد نواب محمد خاں بنگش کے ایک وفادار نمک حلال صاحب رائے کایتھ نے جوڑ توڑ لگا کر بی بی صاحبہ کو راجا کی قید سے رہا کرا دیا

پٹھانوں میں جذبۂ انتقام پہلے ہی سے موجزن تھا۔ بی بی صاحبہ کے آزاد ہوتے ہی سب متفق ہوئے احمد خاں کی سر کردگی میں فرخ آباد سے پٹھان راجا نول رائے کی سر کوبی کے لئے روانہ ہوئے ادھر قنوج سے راجا بھی روانہ ہوئے خدا گنج کے مقام پر پڑاؤ ڈالا صفدر جنگ کو جب اطلاع ہوئی اُس نے راجا کو لکھا کہ روانہ ہوتا ہوں میرے آنے تک جنگ شروع نہ ہو راجا یہ خبر پاکر مطمئن ہوئے پڑاؤ کے اردگرد خندقیں کھدوائیں اور صفدر جنگ کا انتظار کرنے لگے۔ پٹھانوں نے موقع کو غنیمت جانا اور ۹ رمضان ۱۱۶۳ھ کی شب کو یکایک راجا کی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں سادات بارہہ نے حق نمک ادا کر دیا۔ الیسا لڑے کہ پٹھانوں کے چھکے چھڑا دیے پٹھان بھی جان پر کھیل کر آئے تھے الیسا رن پڑا کہ راجا نول رائے کی تمام تدبیریں بیکار ہوگئیں۔ پٹھانوں کو فتح ہوئی اور راجا عین لڑائی میں ایک پٹھان کی گولی کا نشانہ بنے، ایک مسلمان شاعر نے تاریخ وفات کہی۔

ادا کرد حق نمک مو بمو روان کرد خون یلاں جو بجو

بیارو برو اے نول سرخرو زبیرداں رسید ند حور و ملک

یہ ہیں چند لفظوں میں اُس راجا نول رائے کے حالات جو ایک باتدبیر منصب دار بہادر سپہ سالار اور بے بدل شاعر تھا۔ اس کا کلام تمام قدیم تذکروں میں ملتا ہے لیکن یہی دو دو تین تین شعر تخن نکات میں ضرور کچھ زیادہ ہے یہی بہت ہے۔ وفا کا نام اور کچھ کلام کہیں کہیں نظر آتا تو ہے۔ آج اگر اُن کا دیوان میر کے کلیات کی طرح ہماری نظر

کے سامنے ہوتا تو یہ اندازہ کرنے کا موقع تھا کہ جس رنگ کو میر سے منسوب کیا جاتا ہے اُس کا سرچشمہ کس کے یہاں سے نکلا۔ دونوں میں کس قدر مسابقت ہے اور اگر ایک دوسرے کا مقلد نہیں تو دونوں کے امتیازی مراتب کیا ہیں لیکن اب وفا کا مجموعۂ کلام کہاں سے لائیں جوان سوالوں کا جواب دیں۔ آفریں ہے سید رفیق احمد صاحب کی ہمت و توفیق پر کہ انھوں نے جانے کہاں سے وفا کو کھوج نکالا اور اُن کے ذکر و کلام سے ارباب ذوق کو لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ وفا کے جواہر افکار کا نمونہ یہ ہے۔

ہوتے تو دل سبھی ہی گرفتار ہو گیا
اب چھوٹنا یہ زلف سے دشوار ہو گیا

دیتا تو دل نہ آپ کو مقصود تھا و لیک
جب مِل گئی یہ آنکھیں ناچار ہو گیا

سمجھے صفائے شست تیری چشم کا وہی
جس کے جگر سے تیر نگہ پار ہو گیا

ایسے مزاج بھی کہیں دیکھے میں اے وفا
کیا بات تھی جو رات وہ بیزار ہو گیا

عارض پہ تمہارے یہ پسینا
ہیرے کاٹے لعل پر نگینا

غم میں بھی اگر رہا سلامت
پتھر سے بھی سخت ہے یہ سینا

ہے جلوہ گر وہ ہم میں پر آلودگی سے دور
جس طرح عکس آئینہ میں ہو ماہتاب کا

اُس کو منظور یاں سے جانا تھا
گریہ میرا فقط بہانہ تھا

دل نہ کرنا تھا اس طرح سے خراب
عاقبت وہ تیر اٹھکانا تھا

راضی وہ ہو کے رات سبھی میں نکل گیا
فتنہ تھا کہ پھنسا تھا دام میں لیکن نکل گیا

اتنا نہ تنگ ہو میرے رہنے سے یاں کہ میں
یہ بھی شوخ گر نہ گیا آج کل گیا

شعلہ زن ہے ہمیشہ داغ اپنا
بجھ نہیں جانتا چراغ اپنا

یاں تلک از خویش رفتہ ہوں کہ مدام
آپ کرتا ہوں میں سراغ اپنا

اپنی غرض کو ہم بھی سمجھیں گے لیک
ہوتی ہے گالیوں سے تمہاری زباں خراب

ہو ویگا دل سے محو غم یار کب تلک
کیوں ہمنشیں یہ جائیگا آزار کب تلک

بسکہ اپنے انقلاب بخت سے ڈرتے ہیں ہم
بستر گل پر بھی لرزاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم

کل کا وعدہ گر کیا بھی اُن سے اے محرم تو کیا
یاں تو بیتابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم

بیچے ہے یک نگاہ یہ دل کے تئیں وفا
لیتا ہو گر تمھیں تو کچھ اتنا گراں نہیں

اپنی ہی چشم کے تئیں تاب نظر نہیں
ورنہ وہ آفتاب کہاں جلوہ گر نہیں

حسن عمل پہ اپنے نہ بھول اس قدر کہ شیخ
واں کے معاملہ سے کسی کو خبر نہیں

ساتھ تجھ سے کہ اگر عہد وفا کی ہم نے
عفو کر عفو کہ اے شوخ خطا کی ہم نے

عقدہ پر عقدہ کئے چرخ نے مضبوط اگر
اک گرہ رشتۂ مقصود سے وا کی ہم نے

ڈر ہے اُس وقت کا ظالم کہ لہو منہ سے
جس گھڑی رو یہ فلک ہو کے دعا کی ہم نے

درد نے دل کے سر مو نے تفاوت نہ کیا
اپنی سی کتنی ہی دارو و دوا کی ہم نے

دکھ نے دے اس قدر وفا کے تئیں
عاقبت وہ بھی جان رکھتا ہے

دل تو کہے ہے جی میں گرفتار کیجئے
یعنی کسی صنم کے تئیں پیار کیجئے

گر مانگتا ہے جی کے تئیں دیجئے وفا
کیا چیز ہے کہ دوست سے انکار کیجئے

ہر دم سرد جو دل ہو نہ سکے گرم فغاں
شغل تھوڑا بھی بھلا ہووے ہے بیکاری سے

کوچۂ عشق کی ہے راہ خطرناک وفا
جو قدم یاں تو رکھے یار تو ہشیاری سے

کس گل تازہ نے اس باغ میں کی جلوہ گری
ہم زرد داغ سے جس کے نہ خریدار ہوئے

جوں اشک نہ پھر اٹھا زمیں سے | یارب میں گرا ہوں کس نظر سے
آنے کا میرے وہ سن کے چرچا | نکلا نہ تمام روز گھر سے

رائے رایان آنند رام مخلص

دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خاں کے یہاں دیوان تھے۔ بڑے جید عالم تھے۔ فارسی خوب کہتے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل سے تلمذ تھا۔ سراج الدین خاں آرزو سے بھی اصلاح لی۔ اردو میں بھی اساتذہ میں شمار تھا۔ صاحب دیوان تھے بڑا دلاویز کلام ہوتا تھا چار شعر سے زیادہ دستیاب نہ ہوئے۔

آتا ہے صبح اٹھکر تیری برابری کو | کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
دھوم آونے کی کس کے گلزار میں پڑی ہے — | ہات اس کے کا پیالا نرگس لئے کھڑی ہے
یوں پکارے ہے کھڑا گلشن میں سرو اوریکسی | پھوٹو قمری کہ گیا آزاد جاتی ہے بہار
پھول پر گلشن کے گویا دانہ شبنم نہیں — | عاشقوں کے حال پر آنکھیں پھراتی ہے بہار

آپ کے ذکر میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ ملتا ہے جس کا یہاں نقل کر دینا لطف سے خالی نہیں۔ مولانا حسرت موہانی اپنی کتاب اُردوے معلے میں لکھتے ہیں۔

"راجا آنند رام مخلص لکھتے ہیں کہ ۱۱۵۲ھ میں ہم یاران دیرینہ مانند پیام اور آرزو، یار ثابت، اور دیوانہ وغیرہ مزار پُر انوار حضرت قطب الاقطاب خواجہ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت سے واپس چلے آرہے تھے برسات کا مہینہ تھا۔ چاروں طرف سڑک کے سبزۂ خودرو عجب بہار

دے رہا تھا۔ پھوئیوں پھوئیوں مینہ پڑ رہا تھا۔ یاران صادق اور دوستان موافق خوش طبعیاں کرتے فی البدیہہ اشعار کہتے قدرتی بہار کی سیر کرتے رکھنہ میں بیٹھے چلے آرہے تھے کہ بہار کے قافیہ پر آرزو بولے۔

چوکان لعل بجوش است خون من دایم
پے جنوں نبود حاجت بہار مرا

پیام شیریں کلام نے فرمایا۔

ترا بخون گل و لالہ باغبان سوگند
ز آشیاں مکن آوارہ در بہار مرا

بہت دیر تک سب اس شعر کی داد دیتے رہے جب میر انبر آیا تو میں نے کہا

بہ ہرزہ نیست دلم را شکایت از صیاد
قفس گرفتہ بہ گل آخر بہار مرا

جب ہم مولانا ناصر علی مغفور کے مزار پر پہونچے تو سب نے فاتحہ پڑھکر پھر شعر خوانی شروع کی۔ سراج الدین علی خاں آرزو مرزا کی طرف منہ کرکے بولے کہ یہ بزرگ اپنے زمانہ کے ہنگامہ آرائے شور محشر تھے اگر اہل دل تھے تو اب بھی کچھ اپنی کرامت دکھائیں اور ضیافت طبع فرمائیں کیوں کہ ع

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ابھی یہ فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ مولانا کے مزار پر مولسری کے درخت پر ایک کوئل اس خوش آوازی اور دردناکی سے کوکی کہ ہم لوگوں کے

دلوں پر اثر ہوا اور سب حاضرین کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
اور دو چار کو وجد آگیا اور آرزو تو بیہوش ہو کر گر پڑے ۔ میں نے
مولانا کا یہ مطلع بے اختیار پکار کر پڑھا ۔

خاک گردیدیم و می رقصد ہنوز افغان ما
خم شکستہ ائا نمی ریزد مے جوشان ما

اس شعر نے اور بھی آگ لگا دی اور قیامت صغریٰ قائم کر دی ایک دوسر
کو لپٹ لپٹ کر روتے تھے اور مزار کے گرد پھرتے تھے بڑی دیر تک
مولانا ناصر علی مغفور کے اس فیضان نے ہم سب کو مست و بیخود بنائے
رکھا ۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ۔

بر سر تربت ما چوں بگزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

ٹیک چند بہار

بہار کھتری تھے ۔ شاہجہان آباد میں رہتے تھے ۔ فارسی کے
ادیب کامل ۔ اردو کے شاعر بے بدل تھے ۔ میر جیسا سخت گیر نقاد
اپنے تذکرے نکات الشعرا میں بہار کے متعلق لکھتا ہے ۔

"بہار سخن از لفظش ہزار ہزار رنگ معنی گل میکند"

فارسی میں لغت بہار عجم مرتب کیا جو اس زبان کا مستند لغت ہے
اور ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیگا ۔ ستر برس کی عمر میں انتقال کیا ۔

فارسی اور اردو دونوں میں صاحب دیوان تھے۔ دونوں زبانوں میں یکساں مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے تھے شاعری میں جو کچھ کاوشیں کیں سب رائگاں گئیں بس دو چار شعر تذکروں میں اسی طرح باقی ہیں جس طرح پُرانے گورستانوں میں کسی کسی تربت پر کتبے مِل جاتے ہیں۔ کیا خوب کہتے ہیں۔

وہی اِک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں

اگر جلوہ نہیں ہے کفر کا اسلام میں ظاہر
سلیمانی سے خط کو دیکھ کیوں زنار کہتے ہیں

نہیں معلوم کیا حکمت ہے شیخ اس کی فرنش میں
ہمیں ایسا خراباتی کیا تجھ کو مناجاتی

سبھی کرتے ہیں دعویٰ خون کا قسمت ہے دیکھیں تو
صف محشر میں ہوگا کس کے دامن ہات قاتل کا

محبت کے قلمرو میں اگر جاگا تو سن لے گا
کوئی آرے تلے چیرا کسی کو کوہ پر پٹکا

کرے وہ سلطنت یہ عشق میں شیریں کے سر دیکھو
تکلف برطرف خسرو کو کیا فرہاد میں نسبت

منظور سیر لالہ جو ہو اُس بہار بیچ
پھولا ہے خوب دیکھ دِل داغدار بیچ

کہتے ہیں عندلیب گرفتار مجھ کو دیکھ
امید چھوٹنے کی نہیں اس بہار میں

دِل ہمارا لیکے کیوں انکار کرتے ہو سجن
کس سے سیکھے ہو یہ تم لے کر مکر جانے کی طرح

ناز استغنا عتاب اعراض سب جانکاہ ہیں
قرباں ہیں خوباں سے کیا معنی کہ ہو دلکو نشاط

عبث تشویش کیوں دیتے ہو گل کی طبع نازک ہے
یہ گستاخی نہیں ہے خوب مت کر شور اے بلبل

نہیں اُس شوخ سا رنگیں ادا گل
اگر رنگیں ہوا تو کیا ہوا گل

مہرباں ہو کر ملا ہے ماہرو شب بے حجاب
کیا مبارک ہے ہمیں یہ ماہ اب کے سال میں

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس
یہ عجب منظر ہے جس کے مبتلا ہوں مرد و زن

ناز بیجا و لطف بے موقع — دلبروں کی ادا ہے کیا کیا کچھ

کرے ہیں تیغ نگہ قتل بے تقصیر کیا کیجے — جو اُن کے ہاتھ یوں مرنا ہو التقدیر کیا کیجے

بنا کر عشق کی سنگین کیا ہے ہم نے عالم ہیں — جو ہوتا کوہ کن یاں آج کرتا آکے مزدوری

دیکھکر کیونکر نہ ہووے دِل رقیبوں کا کباب — کس ادا سے تیغ چشم دیتا ہے ساغر واہ رے

کوئی کس ساتھ ایسے فصل گل میں دل کو پرچاوے — نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ مطرب ہے نہ ہمدم ہے

ہمیں واعظ ڈراتا کیا ہے دوزخ کے عذابوں سے — معاصی گو ہمارے بیش ہوں کچھ مغفرت کم ہے

اگر مارا پڑا دِل ہاتھ سے غمزے کے کیا کم ہے — سپاہی کی یہی معراج ہے اِن بیچ مر دیوے

رائے سرب سنگھ دیوانہ

دیوانہ دہلی کے کالستھ امرا کے خاندان سے تھے اور دہلی ہی وطن تھا۔ راجا مہانراین جو شجاع الدولہ کے یہاں دیوان اور مدار المہام تھے آپ کے حقیقی چچا تھے۔ انھیں کے سایۂ عاطفت میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی آپ کا خاندان علم و فضل میں بھی نامدار تھا۔ شاعری کا ملکہ خدا داد لائے تھے۔ جیسے عالم و فاضل بزرگوں کی صحبت و تربیت نے نکھار دیا بجز سخنوری کے شناور ہو کر چمکے۔ مشاعروں کا خاص شوق تھا۔ بڑے اہتمام و انتظام سے اپنے دولت کدہ پر مشاعرے کرتے۔ خود شعر و ادب کو عروج و فروغ دیا اور ارباب علم و فضل کی بڑی قدر و منزلت کی۔ زیادہ وقت آپ کا لکھنؤ اور بنارس میں گزرا۔ فارسی میں چار ضخیم دیوان یادگار چھوڑے اُردو کے مسلم الثبوت اساتذہ میں تھے رسالہ نگار بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

کے صفحہ ۱۴۵ پر آپ کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے "ان کے تین دیوان اُردو کے تھے اور مصحفی کے زمانے میں یہاں (لکھنؤ میں) ان کا کوس لمن الملکی" بجتا تھا"۔ ان کے متعلق بعض تذکرہ نویسوں نے جو رائیں لکھی ہیں اول وہی نقل کرتا ہوں۔ مولف گلستان بےخزاں لکھتے ہیں "دیوانہ تخلص رائے سرب سنگھ نام شاعر مستثنائے روزگار علم عروض و قوافی میں بہت دانا و ہوشیار فکر اشعار فارسی میں دیوانہ کیا بلکہ فرزانہ نظم اُردو کی تحریر میں یکتائے زمانہ"

"ایک تذکرہ اُردو شعرا کا حکیم قدرت اللہ خاں المتخلص بہ قاسم نے مجموعہ نغز" کے نام سے فارسی زبان میں مرتب کیا۔ یہ تذکرہ محمد حسین آزاد کے تذکرہ آب حیات کا ماخذ ہے[۱۵]۔ اس تذکرے میں قاسم دیوانہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"سرب سنگھ نام وے از شعرائے دیار مشرق است در بلدۂ لکھنؤ لکھنند علم اُستادی می افراشت و کمتر کسے بود کہ نسبت تلمذ بوے نداشت جعفر علی حسرت کہ اُستاد قلندر بخش جرات است نسبت تلمذ بوے دارد کمتر کسے از سکنہ آں دیار وے را اُستاد نہ پندارد"

مسٹر محمد سلیم جن کا پیچھے اوراق میں ذکر کیا گیا الہ آباد یونیورسٹی کے اُردو ایسوسی ایشن میگزین بابت ۳۰-۱۹۲۹ء کے صفحہ ۱۱۴ پر لکھتے ہیں۔

"سرب سنگھ دیوانہ اس دور کے ممتاز اُستادوں میں سے ہیں

---

۱۵ دیکھو مجموعہ نغز مرتبہ محمود شیرانی لیکچرر پنجاب یونیورسٹی جلد اول صفحہ ج۔ جگر بریلوی

اُن کا شمار اُردو کے مشاہیر شعرا میں ہوتا ہے دیوانہ نے اُردو ادب پر خاص مہربانیاں کی ہیں۔ اِن کا حلقہ تلمذ بہت ہی وسیع تھا نہ صرف غیر مسلموں بلکہ مسلم شعرا نے اِن سے مشورت سخن لی ہے اور شاگردی کا فخر رکھتے ہیں اِن میں سے جعفر علی حسرتؔ استاد جرأتؔ۔ میر حیدر علی حیرانؔ خاص طور سے مشہور ہیں "

میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

"رائے سنگھ المتخلص بہ دیوانہ شاعر زبردست فارسی است۔ شعر بسیار گفتہ است اُستاد ریختہ گویان لکھنؤ چنانچہ میاں حسرتؔ و حیدر علی حیرانؔ واکثر دیگراں شاگرد او نید"

مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے میر حسن کا تذکرہ از سرنو مرتب کر کے مع اپنے مقدمہ کے چھپوایا۔ وہ اِس مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"میر حسن کے تذکرے میں بہت سے ہندو شعرا کا ذکر ہے جن میں سے بعض جگت استاد تھے مثلاً سرب سنگھ دیوانہ تخلص . . . . . "

دیوانہ سے صاحب کمال کم پیدا ہوئے ہیں۔ لکھنؤ جیسے اُردو کے مرکز میں اُستاد بلکہ جگت استاد مانے گئے۔ بڑے بڑے سخنور اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔ آج اُن کا کلام اگر ہمارے سامنے ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ اِس یگانۂ روزگار شاعر نے آسمان شعر سے کیسے کیسے تارے توڑے اور کون سے وہ جواہر بکھیرے جن کے باعث یہ جگت استاد ہوا حسرتؔ اور حیرانؔ شاگردوں کے تو دیوان موجود ہیں لیکن

اُستاد کا کلام کہیں نظر نہیں آتا۔ قدیم تذکروں میں نام اور ایک آدھ شعر دکھنے میں آجاتا ہے لیکن ایک ایسا دور آیا کہ تذکرہ نویسوں نے نام بھی اُڑا دیا۔ جس شخص نے تمام عمر اپنے خونِ جگر سے اُردو کے گلستاں کو سینچا اور ایسے ایسے چشمے بہائے جن سے دوسرے لوگ سیراب ہوکر اساتذہ ہوگئے افسوس کہ خود وہی محسنِ عظیم بے نام ونشان ہوکر مٹ گیا۔ مجموعہ نغز میں صرف ذیل کی ایک رباعی دیوانہ کی درج ہے۔

رُباعی

وہ لوگ کہاں کہ یار باشی کیجے
وہ وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشے میں اپنے بیٹھ ہوکر تنہا
اب ناخنِ غم سے دلخراشی کیجے

ایک اور جگہ دو شعر ملے۔

جان پر آئی ہمدم میری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
دل[۵۱] ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے
رستم کا کب جگر ہے کہ زہرہ پگھل نہ جائے

جسونت سنگھ پروانہ

جسونت سنگھ نام کاکاجی عرف پروانہ تخلص۔ مہاراجا بینی بہادر نائب نواب شجاع الدولہ بہادر کے بیٹے تھے اور جگت استاد سرب سنگھ دیوانہ کے شاگردِ رشید۔ قصبہ منڈیاوں وموہبہ ضلع لکھنؤ کے جاگیردار تھے

---

[۵۱] یہ شعر غالباً مطلع ہے اور "ہٹ" کی جگہ پہلے مصرع میں "ٹل" ہے یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ جگر بریلوی

نہایت خوبصورت اور بڑے خلیق آدمی تھے بڑے نیک نفس اور صوفی منش بزرگ تھے سنہ ۱۲۴۵ھ میں انتقال کیا۔

محمد سلیم صدیقی اُردو ایسوسی ایشن میگزین ستمبر ۱۹۲۸ء کے صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں

"اسی زمانے میں سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد جسونت سنگھ پروانہ ہندوؤں میں سب سے مشہور اور نامور شاعر بھی تھے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کی خدمت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ہندوؤں میں اُردو کا عام مذاق پیدا کیا ان کا دیوان کلام بلاغت نظام کا لاجواب انتخاب تھا لیکن اب آنکھوں میں لگانے کو بھی کہیں نہیں ملتا"

مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی تذکرہ میر حسن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں"

"منشی کریم الدین نے تذکرہ شعرائے ہند میں (جو ڈی تاسی کے تذکرہ سے ماخوذ ہے) طبقہ دوم اُن شعرا کے ذکر میں لکھا ہے جو مصلح اُردو اور مروج اس زبان کے تھے اور اُنھوں نے الفاظ کریہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کر دیا اس طبقہ میں سب سے اول راجا جسونت سنگھ متخلص بہ پروانہ کا ذکر ہے"

وہ دیوان پروانہ جو بقول محمد سلیم صدیقی کلام بلاغت نظام کا لاجواب انتخاب تھا۔ ایسا نابود ہوا کہ آج اُس کا ایک ورق بھی کہیں نہیں ملتا خیر دو چار شعر یادگار رہ گئے یہی غنیمت ہے۔

نسیم آمد نے شاید کسی کی کی تاثیر ــــ شگفتگی سی ترے غنچۂ دہاں پر ہے

خمخانہ جاوید میں سن انتقال ۱۲۸۱ھ تحریر ہے۔

کھا تیغ نگہ چھٹ تیرے گھایل کو غش آیا — گویا کہ دم نزع میں بسمل کو غش آیا

کیا کیجئے ہمدم کہ اُسے دیکھکے ہم تو — ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا

کرتے تو کیا قتل یہ خوں بہتے جو دیکھا — ٹھہرا نہ گیا سامنے قاتل کو غش آیا

دیکھنے ہی اُس کے چہرے پر بحالی آگئی — زعفرانی رنگ جو تھا اُس پہ لالی آگئی

آئینہ ساں ہے صاحب جوہر کو زخم غم[1] — اس دور میں تو عیب و ہنر دونوں ایک ہیں

تڑپتے جو دیکھی ہیں لاشیں تو دل اب — تیرے کوچے کو کربلا جانتا ہے

صادق نہ سمجھ اِس کو محبت میں ہے کاذب — جو صبح نمط چاک گریبان نہیں ہے

دیکھ تو ہم سے راست بازوں سے — تو نے آخر یہ کج ادائی کی

ہم سے رکھکر غبار خاطر میں — جا کر اغیار سے صفائی کی

اے دل آزار تو ہی کر انصاف — ہے یہی طرز دلربائی کی

عہد کیا کیا تھے اور قول و قرار — آہ پس پر بھی بیوفائی کی

جس نے دیکھا غرض کیا سجدہ — غرض اُس بت نے بھی خدائی کی

سدا ہے جام مے شرمندہ چشم مست سے تیری — صراحی بھی خجل ہے اِس تیری تصویر گردن سے

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غمخواری کرے — بے وفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے

کوچۂ گیسو میں دل کو ڈھونڈھتے — کیا ہوا گر راہ کا کچھ پھیر ہے

کہتی ہے عندلیب چمن میں پکار کے — اپنے بھی دن پھریں جو پھریں دن بہار کے

اے دل تو نہ ڈر حلقۂ گیسو سے کسی کے — یہ سانپ ہیں کیلے ہوئے جادو سے کسی کے

دل یار سے اور درد میرے دل سے کھے ہے — جانے کا نہیں اپنو میں پہلو سے کسی کے

۱؎ ایک تذکرے میں "زنگ غم ہے"۔ ۲؎ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ گیسو کی جگہ جادو ہوگا۔ علی پرتو

ضعف ہے غش ہے ناتوانی ہے
بن تیرے موت زندگانی ہے

کون مدفون ہے چمن میں صبا
جس کی تربت پہ گلفشانی ہے

پوچھتے اب ہو مرغ دل کا حال
کب سے وہ جنت آشیانی ہے

آپ نے رات چھپ کے پی ہے شراب
رنگ چہرے کا ارغوانی ہے

آہ پروانہ شمع ہے لیکن
زور اس میں شرر فشانی ہے

چشم بد دور پری ہے کہ کوئی حور ہے تو
سر سے پا تک جو تجھے دیکھے اک نور ہے تو

لاکھ تدبیر کریں ہات کوئی آتا ہے
اپنے نزدیک تو اے جان بہت دور ہے تو

بحر ہستی میں ترا جسم ہے مانند حباب
تس پہ اکدم کی ہوا کھانے پہ مسرور ہے تو

اس کی ہمچشمی انھیں آنکھوں سے بس بس نرگس
تجھ کو بینائی سے بہرہ نہیں معذور ہے تو

تن بدن میں جو لگی آگ تو اے پروانہ
کیا کرے اپنے جلا دینے میں مجبور ہے تو

جو کثرت میں وحدت سدا دیکھتے ہیں
بتوں میں وہ نور خدا دیکھتے ہیں

مقرر یہاں غیر آتا ہے شب کو
ترے گھر میں ہم نقش پا دیکھتے ہیں

پھسلتا ہے پائے نگہ اس پہ ہر دم
ترے رخ کی جب ہم صفا دیکھتے ہیں

جدا ہے جو پروانہ اس شمع رو سے
نہایت دل اس کا بجھا دیکھتے ہیں

قطعہ تاریخ وفات جرأت

جو کہ کرتا ہے فکر شعر و سخن
اس زمانے میں وہ غنیمت ہے

کہ نہ اگلے سے لوگ باقی ہیں
نہ وہ مجلس ہے اور نہ صحبت ہے

اک سخنگو جو تھا قلندر بخش
نام جرأت سے جس کی شہرت ہے

کر گیا کوچ اس مقام سے حیف
آج منزل نشین حسرت ہے

ہے یہ تاریخ اول اور ثانی　　کہو جنت نصیب جرأت ہے

پریم چند ؎۱

ولادت ۱۸۸۰ء　　　　وفات ۱۹۳۶ء

وہی کچھ جانتے ہیں لطف جینے اور مرنے کا
محبت میں جو اپنی زندگی برباد کرتے ہیں
(جگر بریلوی)

مڈھوا لمہی متصل پانڈے پور بنارس میں ایک چھوٹا سا گانوں ہے یہیں پریم چند سمت ۱۹۳۷ بکرمی میں پیدا ہوئے یہیں اُن کا بچپن گزرا کچھ روز ملازمت کی گردش سے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر یہیں اقامت پذیر ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ وہ میانہ قد چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ ناک نقشہ، خط و خال اپنی اپنی جگہ مناسب اور درست بلکہ خوبصورت۔ رنگ گندمی چھوٹی چھوٹی مونچھیں بے ربطی کے ساتھ ہونٹوں پر پڑی رہتی تھیں سر کے بال پریشان رہتے تھے شاید کنگھی کرنے کی بھی نوبت ہفتوں نہیں آتی تھی۔ اسی طرح لباس میں بھی بے پروا تھے کوٹ پہنا ہے تو بٹن کھلے ہیں اکثر دھوتی پر ہی کوٹ پہن لیا ہے۔ کبھی کبھی اچکن اور پائجامہ بھی پہن لیتے تھے۔ کبھی صافہ بھی باندھ لیتے تھے۔ جب دیش بھگتی کا رنگ چڑھا تو کرتہ دھوتی اور گاندھی ٹوپی پہننے لگے اور آخر وقت تک پہنتے رہے وہ ایسے گھر میں پیدا ہوئے جس میں افلاس کی تاریکی تھی

؎۱ اس مضمون میں جو اقتباسات ہیں وہ رسالہ زمانہ کے پریم چند نمبر سے ماخوذ ہیں (جگر بریلوی)

منشي پريم چند

انکے والد منشی عجائب لال بیس روپیہ ماہوار کے ڈاکخانہ میں کلرک تھے ترقی کر کے کئی سال بعد چالیس روپیہ پانے لگے لیکن موت نے اس سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں پریم چند کی شادی کر دی جب خود دنیا سے کوچ کیا تو پریم چند کی بیوی ان کی سوتیلی ماں اور دو سوتیلوں بھائیوں کا بھاری بوجھ ایک کم عمر نا آزمودہ کار اور بیکس فرزند کے کمزور کاندھوں پر قرض عظیم کی طرح چھوڑ گئے۔ پریم چند اُس وقت نویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ خود لکھتے ہیں۔

"آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی، پاؤں میں جوتے نہ تھے، بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے، گرانی الگ دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی کوئنس کالج بنارس میں پڑھتا تھا ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا چار بجے شام کو پہونچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہونچ سکتا تھا۔ سویرے پھر آٹھ بجے گھر سے چل دیتا ورنہ وقت پر اسکول نہ پہونچتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپّی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا تھا"

بچپن کا سن تو موجیں اڑانے کا اور کھیل کود کا سن ہوتا ہی ہے لیکن کبھی بیفکری اور چین سے گزرتا ہے اگر شفیق والدین کا سایہ سر پر ہو چاہے والدین امیر ہوں یا غریب۔ پریم چند اپنی عمر کے پندرھویں سال ہی

میں ظلِ پدری سے محروم ہو گئے۔ اِس پر ایک پیسے کی آمدنی نہیں گرہستی
کا بوجھ اتنا بھاری۔ ادھر کم عمری اور دنیا و کاروبارِ دنیا سے بےخبری عجیب
مصیبت اور پریشانی کا سامنا تھا۔ لیکن بڑی ہستیوں کے جوہر بچپنے سے
ہی کھلنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ ترقی پا کر عظمت کا باعث ہو جاتے ہیں۔
پرم چند نے ایک فرض شناس فرزند کی طرح اپنی بھاری ذمہ داریوں کا بخوبی احساس
کیا اور بہادر سپاہی کی طرح زندگی کی جنگ کے لئے مستعد ہو گئے۔ ٹیوشن کر کے
خود پڑھا اپنے آپ کو اور کنبہ بھر کو پالا ٹیوشن بھی کتنی پانچ روپیہ ماہوار کی۔
صد آفریں اِس ہمت و جواںمردی پر۔ میٹرکولیشن سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا
دو مرتبہ انٹرمیڈیٹ میں داخلہ کی کوشش کی مگر ریاضی سے طبیعت کو مناسبت
نہ ہونے کے باعث اور ریاضی اُس زمانے میں لازمی مضامین میں سے تھی،
جانچ میں پورے نہ اُترے داخلہ نہ ہو سکا۔ پڑھنے کا شوق مطمئن بیٹھنے نہ دیتا
تھا۔ یہ دھن تھی کہ کسی طرح ریاضی میں مہارت بڑھا کر پھر کالج میں داخل
ہو جائیں۔ اِس لئے شہر میں رہنا ضروری تھا لکھتے ہیں۔
"اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا
پانچ روپیہ تنخواہ ٹھہری میں نے دو روپیہ میں گزر کر کے تین روپیہ گھر
دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اُوپر ایک چھوٹی سی
کچی کوٹھری تھی اُسی میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا
بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن
بھی لایا ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانجھ کر لائبریری چلا جاتا"

پانچ روپیہ میں اپنی اور کنبہ بھر کی پرورش کرنا آسان نہ تھا کتنی ہی جفاکشی پریم چند کیوں نہ کرتے۔ آخر کبھی کبھی دن دن بھر فاقہ کرنے کی نوبت آئی۔ یہ جفاکشی کی انتہا تھی اس کے آگے اجل ہے جو قدرت کا نشانہ تھا جب جفاکشی اور تنگ حالی کی حد ہو چکی تو کچھ فراغت کی صورت بھی نکلی ۱۸۹۹ء کی بات ہے ایک موقع پر دو دن متواتر ایک ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھا کر گزر کی۔ مہاجن نے اُدھار دینے سے انکار کر دیا اب کیا کریں گہنے اور گھر کے برتنوں پر روپیہ لینا شرافت سے بعید تھا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا مر جانے کے برابر تھا اپنی ایک عزیز کتاب علم ورتی کی ارتھمیٹک کی شرح لے کر ایک کتب فروش کی دوکان پر گئے دو روپیہ کی کتاب تھی ایک روپیہ میں بکی لیکن وہاں رحمت کا فرشتہ ایک ہیڈ ماسٹر کے بھیس میں مل گیا، وہ ایک لمبی مونچھوں والا امتین شخص تھا، ہونہار نوجوان کے چہرے پر اس طلبا کے قیافہ شناس نے ذکاوت وذہانت کی چمک دیکھکر سوال کیا کہاں پڑھتے ہو۔ کہا کہیں نہیں اُس نے پھر پوچھا میٹریکیولیشن پاس ہو۔ کہا ہاں۔ پوچھا نوکری تو نہیں چاہتے ہو۔ جواب ملا کہیں ملتی ہی نہیں۔ اس نیک نہاد ماسٹر کو ایک اسسٹنٹ کی ضرورت تھی اٹھارہ روپیہ ماہوار پر پریم چند کو ملازم رکھ لیا۔ جو شخص پانچ روپیہ میں ایک کنبہ پال رہا ہو اور جسے خود کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی ہو اُس کے لئے اٹھارہ روپیہ ایک ریاست کے برابر تھے اور غیر معمولی خوشی وخوش نصیبی کی تقریب چنانچہ خود لکھتے ہیں، "اس وقت یہ اٹھارہ روپیہ

میری مایوس تمنا کی معراج تھے۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا تو پانوں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

یہ ملازمت پریم چند کے لئے ترقی کی پہلی سیڑھی ثابت ہوئی علم کی لگن تو لگی ہوئی تھی ہی اِدھر اب انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں ریاضی لازمی بھی نہیں رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ بھی پاس کیا اور بی۔ اے بھی اور دونوں سکنڈ ڈویژن میں ملازمت میں ترقی کی۔ رفتہ رفتہ سب ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ایک روشن خیال اور آزاد مزاج شخص جس کے دل میں قومی درد بھی ہو اور جو مادر وطن کی بیکسی، بے بسی، ناداری اور غلامی سے ملول و ناشاد بھی ہو ایسی ملازمت کے بندھن میں کب تک رہ سکتا ہے جس میں روح بھی آزاد نہ ہو۔ آخر جلیانوالہ کے المناک واقعہ کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کا جھنڈا اٹھایا اور دوسرے مقامات کی طرح گورکھپور کی سرزمین کو بھی اپنے قدموں سے پاک و بیدار کیا تو وہیں پریم چند نے اِس مقدس ہستی کے درشنوں سے فیضیاب ہو کر اپنی گردن سے چاکری کا طوق لعنت اُتار پھینکا اور قلم کا سہارا لیا۔ ابتدا میں اُردو کو اپنا میدان بنایا اور رسالہ زمانہ میں مضامین اور افسانے لکھنا شروع کیا لیکن آپ کو جلد معلوم ہو گیا کہ اُردو میں دماغ سوزیوں اور جگر کاویوں کا صلہ سوا نکتہ چینی اور فاقہ کشی کے کچھ نہیں اور بعد مرگ گمنامی۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ اُردو میں اب گزر نہیں معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دوں گا۔

اُردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا جو مجھے ہو گا "چنانچہ اُردو کو خیرباد کہا اور ہندی کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ آپ کے لئے فال نیک تھی اور مُلک کی خوش نصیبی کی تمہید۔ ہندی والوں نے بڑی محبت سے آپ کا خیر مقدم کیا۔ جب ہندی میں اچھی طرح سکہ بیٹھ گیا اور فکرِ معاش سے آزاد ہو گئے تو اُردو میں بھی پھر لکھنے لگے کہ وہ بھی آپ کو عزیز تھی لیکن فارغ البالی اور اطمینان ہندی ہی کی بدولت نصیب ہوئے۔ اپنے آبائی مکان کو پختہ بنوالیا وہیں ایک گوشہ میں ادب کا یہ پوجاری دُنیا و مافیہا سے بےخبر سرسوتی کی پرستش میں محو رہتا تھا اور اس کی شہرت بوئے گُل کی طرح دُور دُور اطراف عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس ادبی محویت و پرستاری میں خاموشی اور سکوں کے ساتھ وہ ایسی گھریلو زندگی گزار رہا تھا جو خود اُس کے قول کے مطابق دُنیا کی بہترین نعمت ہے۔

پریم چند نے قومی ادب پر وہ لازوال نقوش ثبت کئے ہیں جو رفتہ رفتہ اُبھر کر نگار خانے بننے والے ہیں اُن کی تصنیفات سے متمدن دُنیا کی نگاہوں میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کا وہ وقار از سرِ نو قائم ہوا جو کبھی اس کو حاصل تھا اپنے ادب کی سچی خدمت اپنی قوم کی بہترین خدمت ہے۔ ادب ہی سے کسی قوم کے ارتقاے شعور اور دل و دماغ کے عروج و فروغ کا اندازہ ہوتا ہے اور اُس کی عظمت و فضیلت متفق و متین ہوتی ہے۔ پریم چند کی یہ خدمات بے اندازہ ہیں پھر بھی اُن کی ذات سے بہت اُمیدیں وابستہ تھیں جو مرگ بے ہنگام نے منقطع کر دیں چھپن سال کی عمر اگرچہ ہندوستانیوں جیسے مفلوک و خستہ حال لوگوں کے لئے بڑی عمر سہی تاہم

طبعی نہیں کہی جاسکتی پریم چند اگر یورپ یا امریکہ جیسے قدرداں اور دولتمند ملک میں جنم لیتے اور اپنی قوم کی اتنی عظیم الشان خدمت انجام دیتے تو موتیوں میں تول لئے جاتے، مالامال ہو جاتے اُن کی تصنیفات آب زر سے لکھی جاتیں۔ لیکن بوڑھا ہندوستان خود ہی افلاس کا مارا ہوا ہے وہ اپنے بچوں کو کیا مالامال کر سکتا ہے یہی بہت ہے کہ اُن کا پیٹ پالے۔ ماتم کی جگہ تو یہ ہے کہ اس کے بچے اپنے محسنوں سے شرمناک غفلت اور بے اعتنائی برتتے ہیں۔ جس قوم میں پریم چند پیدا ہوئے وہ اپنے سپوتوں کی قدر کرنا جانتی ہی نہیں ادب میں تو یہ ناقدر شناسی ازلی ہے۔ پریم چند خود ایک جگہ لکھتے ہیں "ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مرادف ہے" خیر یہ پرانا دکھڑا ہے بار بار اس کا رونا کیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ حالت بدستور اپنی جگہ رہیگی لیکن خدمت کرنے والے بھی اپنی سی کرتے رہنگے۔ جیسا پریم چند نے کیا زندگی بھر سرسوتی کی پوجا کی اور جب اجل آئی تو اطمینان کے ساتھ جان جان آفریں کو سونپ دی۔ جلندھر سے شدید مرض میں مبتلا تھے علاج معالجہ جو کچھ بھی ہو سکا ہوا ہوگا موت تو کسی کے ٹالے ٹلتی نہیں لیکن اگر قوم نے چارہ سازی میں کچھ دوڑ دھوپ یا سعی و تدبیر صرف کی ہوتی تو صبر آجاتا بہر حال مشیت ایزدی پوری ہو کر رہی اور پریم چند اپنی اپنے چھوٹے سے آبائی مکان میں اپنی سوگوار بیوی اور لاوارث بچوں کو روتے پیٹتے چھوڑ کر ہنستے ہوئے دنیا سے کنارا کر گئے اور بد نصیب

ہندوستانیوں کے لئے وہ امرت کا سوتا ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا جو اُن کے قلم کی روانی سے جاری تھا آہ۔

اے راہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ
بے تو درہمیم تو بے ما چگونہ

بچپنے ہی سے پریم چند کی مشکلات نے اُن کے دو جوہر نمایاں کر دیئے تھے ایک استقلال دوسرے ہمت۔ سادگی اُن کے مزاج کا خمیر تھی جس کو کم عمری کی جفاکشیوں نے اور بھی نکھار دیا تھا اُن کی ضروریات جسمانی مقتضیات فطرت تک محدود تھیں وہ کھانا بھوک رفع کرنے کے لئے کھاتے تھے نہ کہ لذت زبان کے لئے وہ کپڑا تن ڈھانکنے کے لئے اور موسمی ضرورت سے پہنتے تھے نہ جسمانی راحت یا نمائش کے لئے۔ بناوٹ سے اُن کو دلی نفرت تھی وہ ناداری کی مصیبت اور بھوک کی تکلیف سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے دوسروں کو دُکھ میں دیکھکر اُن کا دردآشنا دل جلد بھر آتا تھا وہ بے انتہا خلیق و متواضع تھے خود تکلیف اٹھا کر اپنے احباب کے ساتھ سلوک کرنے میں اُن کو بڑی راحت ملتی تھی۔ نیک نفسی اُن کی سرشت تھی جس نے انکسار، پاکبازی اور بلند خیالی سے ملکر اُن کو اُس بلند مقام پر پہونچا دیا تھا جہاں انسانیت کی ضیا ملکوتی نور میں مل جاتی ہے ان تمام باتوں کے باوصف وہ حد درجہ کے خوددار تھے اُن کی خودداری وہ خودداری نہیں تھی جو بیشتر خودپسندی سے پیدا ہوتی ہے یا بدوضعی و بدافعالی کے باوجود بعض لوگوں میں جاہ و امارت سے یا علم کے زعم

سے پیدا ہو جاتی ہے پریم چند کی خودداری اُن کی پاک بینی، نیک نفسی اور نیک کرداری جیسی صفات کا وقار قائم رکھنے کے لئے تھی، نفس کو نخوت پسند اور سر کو پُر غرور بنا دینے کے لئے نہیں تھی۔ اُن کی زندگی میں بڑی نرمی اور لوچ تھا وہ ایک مکمل انسان تھے جو بقول افسر میرٹھی صدیوں کے الٹ پھیر میں بھی نہیں پیدا ہوتے ان تمام خوبیوں کے ساتھ اُن کی سیرت میں کچھ ایسے جوہر بھی تھے جن سے انسانیت میں جمالیاتی شان پیدا ہو جاتی ہے یہ اُن کی خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی تھی وہ ہر حال میں مسکراتے رہتے تھے۔ اور بے تکلف دوست احباب کی صحبتوں میں بڑے زور سے قہقہہ لگاتے تھے یہ قہقہہ یقیناً زندگی کے اندوہ و آلام پر خندہ زنی کا سبق دیتا تھا۔ اُنھوں نے درویشانہ و فقیرانہ زندگی بسر کی وہ کبھی اپنے ملازم سے بھی ناملائم گفتگو نہ کرتے تھے اُنھوں نے اپنے ماحول کو اپنی طبیعت کے مطابق ڈھال لیا تھا اپنی بیوی اور بچوں کو اپنی نیک پاک اور مفید زندگی سے ہر حال میں خوش رہنا سکھا کر اپنے گھر کو اُنھوں نے اپنے اور بیوی بچوں کے لئے جنت کا نمونہ بنا لیا تھا چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ قناعت کی گھریلو زندگی دُنیا کی بہترین نعمت ہے" حق یہ ہے کہ نیکی اور قناعت کی یہی گھریلو زندگی کسی زمانے میں ہندو کنبہ کا نصب العین تھی۔ پریم چند کی زندگی میں بڑا رس تھا حقیقت میں وہ ایک سُریلا راگ تھی جو اپنی شیرینی، نور و سرور پاکیزگی اور لطافت سے ایک طرف دُنیا کی ناہمواریوں سے ہم آہنگ تھا اور دوسری طرف اُن کی

روح کی گہرائیوں میں گونج کر صوت سرمدی سے جا ملا تھا۔

پریم چند نے کہنے کو تو بی اے پاس کیا تھا لیکن اُن کا مطالعہ بہت وسیع و عمیق تھا جس تصنیف کو پڑھتے تھے اُس کے موضوعات پر حاوی ہو جاتے تھے منشی منظور الحق کلیم جن کو پریم چند کے شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے لکھتے ہیں "میری جماعت کو تاریخ پڑھاتے تھے .... نہیں معلوم اُن کی معلومات کتنی وسیع تھیں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جو کچھ تاریخ میں سُناتے اُس کے خلاف مختلف تاریخی حوالوں سے بیان کرتے کلاس میں اُن کے آتے ہی ایسی زندہ دلی پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر ایک اُن کی طرف مخاطب ہو جاتا یہ ضروری نہ تھا کہ جو سبجکٹ پڑھانا ہے وہی پڑھایا جائے بلکہ جس موضع کی طرف اُن کا رجحان یا لڑکوں کا تقاضا ہوا بیان فرمائینگے مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی لکھتے ہیں۔

"منشی پریم چند کو مطالعہ کا بہت شوق تھا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر ایک آدھ کتاب اُن کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اِس کے ساتھ ہی حافظہ بھی بلا کا تھا"

اِسی وسعت مطالعہ اور ذہانت کا یہ فیض تھا کہ وہ ایک بے عدیل ادیب اور نقاد بھی تھے اُن کی تنقیدیں اکثر رسالہ زمانہ میں شائع ہوئیں اُن میں فن تنقید کے اصلی جوہر نمایاں ہیں ایک مرتبہ اڈیٹر زمانہ نے زمانہ کا ایک پورا نمبر اُس مضمون کے نذر کر دیا جو حضرت اثر لکھنوی نے آتش پر لکھا تھا۔ اِس سے زمانہ کے بہت سے

قارئین کو کوفت ہوئی۔ پریم چند نے اڈیٹر صاحب کو شکایتی خط لکھا اور جس عالمانہ انداز سے مختصراً اس مضمون کی تنقید کر دی دیکھنے کی چیز ہے۔ کسی زمانہ میں اس کا کچھ حصہ شائع ہوا تھا۔ مرزا فدا علی خنجر پریم چند کے متعلق لکھتے ہیں۔

"وہ ہر تصنیف پر گہری نظر ڈالنے کے عادی تھے آجکل جن مضامین کو بے حقیقت سمجھکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ ہمیشہ اُن کے مطالعہ سے بہترین اور مفید نتائج اخذ کر لیتے تھے نقد تبصرہ اُن کی طبیعت ثانی بن چکا تھا۔ در اصل وہ اتنی صحیح رائے قایم کرتے تھے کہ کسی کو اُس میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی"

پریم چند نے دیگر ادبیات کے ساتھ ساتھ اُردو کے قصہ کہانیوں کی کتابیں بہت پڑھیں۔ فسانہ آزاد، چندر کانتا، طلسم ہوش رُبا جیسی ضخیم تصانیف کا مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانیاں انگریزی میں پڑھیں انھیں قصے کہانیوں سے اُن میں افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے پہلا ناول سنہ ۱۹۰۱ء میں لکھنا شروع کیا اور کہانیاں سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۷ء میں لکھیں۔ آخر زندگی تک دو سو سے زیادہ مختصر افسانے لکھے اور کئی بڑے بڑے ناول ان کے علاوہ بہت سے افسانوں کے مجموعے اور ناول پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، میدانِ عمل، چوگانِ ہستی، بازارِ حسن وغیرہ وغیرہ اُردو میں ہیں۔ پریم چند نے مختصر افسانہ نگاری کی ایجاد کی اور اپنی مخصوص طرز کو ختم بھی کر گئے اُن کی روش پر چلنے والے ملک میں

متعدد ہیں لیکن اُن کو کوئی نہیں پہونچتا۔ اُن کی افسانہ نگاری پر مفصل تبصرہ کرنے کے لئے علٰحدہ ایک کتاب چاہیئے اِس مختصر مضمون میں اجمالاً اُن کی ممتاز خصوصیتوں پر روشنی ڈالی جائیگی۔ کسی تصنیف میں دو باتیں دیکھنے کی ہوتی ہیں وہ یہ کہ مصنف نے کیا لکھا ہے اور کس انداز سے لکھا ہے افسانہ ایک چھوٹی کہانی ہوتی ہے اِس میں اور ناول میں مختصراً یہ فرق ہے کہ ناول میں ہیرو کے مکمل کردار کو نمایاں کیا جاتا ہے اور افسانہ میں کردار کے کسی ایک پہلو کو۔ ناول منشی پریم چند سے پہلے بھی لکھے گئے ناول نگاری کی ایجاد رتن ناتھ سرشارؔ نے کی۔ اُس کا ضخیم ناول فسانہ آزاد اُردو زبان کا گرانقدر خزانہ ہے اور ایک کلاسیکل تصنیف لیکن اُس میں اور پریم چند کے افسانوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ فسانہ آزاد اُس زمانے کے لکھنؤ کے عیش پرست مسلمان امیروں کی زندگی کا مرقع ہے اور اس وقت کی لکھنؤ کی سوسائٹی کی سچی اور مکمل تاریخ جس کی تصنیف میں مصنف کے شوخ اور جادو نگار قلم نے سو سو طرح دادِ کمال دی ہے۔ پریم چند کے افسانے انسانی فطرت کے گوناگوں اسرار کی تفسیریں ہیں اور نفسیاتی حقیقتوں پر مبنی ہونے کے باعث دوامی حیثیت رکھتے ہیں یہ خصوصیت پریم چند کو اُن دوسرے افسانہ نویسوں سے بھی ممتاز کرتی ہے جن کی تصنیفات میں عام طور پر جنسی جذبات سے سروکار رکھا جاتا ہے اور اخلاق سوز اور گمراہ کن حسن و عشق کے ماجرے تراش کر پڑھنے والوں کی طبیعتوں میں اسفل جذبات کی

لذت یابی کا چسکا پیدا کیا جاتا ہے۔

پریم چند کو انسانی فطرت کا اتنا وسیع علم تھا کہ ہر افسانے کے ہیرو اپنی سرشت وسیرت میں امتیازی شان رکھتا ہے کہیں دو کرداروں میں یکسانیت نظر نہیں آتی اس خصوص میں وہ ہندوستان کے شیکسپیر کہے جا سکتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ اُنھیں ملک کی موجودہ سیاسی اور سماجی حالتوں اور کیفیتوں سے بھی بخوبی واقفیت تھی۔ نئی تہذیب کے اچھے اور بُرے پہلوؤں سے بھی وہ آگاہ تھے۔ اُن کے جادو نگار قلم نے ہر قسم کی بُرائیوں اور اچھائیوں کے پیکر تراشے ہیں۔ بُرائیوں کے کم اچھائیوں کے زیادہ یہ پیکر بالکل قدرتی انسان ہیں اور ایسے انسان ہیں جو باپ بھائی، بٹیا، بہن، بیوی، خاوند، دوست، احباب، ملازم، آقا، حاکم، ماتحت دکاندار، ڈاکٹر، طبیب، وید، پنڈت، ملا، شاعر، ادیب، بھگت، ماسٹر، چپراسی، دفتری وغیرہ وغیرہ کی شکل میں روزانہ زندگی میں ملتے ہیں۔ اور جن سے ہر شخص کو سابقہ رہتا ہے اِن کرداروں میں ذرا بھی مصنوعی رنگ وروغن نہیں۔ اِس سادگی اور پُرکاری سے اِن کی دُنیا رچی گئی ہے اِس میں کوئی دشواری ہی نظر نہیں آتی لیکن جب کوئی مقابلہ میں لکھنے کو بیٹھے تو دم اُکھڑنے لگے۔ اِس کردار نگاری کے ہی ہم پلہ پریم چند کی ماحول نگاری ہے اُن کے افسانوں میں روزمرہ کی گھریلو زندگی کی ایسی سچی کیفیتیں اور حالتیں پیش کی گئیں ہیں جنھیں معاشرتی اعتبار سے تاریخی چیزیں سمجھنا چاہئے پھر ان حالتوں کے پہلو اِس قدر مختلف النوع ہیں جتنے اِس وسیع ملک

کے ہو سکتے ہیں۔ اِن ہزار رنگ کے کرداروں اور صد ہزار رنگ کی معاشرتی صُورتوں میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کی روح جاری و ساری ہے وہ روح جو اخلاقی اور مذہبی نشوونما کی بنیاد ہے اور انسانیت کی جڑ چھوٹے چھوٹے معاملات اور روزمرہ کے معمولی معمولی حالات سے باتوں باتوں میں زندگی کے ایسے ایسے بھید کھولے گئے ہیں جو ایک پختہ مغز حکیم ہی کا کام ہے اور ایسے ایسے اصلاحی نکتے حل کئے گئے ہیں جو ہزار پند و نصایح سے بڑھکر ہی نہیں بلکہ موثر ہیں۔ مختصر یہ کہ عام آدمیوں کے رہنے بسنے کی معمولی معمولی باتوں میں پریم چند نے تہذیب و تمدن کی انمول خصوصیتوں کو اُجاگر کرکے ہماری مٹتی ہوئی عظمت و رفعت کی گہری اور مضبوط بنیادیں قایم کر دی ہیں اِن بنیادوں پر کبھی ایسی عالی شان عمارتیں تعمیر ہوں گی جو دُنیا کو حیرت میں ڈال دینگی اور اہل عالم کے لئے انسانیت، اخوت اور روحانیت کا نمونہ بن جائے گی۔ یہ اخلاقی کمال پریم چند کے وسیع مطالعہ، غائر مشاہدہ اور خداداد ذہانت و ذکاوت کا ثمرہ تھا جس میں اُن کے ساحرانہ قلم نے چار چاند لگا دئیے۔ پریم چند کے افسانے نہ صرف اپنے ملک کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبولِ خاص و عام ہوئے بلکہ ہندوستان کے باہر چینی، جاپانی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر اُن کی ادبی فضیلت کا باعث ہوئے پریم چند بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ آج تک کسی اُردو مصنف کو یہ بلند نامی نصیب نہیں ہوئی۔

انسانی فطرت کے نازک ترین اسرار سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ
پریم چند کو ہندوستانی معاشرت اور تواریخ سے بھی بخوبی آگاہی تھی سب
پر طرہ ان کا حسن بیان تھا ان کی طرز تحریر ادب و انشا کا معیار ہے اور
جدت و جودت کا زیور وہ جس امر اور جس بات پر لکھتے ہیں ایک ایک
لفظ حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ منتہائے بلاغت ہے۔ اُن کے لفظ لفظ
میں کچھ ایسا نازک ربط، گھلاوٹ اور رس ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں
امرت سا اُتر کر اس کے رگ و ریشہ میں گھل مل جاتا ہے اور اس طرح
انسانیت اور روحانیت کی نشو و نما کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ محض قادر الکلامی
کے بس کی بات نہیں یہ وہ رس ہے جو پریم چند کی زندگی میں تھا یہ اُس
پاک شیریں اور لطیف ہم آہنگی کا کرشمہ ہے جو پریم چند کی سیرت،
خیالات اور افعال میں تھی اور جس نے اُنھیں ادیب کے مرتبہ
سے بلند کر کے فرشتہ کے مرتبہ پر پہونچا دیا تھا ایسے سرمایۂ افتخار اور یگانۂ
روزگار انسان، ادیب، مصلح اور محسن قوم کو موت نے ہم سے چھین لیا
مگر موت ظالم و بیرحم موت کس کا لحاظ کرتی ہے اور کس پر ترس کھاتی ہے
یہی بہت ہے کہ مرحوم ایک لازوال دولت ہمارے لئے چھوڑ گئے
ایسی دولت جس سے ہم اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیوں کو بلند، پاک
خوبصورت اور مفید سب کچھ بنا سکتے ہیں اور بھارت ورش
کی عظمت کو ابدالآباد تک قایم و برقرار رکھ سکتے ہیں۔

پریم چند کے انتقال کی خبر جب پھیلی تو دور دور تک ماتم ہوا

بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے آنسو بہائے۔ صدہا نوحے اور وفات کی تاریخیں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئیں ہندوستان کا مشہور آفاق اور یگانہ روزگار رشی، شاعر، افسانہ نگار، مفکر اور مصلح قوم رابندر ناتھ ٹیگور لکھتا ہے۔

"پریم چند کی قابلیت اور ادبی خدمات بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھیں اُن کے چلے جانے سے ہم کو نقصان عظیم ہوا ہے۔

کچھ اور مبصران ادب و شعر لکھتے ہیں

"منشی پریم چند کی نا وقت موت پر جتنا غم کیا جائے کم ہے منشی صاحب ہندوستان کے اُن اقبالمند ادیبوں میں تھے جن کے ادبی کمالات کا اعتراف کرنے پر اُن کے حاسد بھی مجبور تھے یہی واحد خصوصیت اُن کو ادب و انشا کی بلند ترین چوٹی پر پہونچانے کو کافی ہے چہ جائیکہ تمام وہ خوبیاں جو مبداء فیاض نے ان کی فطرت میں فراہم کر دی تھیں ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

واقعی منشی صاحب عصر حاضر کے بہترین افسانہ نویس تھے اُنھوں نے ذہن رسا کی مدد سے انسانی فطرت کی جیسی عدیم النظیر تصویریں کھینچی ہیں اس کا جواب نہ اردو ادیب پیش کر سکتا ہے اور نہ ہندی لٹریچر"

(مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)

"اکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو ہرسٹ نے ایک مرتبہ پریم چند

کو لکھا تھا کہ اُن کی تصانیف بہت بلند پایہ اور ہندوستانی ادب کی صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں - تجربہ کار عالم و نقاد ادب مولانا شبلی نے بھی ایک بار یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سات کروڑ مسلمانوں میں کوئی شخص پریم چند کی سی لطیف اور سنواری ہوئی نثر نہیں لکھتا"

(پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے)

"میں کہتا ہوں خدا نے کسی فرشتہ کا نام پریم چند رکھ دیا تھا- ان کی محبت اُن کی بے ریائی، اُن کا بھولا پن اُن کی صاف گوئی کن کن چیزوں کو یاد کروں -

ایسے انسان صدیوں کے اُلٹ پھیر میں بھی پیدا نہیں ہوتے"

(حامد اللہ افسر میرٹھی بی۔ اے)

"آغا حشر مرحوم منشی جی کے بڑے مداح تھے اور اُن کی ہر تصنیف کو بقول خود طفل مکتب کی طرح گھوٹے لگا لگا کر پڑھا کرتے تھے مرحوم کی رائے تھی کہ منشی جی کا ہر فسانہ زندہ اسٹیج معلوم ہوتا ہے اور اُس کا ہر کردار مُنہ سے بولے اُٹھتا ہے اِس کی عبارت ایسی پیاری، نئی اور نادر تراکیب سے مملو ہوئی ہے کہ قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے"

(جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی - اے- ایل ایل بی)

"پریم چند جی صرف ماہر زباں ہی نہ تھے آپ فاضل ادب تھے-زبان کو گوناگوں الفاظ دبوقلموں بندش و اسالیب سے مزین کر رہے تھے

آپ اپنے قابل قدر ترجموں سے علوم فنون کے گراں بہا موتیوں سے خزانہ کو بھر رہے تھے مصلح قوم وملک تھے اپنے قلم گوہر رقم سے قوم و ملک کی اصلاح کر رہے تھے۔ اخلاقیات کی تعلیم سے قوم کی کمزوریاں دور کر رہے تھے"

(ابو عمر ذکریا بھاگلپوری اڈیٹر مومن گزٹ کانپور)

بنگال کے نامور فسانہ نگار شرت چندر چٹو پادھیا لکھتے ہیں۔

"رابندر ناتھ ٹیگور کی تو بات ہی اور ہے لیکن مختصر کہانیوں میں پریم چند کا مرتبہ بہت بلند ہے"

سری مہندر لکھتے ہیں۔

"ہندی میں گوسوامی تلسی داس کے بعد اگر کوئی مصنف عوام میں ہر دلعزیز ہوا ہے تو وہ صرف منشی پریم چند جی تھے" مرہٹی زبان کے مصنف پنڈت آنند راو جوشی جنھوں نے پریم چند کی کئی کتابوں کا مرہٹی زبان میں ترجمہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

"پریم چند ہندوستان کے اعلےٰ رہنمائے فن تھے اُن کے شاہکار دوسری زبانوں میں اسی شوق، دلچسپی اور احترام سے پڑھے جاتے تھے جیسے اُردو اور ہندی میں"

رائے بہادر شیام سندر داس سکرٹیری ناگری پرچارنی سبھا بنارس رقمطراز ہیں۔

"منشی پریم چند نے ہندی زبان اور لٹریچر کا مرتبہ بلند کیا ہے

آپ نے اسے معراج کی منزل تک پہونچایا ہے۔ آپ کی کتابوں کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ جاپانی زبانوں میں بھی ہوا ہے"۔

مسٹر سلیم جعفری لکھتے ہیں۔

"غرض منشی صاحب مرحوم اپنے فن میں کامل و یکتا تھے اور یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گراہم بیلی نے گو اپنی تصنیف تاریخ ادب اردو میں اس کا التزام کیا تھا کہ جو مصنف بقید حیات ہیں اُن کا ذکر نہ کریں گے پھر بھی وہ اردو کا افسانہ سُناتے سُناتے مرحوم کا ذکر کر ہی گئے"۔

منشی راج بہادر گگوڑہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی لکھتے ہیں۔

"سب سے پہلے مجھے موصوف کی چھوٹی کہانیوں سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ میرے خیال میں اس فن میں ہندوستان کیا دوسرے ملکوں میں بھی موصوف سے شاید ہی کوئی سبقت لے گیا ہو"

مولانا عبد الماجد دریا آبادی بی۔ اے لکھتے ہیں۔

"یہ رنگ تھے اور یہ ڈھنگ تھے کہ ایک گوشے سے چپکے سے پریم چند نمودار ہوتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کی کایا پلٹ کر گئے۔ دبے پاؤں خاموشی سے آئے وقت نہ شور پیدا ہوا نہ ہنگامہ لیکن جب گئے تو یاران بزم کا انداز ہی کچھ سے کچھ اور جب تک رہے نہ کسی سے جھگڑے نہ کسی سے اُلجھے، شکل آپ دیکھتے تو سادہ، بات چیت کرتے تو سادہ زبانے بس یہی معلوم ہوتا کہ شہر کے نہیں کسی قصبے کے معمولی پڑھے لکھے سے آدمی ہیں۔ اور زیادہ کرید اگر آپ نہ کرتے تو یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ ہیں

کس مذہب کے، رہے جب تک تو یوں رہے اور گئے تو ایک جدید اسلوب کی بنیاد رکھکر، صاحب طرز ہو کر"

مولانا عبدالماجد اپنے مضمون "پریم چند کی افسانہ نگاری" کو یوں ختم کرتے ہیں۔

"ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ، مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس برس کے بعد لکھیگا تو اس کا تیس پنتیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لئے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی، انصاری اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہونگی وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہونگے"

حضرت اعجاز لکچرار الہ آباد یونیورسٹی اپنی مختصر تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے منشی پریم چند کے دل و دماغ کو خاص طور سے افسانہ کے لئے بنایا تھا جس کا ثبوت منشی جی نے اس خوبی سے کیا کہ ابھی تک میدان افسانہ نویسی میں کوئی اُن سے آگے قدم نہیں رکھ سکا"

سید علی جواد زیدی پریم چند کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اپنا مضمون اس جملہ پر ختم کرتے ہیں:۔

"مختصر یہ کہ پریم چند کو کردار نگاری میں ید طولےٰ حاصل ہے"

سید مقبول حسین صاحب احمد پوری بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی نے "پریم چند کا اُپدیش" کے نام سے ایک طولانی مقالہ لکھا اُس میں کئی

ناولوں پر مختصراً تبصرہ کرکے اُن کی کماحقہ داد دی ہے۔ ناول پردہ مجاز کے متعلق لکھتے ہیں کہ بمنزلہ صحف الہامی کے ہے۔
اخبار پائنیر میں ایک نقاد فن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اُن کے متعدد ناول انگریزی زبان کے کامیاب ناولوں کے ہم پلہ ہیں۔
"ہندوستانی ادب پر پریم چند کے بڑے احسانات ہیں انھوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جاکر دیکھا انھوں نے بے زبانوں کو زبان دی اور اُن کی بولی میں بولنے کی کوشش کی"
"پریم چند کے نزدیک آرٹ ایک کھونٹی تھی حقیقت کو لٹکانے کے لئے سماج کو وہ بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے اور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ اُن کی زندگی کا مشن ہو گیا تھا" پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے وقتی مسایل کی اہمیت کو انھوں نے اِس شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ فن کے معیار کو اِس پر قربان کر دیا۔ افسانہ نگاری میں اُن کا وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں حالی کا دونوں پیش رو تھے دونوں پیغمبر تھے دونوں بیداری کے نقیب تھے شخصی حیثیت سے بھی ایک دوسرے کے قریب تھے۔ سادگی کے رسیا اور اخلاق کے پجاری انھوں نے زندگی کی کامرانی کا پیغام سنایا اسی میں عمر گزری اور سختیاں جھیلیں اور شہادت کے درجے کو پہونچے"

در رسالہ اُردو اکتوبر ۳۶ء

"منشی پریم چند کو شاہنشاہ ناول نویسان کا خطاب دیا گیا ہے۔ واقعی اُنھوں نے افسانوں اور ناولوں کی جلدوں پر جلدیں لکھکر ہندوستانی ادب کو لٹریری دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِن ناولوں اور کہانیوں نے پریم چند کو دُنیا کے بڑے بڑے مشہور فسانہ نگاروں ٹالسٹائی، موپساں، ٹیگور، اور ہنری اور کپلنگ کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اِن کے افسانوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کے سب سے بڑے افسانہ نویس تھے۔

(رسالہ نیو ریویو دسمبر ۱۹۳۶ء)

فلمستان لاہور لکھتا ہے۔

"وہ قابل مثال اہل کمال تھے جب تک وہ اُردو میں لکھتے تھے اُردو دُنیا کے بادشاہ بنے رہے۔۔ " " " "

" " " " " " " " " "

وہ عظیم الشان صاحب فن ادب میں طرز خاص کے اُستاد، موجد فن، مصور جذبات تھے اُنھوں نے ادب کے لئے جو کچھ کیا وہ فراموش نہیں ہو سکتا۔

پریم چند کے بعض حکیمانہ اقوال

(۱) ہندو مذہب کی بنیاد حسن خدمت، ایثار، رحم اور تہذیب نفس پر ہے۔

(۲) مذہب روح کے لئے ایک نیدش ہے۔
(۳) یہ مادیت ہمیں روحانیت کی طرف لے جائے گی۔ نظام زندگی کو خود مشیت پلٹا دیتی رہتی ہے۔ (پردہ مجاز)
(۴) مذہب کو تولنے کے لئے عقل اتنی ہی بیکار ہے جتنا بیگن کو تولنے کے لئے سنار کا کانٹا یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں یا پھر اُس میں زبردست تاریکی ہے کہ عقل کو نظر ہی نہیں پڑتا۔ (چوگان مفتی)
(۵) سورگ اور نرک کے خیال میں وہ رہتے ہیں جو کاہل ہیں مردہ ہیں ہماری دوزخ اور بہشت سب اسی زمین پر ہے۔ ہم اس دار عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں (نوک جھونک)
(۶) نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے۔ (لاال فیہ)
(۷) پریم وہ پیالہ نہیں جس سے آدمی جھک جائے (پردہ مجاز)
(۸) یہ عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے بدی میں اتنی ہی رغبت۔ عالم عالم کو دیکھکر، سادھو سادھو کو دیکھکر جلتا ہے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر جواری جواری کو دیکھکر شرابی کو دیکھکر چور چور کو دیکھکر ہمدردی بتاتا ہے ....
بدی سے سب نفرت کرتے ہیں۔ اِس لئے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے نیکی کی ساری دُنیا تعریف کرتی ہے اس لئے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے (فردوس خیال)

(۹) نوجوانی اور زندہ دلی کا تعلق مزاج سے ہے۔

(۱۰) قناعت کی گھر بلو زندگی دُنیا کی بہترین نعمت ہے۔

(۱۱) سہاگن عورت کے لئے اُس کا شوہر دُنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے وہ اسی کے لئے جیتی اور اسی کے لئے مرتی ہے اس کا ہنستا بولنا اسی کو خوش کرنے کے لئے اور اس کا بناؤ سنگار۔ اُسی کے لبھانے کے لئے ہوتا ہے اُس کا سہاگ اُس کی مسرت اور زندگی ہے اور سہاگ کا اُٹھ جانا اُس کی زندگی اور جانداری کا خاتمہ (جلوہ ایثار)

(۱۲) مصائب کا اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے آزمائشیں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں اور انہیں سے آدمی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

(۱۳) علم و ذہانت فہم و فراست اور دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنا دینا چاہیئے۔

(۱۴) شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ درد کے ہوں یا مسرت کے اُسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں جب ہم درد یا مسرت کا مزہ چکھتے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد اُن کا زبان قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے (جلوہ ایثار)

(۱۵) انسان کا دل ایک راز سربستہ ہے کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے کبھی صدہا بیگناہوں کے خون پر اُف تک نہیں کرتا اور کبھی بچے کو دیکھکر رو دیتا ہے (جلوہ ایثار)

(۱۶) ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطہ کا بیر ہے اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ اِس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دِل نہیں چراغ کا کام جلنا ہے چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں
(ادیب کی عزت)

(۱۷) شباب انسانی زندگی کی معراج ہے۔ طفلی میں اگر ہم سنہرے خواب دیکھتے ہیں تو شباب اُن خوابوں کی تفسیر ہے (پردہ مجاز)

(۱۸) عہد طفلی کے بعد ایسا زمانہ آتا ہے جب ایک بیجا جنون سر پر سوار ہوجاتا ہے اِس میں، شباب کا مستقل ارادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک زبردست اُمید آفرینی جو مشکل کو آسان اور ناممکن کو ممکن سمجھتی ہے۔ (پردہ مجاز)

(۱۹) بچپن کا دوسرا نام سیلانی پن ہے (گوشہ عافیت)

(۲۰) انسان کا دِل لاکھ کی مانند ہے اِس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے، اُسے گرم کرکے ہم اُس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کرسکتے ہیں۔
(خواب وخیال)

(۲۱) انسانی فطرت نہ بالکل سیاہ ہوتی ہے نہ سفید ان دونوں رنگوں کا ایک عجیب اتصال ہوتا ہے (گوشہ عافیت)

(۲۲) اپنے دِل کو سمجھانے کے لئے دلائل کی کمی نہیں ہوتی۔ دُنیا میں آسان ترین کام خود کو دھوکا دینا ہے۔ قوم پرستی کے لئے آہنی استقلال اور زبردست روحانی طاقت درکار ہے تن پروری اور

قوم پرستی میں بعد المشرقین ہے۔

نسیم لکھنوی

ولادت ۱۸۱۱ء وفات ۱۸۴۳ء

پنڈت دیا شنکر نام نسیم تخلص پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے تھے لکھنؤ وطن تھا وہیں پیدا ہوئے۔ پستہ قامت، گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ بڑے ذکی، ذہین، بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ موزونی طبع کا جوہر بھی خداداد تھا۔ اُردو فارسی کی تعلیم پائی۔ اساتذہ لکھنؤ کی صحبتیں میسر تھیں۔ شاعری کا شوق ہوا۔ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ بہت جلد اپنے ہمعصروں میں امتیاز پیدا کر لیا۔ استاد کی نگاہ میں بھی وقار حاصل تھا۔ چکبست۔ لکھتے ہیں۔

"ایک مشاعرے میں نسیم نے مطلع پڑھا۔

منت دلا کسی کی نہ اصلا اُٹھائیے مر جائیے نہ ناز مسیحا اٹھائیے

آتش بھی اِس مشاعرے میں موجود تھے انھوں نے نسیم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میرا مطلع اِس کے آگے گرد ہے۔ مطلع آتش۔

جاں بخش لب کے عشق میں ایذا اٹھائیے بیمار ہو کے ناز مسیحا اُٹھائیے

"ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کہیں مشاعرے کی صحبت تھی یہ بھی وہاں موجود تھے۔ قبل مشاعرہ شروع ہونے کے شیخ ناسخ نے ایک مرتبہ اِن کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت جی ایک مصرع کہا ہے دوسرا

دوسرا مصرع نہیں سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے انھوں نے جواب دیا فرمائیے
ناسخ نے مصرع پڑھا ء

شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا

ان کے منہ سے یہ مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرع تیار تھا ء

تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

"اس مصرعے کا سننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اٹھے اور ہر طرف سے نعرہائے تحسین و آفرین بلند ہوئے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی لیکن نسیم نے ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرے میں ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع یہ تھا۔

جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

"پہلا مصرع کچھ مہمل سا تھا نسیم کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرع تو خوب ہے لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہیں وہ صاحب بھی کچھ جلے تن تھے ان کے کان تک یہ بات پہونچی تھی کہ جھلا کر بولے کہ اچھا اس سے بہتر مصرع کہہ دیجئے۔ یہاں تو مضامین ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے اسی وقت مصرع موزوں کر کے سنا دیا۔

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں ۔۔۔ جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

"نسیم کی مشاعرے میں دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہو گیا۔

"ایک روز آتش کے یہاں شاگردوں کا جمگھٹا تھا۔ رند، صبا، خلیل وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نسیم بھی موجود تھے۔ صبح کا سہانا وقت، برسات

کا موسم، مینہ برستا ہوا، عجیب کیفیت تھی موسیم بہار سے کچھ ایسی طبیعتیں
مست ہوئیں کہ شاگردوں نے آتش سے فرمائش کی کہ استاد اس وقت
غزل کہہ ڈالئے گو کہ آتش کا دل بجھا تھا لیکن طبیعت میں جوانی کا زور
بھرا تھا فی البدیہہ اشعار موزوں کرتے شروع کر دئے۔ اور کہا کہ لکھتے
جاؤ۔ جس غزل کا مطلع ہے۔

کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے	دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے

"وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے لہرائی
ہوئی تھی انھوں نے اِن اشعار کی تخمیس کرنی شروع کر دی جتنی دیر
میں آتش دوسرا شعر سوچتے یہ اِس عرصہ میں اُن کے پہلے شعر پر تین
مصرعے لگا چکتے تھے اور بعض مصرعے تو واقعی اس انداز سے نکالے ہیں
کہ اگر کوئی برسوں فکر میں سر بگریباں رہے تو اس سے بہتر مصرع نہیں لکھ سکتا
نہ لگ سکتا۔ آتش کے دو شعروں کی تخمیس تمثلاً لکھی جاتی ہے۔

نہ زخمی بدن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں	نہ خونی کفن ہیں نہ گھایل ہوئے ہیں
تمھارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں	لہو کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں

گل ولالہ وارغواں کیسے کیسے

کہ پردے میں کون اے صنم جلوہ گر ہے	کوئی جانتا ہے کسی کو خبر ہے
دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے	کہیں کچھ خیال اور کہیں کچھ نظر ہے

تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ شعر کی غزل پر مصرع لگائے ہیں۔ آتش کے

شاگردوں میں صباؔ سے ان سے بہت یارانہ تھا ان کے مرنے پر صباؔ نے ایک شعر کہا جو کہ واقعی دردِ دل کی تصویر ہے۔

اُٹھ گئے ہیں نسیمؔ جس دن سے
اے صباؔ وہ ہوائے باغ نہیں

لیکن اندر سے چشمک تھی چنانچہ ایک مشاعرے میں نسیمؔ نے رندؔ کی ایک مشہور غزل پر خمسہ پڑھا جس کا مقطع یہ تھا۔

وصل انساں کو پری زادوں کا ہو ہے دشوار
فائدہ کچھ نہیں تم مفت میں کیوں ہوتے ہو خوار

کہتے کہتے تو ہوئے تم کو نسیمؔ اب ناچار
عشق کو ترک کرو یا نہ کرو ہو مختار

نیک و بد ہم ہیں تمھیں رندؔ سمجھائے جاتے

اِس مصرع کا زبان سے نکلنا تھا۔

کہتے کہتے تو ہوئے تم کو نسیمؔ اب ناچار

دکہ رندؔ نے سرِ مشاعرہ تلوار کھینچ لی اور نسیمؔ سے بر سرِ پیکار ہونے کا ارادہ کیا نسیمؔ کے مزاج میں بھی بانکپن تھا یہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ تلوار پر نہ بھولنا یہاں ٹھیٹروں سے تلوار چھین لیتے ہیں۔ لیکن آفتاب الدولہ قلقؔ وغیرہ اِس مشاعرے میں موجود تھے اُنھوں نے بگڑی ہوئی طبیعتوں کو سنبھالا اور بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا اور رندؔ سے کہا بندہ نواز یہ تلوار کا مقام نہیں یہاں زورِ قلم سے کام لیجئے۔ اِس ہنگامہ آرائی کی وجہ یہ تھی کہ رندؔ جو کہ ایک رنگین مزاج اور عاشق تن آدمی تھے اِس زمانے میں ایک بارگاہ حسن کے اُمیدواروں میں تھے لیکن قسمت کی نارسائی سے منزلِ مقصود تک رسائی نہیں ہوتی تھی۔ تلون مزاجی

نے اس مایوسی کی حالت کو غیظ و غضب سے بدل دیا تھا۔ نسیمؔ نے اس خمسہ میں در پردہ اسی کیفیت کا اشارہ کیا تھا۔ رندؔ کے چوٹ کھائے ہوئے دل پر یہ طعن آمیز نصیحت گراں گزری اور اس معرکہ کا باعث ہوئی علاوہ بریں اس غزل میں رندؔ کا ایک شعر ہے۔

راستہ روک کے کہہ لونگا جو کہنا ہے مجھے　　کیا ملوگے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

نسیمؔ نے ایک صحبت میں اس شعر کا دوسرا مصرع پڑھا تو مذاقاً (ملوگے) تانیث کے ساتھ پڑھا یعنی۔

راستہ روک کے کہلونگا جو کہنا ہے مجھے　　کیا ملوگی نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا اور اس شعر کو لوگ اسی صورت پر پڑھنے لگے اڑتے اڑتے یہ خبر رندؔ کے کانوں تک بھی پہونچی حریفوں نے اصل واقعہ پر اپنی طرف سے اور حاشئے چڑھائے غرض کہ رندؔ کے دل میں اس واقعہ کی وجہ سے بھی ایک کاوش موجود تھی یہ بھی ان کے لئے نسیمؔ سے بگڑنے کی وجہ ہوئی۔ ایک موقع پر رند نے ایک شعر پڑھا۔

کیا ملا عرض مدعا کر کے　　بات بھی کھوئی التجا کر کے

نسیمؔ نے پہلا مصرع یوں بدل کر پڑھا۔ ع

فائدہ عرض مدعا کر کے

"اور کہا اب شعر بہتر ہو گیا اور لوگ بھی جو بیٹھے تھے اُنھوں نے بھی نسیمؔ ہی کی ایسی کہی۔ یہ امر بھی رندؔ کو ناگوار گزرا۔ نسیم کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرے میں تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے

ہوسکتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے کہ شاعرانِ لکھنؤ اِن پر مصرعے لگاکر بھیجیں۔ تینوں مصرعے ملاحظہ ہوں:-

۱۔ ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

۲۔ اِس لئے قبر میں رکھا اِنھیں زنجیر سمیت

۳۔ من میروم بہ کعبہ و دِل میرود بہ دیر

"اب اہلِ لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے کہکر بھیجے جائیں کہ دہلی والوں کو بھی یہاں کی شاعری کا قائل ہونا پڑے اگر مصرعے سُست ہوئے تو کرکری ہو جائیگی۔ غرض کہ تین شخصوں کو جو ہر طرح اِس کام کے لئے موزوں خیال کئے گئے ایک ایک مصرعے پر مصرع لگانے کا کام سپرد ہوا۔ پہلا مصرع ناسخ کو دیا گیا دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو۔ گو کہ اِس وقت اور بڑے بڑے شاعر موجود تھے مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قایم رکھنے کا شرف نسیم ہی کو حاصل ہوا۔ تینوں استادوں نے جی توڑ کر مصرع لگائے ہیں۔

ناسخ کا مصرع ہے۔ ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

آتش کا مصرع ہے۔ حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے
اِسلئے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت

نسیم کا مصرع ہے۔ دارم ز دین و کفر بہ ہر یک قدم دو سیر
من می روم بہ کعبہ و دِل میرود بہ دیر"

نسیم کا ادبی کارنامہ مثنوی گلزار نسیم ہے اُن کی غزلوں کا بھی ایک چھوٹا سا دیوان ہے۔ نسیم کی طبیعت کا خاص رنگ معنی آفرینی، بلند پردازی، نازک خیالی اور تناسب لفظی ہے یہی غزلوں میں نمودار ہے

اور اسی پر اُن کی مثنوی کی سر بفلک عمارت تیار ہوئی ہے اِن کی غزلوں
کے متعلق چکبستؔ لکھتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ نسیمؔ کا کلام آتشؔ و ناسخؔ و ذوقؔ و غالبؔ کے
کلام کا ہم پلہ نہیں ہے یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہیں ان کے برابر
کسی کو عروج نہیں حاصل ہوا لیکن غزلگوئی کے میدان میں نسیمؔ رندؔ و صباؔ
وغیرہ سے پیچھے نہیں ہیں تینوں اُستادوں کی ہمطرح غزلوں سے انتخاب
درج ذیل ہیں۔ جن غزلوں میں ایک ہی مضمون کے شعر ہیں وہ بھی
پہلو بہ پہلو لکھدئے گئے ہیں سخن شناس نگاہ انصاف سے دیکھیں۔

نسیمؔ۔ صہبا کشوں کی خاک ہے ہر اک مقام پر ۔ ساقی لنڈھا شراب کو مستوں کے نام پر

صباؔ۔ لائی ہے مجھ کو وحشت دل اس مقام پر ۔ ہنسنے کی جا ہے قیس کے سودائے خام پر

رندؔ۔ پڑتی ہے آنکھ جب میری میناو جام پر ۔ سو سو درود پڑھتا ہوں ساقی کے نام پر

نسیمؔ۔ دل سے ہر دم ہیں آواز بکا آتی ہے ۔ بند کانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

رندؔ۔ تیرہ و تار دھواں دھار گھٹا آتی ہے ۔ میکشو فصل ہے ہوش رُبا آتی ہے

نسیمؔ۔ گل ہوا کوئی چراغ سحری و بلبل ۔ ہات ملتی ہوئی پتوں سے صبا آتی ہے

رندؔ۔ جانب خانۂ خمار سے کیا آتی ہے ۔ لڑکھڑاتی جو باد صبا آتی ہے

نسیمؔ۔ چھولیا دھوکے سے دامان صبا تو نے کیا ۔ غنچہ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

رندؔ۔ یہ پتہ کوچہ کا اُس حور کے سن رکھ واعظ ۔ یوں نہیں چلتی ہے جنت کی ہوا آتی ہے

نسیمؔ۔ خم نہ بنکر خود غرض ہو جائے ۔ مثل ساغر اوروں کے کام آئے

رندؔ۔ دھوپ دن کی اوس شب کی کھائے ۔ آستان یار پر مر جائے

نسیم - آپ آہو چشم میں آہو نہیں ہم سے وحشت کی نہ لیجے آئیے

رند - مجھ سے بیہودہ نہ گرمی کیجئے ٹھنڈے ٹھنڈے آپ گھر کو جائیے

نسیم - جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

صبا - واعظ کے میں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا جام شراب لائے تو ساقی کدھر گیا

نسیم - روح رواں و جسم کی حالت میں کیا کہوں جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

صبا - مثل حباب بحر جہاں میں نہ دم لیا اِک موج تھا کہ میں ادھر آیا اُدھر گیا

نسیم - گزرا جہاں سے میں تو کہاں کے یار سے قصہ گیا فساد گیا درد سر گیا

صبا - اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم فتنہ گیا فساد گیا شور و شر گیا

نسیم - ہے رنج عشق میرے لئے میں برائے رنج خود بھی مٹے یقیں ہے جو مجھکو مٹائے رنج

صبا - دل ہے غذائے رنج جگر ہے غذائے رنج پیدا کیا ہے ہم کو خدا نے برائے رنج

نسیم - یا تنگی کنار تھی یا اب فشار قبر وہ ابتدائے عیش تھی یہ انتہائے رنج

صبا - آدم سے باغ خلد چھٹا ہم سے کوئے یار وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج

مثنوی گلزار نسیم کے متعلق چکبست لکھتے ہیں ۔

"غرض کہ گل بکاؤلی کا قصہ جو کہ نثر میں تھا اُس کو نظم کے سانچے میں ڈھالا پچیس برس کی عمر میں یہ مثنوی تیار ہوئی ۔ چونکہ گلہائے مضامین سے پُر تھی لہذا نام گلزار نسیم رکھا واقعی اِس گلزار کا کیا کہنا تھا ۔ ع

سینچا تھا جس کو خون جگر سے وہ باغ تھا

لیکن جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی اِس کا حجم بہت زیادہ تھا جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو اُنھوں نے کہا ارے بھئی اتنی بڑی

مثنوی کون پڑھے گا یا تم بڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤنگا اُستاد کی بات دل پر اثر کر گئی مثنوی کی نظرثانی کی جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے بلکہ جو مطلب چار شعروں میں ادا ہوتا تھا اُس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کیا اِس صورت پر گلزار نسیم کو خس و خاشاک سے پاک کیا اور آتش کے پاس لے گئے اُستاد نے شاگرد کی محنت پر آفریں کہی اور اصلاح کا قلم اُٹھایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض کہ آتش کی نظرثانی کے بعد یہ مثنوی ایک مشاعرے میں پڑھی گئی جس میں لکھنؤ کے تمام سر برآوردہ شعرا جمع تھے بعدازاں طبع ہوئی شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہات بک گئی۔ زمانے نے پورے طور سے قدر کی۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا اب گلزار نسیم کے بھی جابجا چرچے ہونے لگے جواہر سخن کے پرکھنے والے سمجھ گئے کہ مثنوی کیا کہی موتی پرودئے ہیں نسیم کو بھی شہرت عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی۔ اور واقعی حق یہ ہے کہ جب تک اُردو شاعری کا مذاق قایم ہے اُس وقت تک گلزار نسیم کی شادابی میں فرق نہیں آسکتا،،

آگے چلکر چکبست لکھتے ہیں۔

،، سخن شناس جانتے ہیں کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کے مقابلہ پر مثنوی کہی لیکن بالکل دوسرے رنگ میں کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن

کے خرمن کا خوشہ چیں نہیں کہہ سکتا اگر وہ اپنے رنگ میں فرد ہیں تو یہ اپنے طرز میں یکتا ہیں اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اٹھاتا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو اگر باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزار نسیم کی سیر کرو دیکھو فراق یار میں صدمہ کرنے کا مضمون ایک ہی ہے دونوں استادوں کی طبیعت اس مضمون پر برابر ہے مگر دونوں کے انداز سخن پر خیال کرو۔

میر حسن

روانی سی ہر سمت پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے رونے لگی
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کسی نے اگر بات کی بات کی
یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اسے
غرض غیر کے ہات جینا اسے

نسیم

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی
کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
گر گئی تھی جو ہوک پیاس لب میں
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ
کپڑوں سے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گزرے بے خور و خواب
زائل ہوئی اس کی طاقت تاب

صورت میں خیال رہگئی وہ | ہیئت میں مثال رہگئی وہ
آئے لگے بیٹھے بیٹھے چکر | فانوس خیال بنگیا گھر

دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں حق سخنوری ادا کیا ہے میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے شب ہجراں میں بیقراری کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی استعاروں کی شراکت، تشبیہوں کی پختگی سے مصنف کا زور طبیعت معلوم ہوتا ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے جہاں پہونچتے ہوے ہمارے طایر خیال کے پر جلتے ہیں"

در شاہزادے کے غائب ہوجانے پر میر حسن نے پس ماندہ لوگوں کی پریشانی کا حال اس صورت پر نظم کیا ہے۔

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں | جو دیکھا تو واں شاہزادہ نہیں
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی | کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی | کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہات دلگیر ہو | گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

....

ہوا گم وہ یوسف پڑی پھر یہ دھوم | کیا خادمان محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا | عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا
گئیں لے وہ شہ کو لب بام پر | دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر

جو دیکھی جگہ وہ جہاں سے گیا | کہا ہائے بٹیا تو یاں سے گیا
میرے نوجواں اب کدھر جائیے پیر | نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحر غم میں ڈبویا مجھے | غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

پھول کے غائب ہو جانے پر بکاؤلی کے اضطراب کی تصویر نسیم نے اپنے رنگ میں یوں کھینچی ہے۔

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے | کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل | جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے میرا پھول لے گیا کون | ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے | بو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل | سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا | شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورت بید | ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

بولی وہ بکاولی کہ افسوس | غفلت سے یہ پھول پر پڑی اُوس
آنکھوں سے عزیز گل میرا تھا | پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی ہیں | اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی ہیں
گلچیں کا جو ہائے ہات ٹوٹا | غنچہ کے منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل | مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلا | خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے | گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

"میر حسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں ایک کی زینت حسن صورت سے ہے دوسرے کی شان لطف معنی سے قایم ہے۔ میر حسن سخن آفریں ہیں نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے مگر اتنا کہنا نا انصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام میں ہے وہ نسیم کے کلام میں نہیں پایا جاتا مگر ما اینہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا نسیم کی مثنوی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب اِن کے طائر شہرت نے پر پرواز نکالے تو یہ کسی کے خرمن کے خوشہ چیں نہ خیال کئے گئے بلکہ خود صاحب طرز کہلائے"

"گلزار نسیم" کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا حصہ ہے تناسب لفظی ہے تناسب لفظی کی صفت ہمیشہ اُردو شاعروں کو پسند خاطر رہی لیکن کسی نے اِس کو اِس درجہ کمال پر نہیں پہونچایا جیسا کہ گلزار نسیم میں ہم دیکھتے ہیں، چند اشعار تمثیلاً لکھے جاتے ہیں۔

پردہ سے نہ دایہ نے نکالا | پتلی سا نگاہ رکھکے پالا
اِک مرغ ہوا اسیر صیاد | دانا تھا وہ طائر چمن زاد
پالا تو مفارقت ہے انجام | دانا ہے تو مجھ سے لے مرے دام

"لیکن اس قسم کے اشعار کل مثنوی میں دو فیصدی سے زیادہ نہ ملینگے لہذا قابل معافی ہیں"

گلزار نسیم وہ مثنوی ہے جو آپ اپنی مثال ہے اور جس نے اردو ادب کے خزانے کو بیش بہا دولت سے مالا مال کیا ہے۔ لیکن جس دن سے یہ مثنوی لکھی گئی نسیمؔ کے حاسد بھی پیدا ہو گئے اس حسد کی آگ سے نسیمؔ کی موت کا واقعہ بھی متعلق ہے کہا جاتا ہے کہ امجد علی شاہ کی محفل میں ایک دفعہ کسی طوائف نے نسیمؔ کی وہ غزل گائی جس کا مطلع ہے۔

جب نہ جیتے جی میرے کام آئیگی ۔۔۔ کیا یہ دنیا عاقبت بخشائیگی

جب مقطع کی نوبت آئی۔

جان نکل جائیگی تن سے اے نسیمؔ ۔۔۔ گل کو بوئے گل ہوا بتلائیگی

تو بادشاہ نے خوش ہو کر پوچھا کیا یہ اسی نسیمؔ کی غزل ہے جو گلزار نسیم کا مصنف ہے جواب دیا گیا ہاں حکم ہوا اُسکے دربار میں پیش کیا جائے حاسدوں نے کہا اُس کا تو انتقال ہو گیا۔ ایسے منحوس وقت اور منحوس زبانوں سے یہ لفظ نکلے کہ واقعی چند ہی روز بعد ہیضہ نے نسیمؔ کا خاتمہ کر دیا۔ اِس حسد کی وجہ صرف یہ تھی کہ مثنوی گلزار نسیم ایک ہندو کی کہی ہوئی تھی اور ابھی تک مثنوی کے میدان کے شہسوار میر حسن سمجھے جاتے تھے اب گلزار نسیمؔ نے ثابت کر دیا کہ۔

پر بحر سخن سدا ہے باقی ۔۔۔ دریا نہیں کار شید ساقی

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجے — سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے
سودا ہے میری بکاولی کو — ہے چاہ بہشتی کی باولی کو
سختی سہی یا کڑی اُٹھائی — اُستاد تھی جو پڑی اُٹھائی

(۵) اِس رنگ کے اشعار گلزار نسیم میں بکثرت ملینگے واقعی اِس رنگ کو خوب نباہا ہے اور یہ کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ۔ تناسب لفظی کی صنعت کا لطف یہ ہے کہ کسی مقام پر یہ نہ معلوم ہو کہ فلاں لفظ خواہ مخواہ شعر میں اِس لئے بھر دیا گیا ہے کہ دوسرے لفظ سے تناسب رکھتا ہے اور یہ لطف گلزار نسیم میں ہے ؎

سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

اِس مصرعے میں سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیت دکھا رہا ہے لیکن دونوں لفظ اِس خوبصورتی سے آئے ہیں کہ بالکل الگ دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں اور الگ بھی حالانکہ ایک کی رونق دوسرے کی وجہ سے دوبالا ہے لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سایہ کا لفظ خواہ مخواہ دھوپ کے لئے لایا گیا ہے۔"

(۶) اِس سلسلہ میں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ اکثر جگہ نسیم سے بھی تناسب الفاظ کے ساتھ لطافت سخن قایم نہیں رہ سکی ہے مثلاً کہتے ہیں۔

ان مختصروں نے جب دیا طول — بولی وہ بکاؤلی کہ معقول
پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل — پہونچا لب حوض سے نہ جنگل

نسیمؔ کے زمانے ہی سے اُن کے خلاف حاسدوں کی ایک جماعت قائم ہوگئی تھی جس کے وارث و جانشین نسلاً بعد نسلٍ اب تک چلے جاتے ہیں اِن لوگوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی کہ نسیمؔ کو گھٹایا اور مٹایا جائے اپنے دماغ کی قوت قلم کا سارا زور یہ حضرات نسیمؔ کی تخریب و تنقیص میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ یہ اسی تعصب اور حسد کا اُبال تھا کہ جب پنڈت برج نرائن چکبست نے ۱۹۰۵ء میں ایک نیا ایڈیشن گلزار نسیم کا مع اپنے دیباچے کے شائع کیا اور نسیمؔ کے جوہروں کو کماحقہ روشن کیا تو چکبست کی مخالفت میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ عبدالحلیم شررؔ اس کے بانی مبانی تھے جنھوں نے بڑے شدومد سے نسیمؔ کی دھجیاں اُڑانا شروع کیا اور تین عنوانات سے نقارہ جنگ بجایا۔

۱۔ گلزار نسیم آتشؔ کی تصنیف ہے۔

۲۔ گلزار نسیمؔ کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں۔

۳۔ گلزار نسیم لفظی و معنوی اغلاط سے پر ہے۔

چکبست نے بڑی قابلیت، تلاش اور تحقیق سے ان تمام باتوں کے جواب دئے اِس بحث میں ملک کے قریب قریب تمام ادیب شامل تھے اور عرصہ تک یہ بحث چھڑی رہی اور اب مباحثۂ گلزار نسیم یا معرکہ چکبست و شرر کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوچکی ہے۔ خوب ہوا کہ یہ معرکہ چھڑ گیا اور چکبست نے ہمیشہ کے لئے بہت سی بے بنیاد باتوں اور لغو دعاوی کا سدباب کردیا۔

میر حسن کے پرستار اور نسیم کے مخالفین کچھ بھی کہا کریں حقیقت یہ ہے اور اسی پر منصف مزاج سخن فہموں کا اتفاق رائے ہے کہ دونوں مثنویوں کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مقابلہ و موازنہ ہم جنس اشیا کا ہوا کرتا ہے۔ ان دونوں نظموں میں کوئی بات باہم مماثل و متشابہ نہیں اگر سحرالبیان کو ایک ایسا چمن کہا جائے جو اپنی قدرتی تازگی، لطافت اور رنگینی سے دلوں کو لبھاتا ہے تو گلزار نسیم کو ایک آراستہ و پیراستہ محفل کہنا پڑیگا یہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق شادابی چمن کو پسند کریں اور کچھ رنگینی محفل کو لیکن دونوں کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ انسانی تہذیب میں بزم و چمن دونوں اپنی اپنی مخصوص جگہ رکھتے ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

سحرالبیان اگر سلاست، روانی، بے تکلفی اور واقعہ نگاری میں فرد ہے تو نازک خیالی، معنی آفرینی شوکت الفاظ، چستی بندش، تناسب لفظی تشبیہات کی پختگی اور استعارات کی نزاکت میں گلزار نسیم کا جواب نہیں۔ اس کے اشعار کی ترکیب و ساخت ایسی مکمل اور مرصع ہے کہ الفاظ الماس و یاقوت

ل۵ مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں "ہمارے ملک سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی ایک سحرالبیان دوسرا گلزار نسیم اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔"

مولانا اصغر گونڈوی یادگار نسیم میں صفحہ ۱ پر لکھتے ہیں "دونوں مثنویوں کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں بھی طرز ادا اور انداز بیان کی مماثلت نظر نہ آئیگی"

کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو اپنے رنگا رنگ معانی سے بلاشبہ قوسِ قزح کی سی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں۔ دل و دماغ نگار خانے کی سیر کرنے لگتے ہیں اور روح کو تو اجابہ سم ہو جاتا ہے۔ میں چھٹے یا ساتویں درجے میں پڑھتا تھا اردو کی کتاب میں گلزارِ نسیم کا ایک انتخاب "مرغِ اسیر" کے نام سے شامل تھا اسکول میرے مکان سے کافی فاصلہ پر تھا۔ "مرغِ اسیر" کے اشعار نے مجھ پر ایک جادو کا اثر کر دیا تھا۔ ایک دو بار ہی پڑھنے سے کل شعر حفظ ہو گئے تھے جو آج تک نہیں بھولے ہیں۔ اسکول سے گھر واپس ہوتے ہوئے ایک ایک شعر عجیب محویت کے ساتھ دِل ہی دِل میں پڑھتا ہوا آتا تھا بلا مبالغہ وہ کیف حاصل ہوتا تھا کہ میں جھومنے لگتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ گلزارِ نسیم مثنوی کی مقررہ خصوصیات پر پوری نہیں اُترتی اسے مثنوی کہنا ہی صحیح مذاق سے بیگانگی ثابت کرنا ہے۔ بہتر ہے مثنوی نہ کہئے کوئی اور نام اِس نظم کو دے دیجئے لیکن اِس سے اِس کی خوبیاں نہیں مٹ سکتیں یہ انھیں گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ہے کہ عام و خاص سب میں مثنوی مقبول ہے اور ہمیشہ مقبول رہے گی اور یہ اِس مقبولیت ہی کا کرشمہ ہے کہ گلزارِ نسیم کے بے شمار اشعار ضرب المثل بنکر ہماری روزمرہ کے بول چال میں داخل ہو گئے ہیں اور خاص تو درکنار عام لوگوں کے لئے بھی اُن کی گھریلو زندگیوں میں یک گونہ دلچسپی کا باعث ہیں کون سی جماعت اور کون سا طبقہ ایسا ہے جس میں نسیم کے یہ سکے رواں نظر نہیں آتے۔

مثلاً آتا ہو تو ہات سے نہ دیجے   جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

ع۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

"۔ گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دے۔

"۔ تھوڑا لکھا بہت سمجھنا۔

"۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں   وغیرہ وغیرہ

نظم یا نثر کے ٹکڑوں کا اپنی دلچسپی کے باعث ضرب المثل ہو کر قوم کی گھریلو زندگی کا جزو بن جانا ادب کی انتہائی غایت ہے اُردو میں کس مصنف کو یہ بات حاصل ہے۔ ہندی میں یہ بات تلسی داس ہی کو حاصل ہے اور بہت بڑے پیمانہ پر۔

گلزار نسیم کی ایک اور بہت بڑی امتیازی خوبی یہ ہے کہ اُس نے خود معیار بنکر ایک دریائے فیض ضمناً اُردو میں جاری کر دیا اور ایک خاص میدان کھول دیا جس کو ہم نسیم کا اسکول کہہ سکتے ہیں۔ بحر ہزج مسدس مقبوض مقصور نسیم کی بحر ہی کہی جانے لگی اور اس بحر میں بہت سی مثنویاں اسی لئے لکھی گئیں کہ نسیم کے کمالات مصنفوں کے پیش نظر تھے منشی احمد علی شوق قدوائی آنجہانی نے اپنی مثنوی "ترانہ شوق" میں بقول خود گلزار نسیم کی تقلید کی۔ منشی اقبال ورما سحر نے دشینت اور شکنتلا کا واقعہ اسی بحر میں لکھا۔ منشی لشیشور پرشاد منور نے کئی ہزار ابیات میں بھگوت گیتا کا ترجمہ اسی بحر میں کیا اور نسیم کے فیضان کے اعتراف میں "نسیم عرفاں" اس کا نام رکھا۔ میں نے اپنی مثنوی پیام ساوتری اسی بحر میں

لکھی ہے اِس میں تقریباً بارہ سو اشعار ہیں۔ اِن مثنویوں میں نسیم کا رنگ نہ ہو مگر حق یہ ہے کہ اِن کا ثواب نسیم ہی کو پہونچتا ہے۔

اب یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ نسیم نے مثنوی کی عام روش سے کیوں انحراف کیا۔ یہ تو خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مثنوی کی عام تعریف اور اُس کی خصوصیات سے ناواقف تھے۔ پھر اُنھوں نے اپنے لئے ایک نئی راہ کیوں نکالی حقیقت یہ ہے کہ غیر معمولی ذہانت و ذکاوت ہمیشہ عمومیت سے اجتناب کرتی ہے ذہین اور ذکی طبیعتیں کبھی رسمی و رواجی، مبتذل اور پامال چیزوں پر نگاہ نہیں ڈالتیں اور ہمیشہ اپنے لئے نئی اور امتیازی روشیں اختراع کرتی ہیں اور صاحب طرز کہلاتی ہیں پھر یہ کیا فرض ہے کہ ہر بات میں لکیر کا فقیر بنا رہا جائے۔ اور مقررہ روشوں سے کسی معنی میں انحراف نہ کیا جائے اگر تقلید ہی دین و ایمان ہے تو لفظ ترقی بے معنی ہوا جاتا ہے۔ مگر ایسا نہیں طبیعتوں کی اُپج کے لئے کہیں کوئی زنجیر نہیں زندگی کے ہر شعبہ میں اِس کی مثالیں موجود ہیں ادب بھی اِس سے خالی نہیں۔ اُردو شاعری میں اِسی جدت پسندی نے غالبؔ کو غالبؔ بنا دیا اور غزل میں ایک نیا میدان کھول دیا ورنہ وہ کنگھی چوٹی اور بوس و کنار کے مضامین سے کبھی آگے نہ بڑھتی۔ نسیمؔ جانتے تھے کہ مثنوی کا قدیم رنگ میر حسن نے ختم کر دیا اب اِس کو زیادہ پامال کرنے میں کوئی خوبی نہیں اُن کی دشوار پسند طبیعت نے ایک مشکل رنگ اختیار کیا۔ ایک قصہ اُنھیں نظم کرنا تھا

منشي بنواري لال شعله

قصہ طول طویل تھا قلم اٹھایا اور بحر ہزج مسدس مقبوض مقصور میں تقریباً ڈیڑھ ہزار شعر لکھے۔ ایک ایک شعر کو اپنی جگر کاوی و دماغ سوزی سے موتی کی لڑی بنا دیا اور ایک ایک مرصع نظم کا لطف اس میں بھر دیا آپ اس کان جواہر کو مثنوی نہیں کہتے نہ کہئے لیکن خدا کے لئے اس کی خوبیوں پر تو خاک نہ ڈالئے۔

منشی بنواری لال شعلہ

ولادت ۱۸۴۷ء وفات ۱۹۰۳ء

حصار میں ایک بھٹناگر کایستھوں کا خاندان مدت سے آباد تھا ان کے یہاں قانون گوئی کا عہدہ وراثتاً چلا آتا تھا۔ یہ لوگ صاحب جائداد بھی تھے اور صاحب علم بھی۔ فارسی کا شوق تھا جس میں بعض اصحاب اہل تصنیف بھی گزرے انھیں میں منشی موتی لال منشی بنواری لال شعلہ کے والد تھے شعلہ ۱۸۴۷ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔ گندمی رنگ فراخ سینہ، کشادہ پیشانی گٹھے ہوئے جسم کے آدمی تھے۔ گھنی ڈاڑھی واضح چشم و بینی اور کشادہ چہرے پر بڑی زیب دیتی تھی خوش خلقی، خوش طبعی، بے ریائی اور قناعت طبیعت کے جوہر تھے۔ غصہ آتا تھا تو بس جھلا کر دل کو کدورت سے پاک کر لیتے تھے۔ سری کرشن جی کے بھگت تھے۔

اوائل عمری میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انتظام خانہ داری اور معیشت کی فکریں دامنگیر ہو گئیں پہلے دفتر بندوبست علی گڑھ میں

ملازم ہوئے۔ ملازمت کی پابندیوں کو طبیعت سے مناسبت نہیں تھی
اس لئے دست بردار ہو کر وکالت کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ ہی میں
وکالت شروع کی اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ابتدا میں اس پیشہ میں
بھی کچھ سرسبزی نصیب نہ ہوئی۔ آخر زمانے میں کچھ ترقی کی۔ فارغ البالی
کی صورت نکلی۔ ایک مکان بنوا لیا ایک مندر بنوا دیا زندگی کے باقی ایام
آسودگی سے کٹ گئے۔

پہلی بیوی کے انتقال کے کچھ روز بعد آپ نے دوسری شادی
کر لی لیکن یہ بیوی بھی چند سال بعد ہمیشہ کے لئے آپ سے رخصت
ہو گئیں۔ یہ دونوں صدمے آپ کو بہت شاق گزرے دونوں کی یاد
میں آپ نے نوحے لکھے ہیں جو بڑے دردناک ہیں۔ اولاد میں کوئی لڑکا
نہ تھا۔ ایک لڑکی تھی جو منشی کرشن گوپال صاحب ورما بی اے رئیس
علی گڑھ کو منسوب تھی سنہ ۱۹۰۳ء میں آپ نے بعارضہ نقرس انتقال کیا۔

تعلیم آپ کی مکتب میں ہوئی تھی علمی ذوق آبا و اجداد سے ورثہ
میں ملا تھا۔ خلقی ذکاوت و طباعی نے اسے اور ابھارا۔ ملکۂ شاعری بھی
قدرت سے عطا ہوا تھا۔ منشی بالمکند بے صبر شاگرد غالب سے کچھ روز
اصلاح لی۔ کبھی کبھی مرزا غالب کے مایۂ ناز شاگرد حضرت تفتہ سے بھی
مشورۂ سخن کرتے تھے۔ مگر یہ شاگردی کا سلسلہ مستقل اور دیرپا نہ رہا
یہی وجہ ہے کہ جہاں شعلہ کے یہاں شاعری کے اعلیٰ جوہر ملتے ہیں
وہاں بعض فاش عیوب بھی نظر آ جاتے ہیں جو بدنما ضرور معلوم ہوتے

ہیں لیکن عیوب سے کس کا کلام خالی ہے۔ کہیں پنہاں ہیں کہیں نمایاں۔

آپ کا کلام شاعری کی خوبیوں سے مالا مال ہے اور نہایت قابل قدر
آگرہ یونیورسٹی نے سنہ ۱۹۳۹ء کے ایم۔ اے کے نصاب میں اسے داخل کر کے
واقعی قدر دانی کا ثبوت دیا۔ ہندوؤں میں آپ کے کلام کو خاص مقبولیت
حاصل ہے۔ اِس کا راز آپ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو آپ نے اقلیم حسن کے
تاجدار مُرلی والے کی شان میں گائے ہیں۔ ایک دیوان غزلوں کا بھی ہے
جس میں کم وبیش دو ہزار اشعار ہیں مگر جس چیز نے اب تک آپ کا
نام زندہ رکھا ہے وہ کرشن کنھیا کی جاں بخش شیریں کاریوں اور سرور
انگیز کافر ماجرائیوں کے راگ ہیں۔ اِس کے علاوہ کچھ رباعیات ہیں
اور وہ نظمیں ہیں جو آپ نے کائستھ سبھا علی گڈھ اور بھارت دھرم
مہا منڈل کے جلسوں میں پڑھی تھیں۔ یہ سب بلحاظ ادب و شاعری
وقیع ہیں۔ میں پہلے غزلیات کو لیتا ہوں۔ آپ کی غزلوں میں
بلند پروازی، معنی آفرینی، نازک خیالی، ولولہ انگیزی اور جوش کے
بہت نمونے ملتے ہیں۔ طرز ادا میں شوکت و تجمل، برجستگی و دلکشی ہے
تشبیہات و استعارات بھی پختہ ہیں۔ بعض اوقات خوبصورت بندشوں
اور رنگین ترکیبوں سے شعر میں عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔ تناسب
لفظی کی صنعت بھی کبھی کبھی خوب برتتے ہیں اور جب صاف کہتے ہیں
تو بڑے مزیدار اور پُر اثر شعر کہتے ہیں۔ بلند پروازی کی مثال دیکھئے

میں جبہہ سا ہوں اُس درِ عالی مقام کا — کعبہ جہاں جواب نہ پائے سلام کا

سکہ رواں ہے کس بت محشر خرام کا — نقش قدم نگیں ہے قیامت کے نام کا

دوسرے شعر میں تناسب لفظی کی بھی رعایت ہے۔

—

آئی صبح ازل چاک گریبانوں میں — ورنہ پہلے تو ہمیں تھے تیرے دیوانوں میں

بلبل دل اپنا اُس گلزار پر دیوانہ ہے — گلشن ہستی جہاں کا سبزۂ بیگانہ ہے

گلشن ہستی کو سبزۂ بیگانہ سے استعارہ کرنا بہت خوب ہے۔

معنی آفرینی و نازک خیالی دیکھیے۔

ناتوانی میں سخت جانی ہے — ضعف بھی طاقت آزما نکلا

خورشید آسماں پہ گیا تو زمیں پہ ہے — میزان حسن میں تیرا پلہ گراں رہا

نگہت کو بلبلوں سے بھی ہیں پردہ داریاں — مانند بو ہے خلوت گل پیرہن میں کون

محشر بھی کوئی درد ہے جو اُٹھ کے رہ گیا — شکوہ بھی کوئی غم ہے جو دل میں نہاں رہا

اسی رنگ میں کیا خوب شعر کہا ہے۔

جینے میں کیا مزا جو نہیں موت کا یقیں — مرنے میں لطف کیا ہے جو وہ بدگماں رہا

محاکات کے نمونے یہ ہیں۔

شب بھر خیال گیسوے عنبر فشاں رہا — مہکا ہوا شمیم سے سارا مکاں رہا

خنجر پہ نظر ہے کبھی دامن پہ نظر ہے — کون آتا ہے محشر میں وہ گھبرائے ہوئے ہیں

ہوا بسی ہوئی آتی ہے مشک و عنبر میں — کھلی ہوئی تیری زلف خمیدہ مو تو نہیں

کبھی لفظوں کے اُلٹ پھیر سے بڑی رنگینی و معنویت پیدا کر دیتے ہیں۔

چھپا ہوا سا ہے طرز حجاب شوخی میں — کھلی کھلی ہوئی شوخی تیرے حجاب میں ہے

کبھی بات میں بات پیدا کرتے ہیں۔

کاٹ سکتے ہیں گلا خود بھی نہ کیجے ہمیں قتل   آپ کے ہات میں اک بات ہے یہ بھی سمجھے

ذیل کا مطلع کس شد و مد سے کہا ہے سبحان اللہ۔

کی میں نے آہ گرم جو فرقت کی رات میں   غل پڑ گیا کہ آگ لگی کائنات میں

صفائی کے نمونے یہ ہیں بعض میں شان مصوری بھی ہے۔

وہ چھپتے پھرتے ہیں گھبرائے کیا قیامت ہے   یہ کون عرصہ محشر میں بیقرار آیا
خاک عاشق ہے کہ اُٹھ اُٹھ کے قدم لیتی ہے   اور وہ جاتا ہے اُٹھائے ہوئے داماں کیسا
لگا رشک عدو کا داغ ناحق جان مضطر میں   تجھی پر کاش مرجاتے جو مرنا تھا مقدر میں
کیا زیست دو روزہ کے لئے آئے عدم سے   اس جینے میں مرنے کا بھی ساماں نہیں ہوتا
نہ کفن ہے نہ لحد ہے نہ جنازہ نہ مزار   شمع کیا ماتم پروانہ کا ساماں ہوگا
ہزار عرصہ محشر ہو سیر کے قابل   اُٹھیگا کون اگر لگ گیا قرار میں دل
یہ بیتابی نہیں تھوڑی یہ بیچینی نہیں تھوڑی   کریگا درد جانے اور کیا اس سے سوا ہو کر

دیوانہ شعلہ کا یہی رنگ ہے جس کے نمونے اوپر پیش کئے گئے دو چار غزلیں اور لکھتا ہوں۔

غزل

دل کی بساط کیا تھی جو صرف فغاں رہا   گھر میں ذرا سی آگ کا کتنا دھواں رہا
شب بھر خیال گیسوئے عنبر فشاں رہا   مہکا ہوا شمیم سے سارا مکاں رہا
کیا کیا نہ کاوشوں پہ میری آسماں رہا   بجلی گرائی مجھ پہ، نہ جب آشیاں رہا
محشر بھی کوئی درد ہے جو اُٹھکے رہ گیا   شکوہ بھی کوئی غم ہے جو دل میں نہاں رہا

خورشید آسماں پہ رہا تو زمیں پہ ہے — میزانِ حسن میں ترا پلہ گراں رہا
جینے میں کیا مزا جو نہیں موت کا یقیں — مرنے میں لطف کیا ہے جو وہ بدگماں رہا
کثرت حجاب دیدۂ عارف کبھی نہیں — ذروں میں ایک مہر کا جلوہ عیاں رہا
بیمار ہجر موت سے اُٹھکر لپٹ گیا — وعدہ پہ آیا جب کوئی تیرا گماں رہا
دل بھی گیا جگر بھی گیا جان بھی گئی — میں پھر بھی دیکھتا ہی تری شوخیاں رہا

اے شعلہ کیا طبیعت نازک پہ زور دوں
قدر سخن رہی نہ کوئی قدرداں رہا

ضبط فغاں سے آگئی ہونٹوں پہ جاں تلک — دیکھو گے میرے صبر کی طاقت کہاں تلک
غفلت شعاریاں یہ تغافل کہاں تلک — جیتا رہے گا کون ترے امتحاں تلک
وہ میری آرزو تھی جو گھٹ گھٹ کے رہ گئی — وہ دل کی بات تھی جو نہ آئی زباں تلک
گلشن میں آ کے تم تو عجب حال کر گئے — بھولے ہوئے ہیں مرغ چمن آشیاں تلک
پامال کر کے خاک اُڑانے سے فائدہ — ایسے چلو کہ میرا مٹا دو نشاں تلک
یاد آئے چھٹ کے دام سے صیاد کے کرم — بھولا دیا مجھ کو کوئی میرے مہرباں تلک

شعلہ کے بعد ختم ہے ایجاد طرز نو
کچھ لطف تھا سخن کا انھی خوش بیاں تلک

ہمیں پوچھنا ہے کہ تلک ارباب فن نے متروک کر دیا۔ شعروں کی خوبیاں دیکھئے۔

غزل

کون ہے تجھ سے جو دوچار نہیں — ایک میں ہی یہ گنہگار نہیں
ہائے فصل بہار و جوش جنوں — یاں گریباں میں ایک تار نہیں

سیکڑوں درد ایک نہیں درماں — لاکھ غم کوئی غمگسار نہیں
سب سہی گل بھی مے بھی مطرب بھی — تو نہیں ہے تو کچھ بہار نہیں
وصل کیا جب نہ ہجر کے ہوں مزے — وعدہ کیا جس کا انتظار نہیں
ہات آجائے آپ کا دامن — حشر کا بھی کچھ انتظار نہیں
کیا ثبات دو روزہ پر مر گئے — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

اُس کے کشتوں کا کیا پتہ شعلہ
کہیں تربت نہیں مزار نہیں

مُنہ سے تیرے سو بار کے شرمائے ہوئے ہیں — کیا ظرف ہے غنچوں کا جو اترائے ہوئے ہیں
کہتے ہیں گنو مجھ پہ جو دل آئے ہوئے ہیں — کچھ چھینے ہوئے ہیں مرے کچھ پائے ہوئے ہیں
خنجر پہ نظر ہے کبھی دامن پہ نظر ہے — کون آتا ہے محشر میں وہ گھبرائے ہوئے ہیں
لب پر ہے اگر آہ تو آنکھوں میں ہیں آنسو — بادل یہ بہت دیر سے گھرائے ہوئے ہیں

مے پیتے ہیں کیا ضد تھی کوئی زہر نہیں ہے
ہے تیری قسم شعلہ قسم کھائے ہوئے ہیں

نہ خون دل ہے نہ مے کا خمار آنکھوں میں — بسی ہوئی ہے تمہاری بہار آنکھوں میں
پھری ہیں پتلیاں بیگانہ وار آنکھوں میں — چھپا ہوا ہے کوئی پردہ دار آنکھوں میں
اُمید جلوہ دیدار بعد مرگ کہاں — بھری ہے یاس نے خاک مزار آنکھوں میں
دئے بغیر ترے باغ میں گلوں نے داغ — چبھوئے نرگس شہلا نے خار آنکھوں میں
الہی دیدۂ حیراں کھلا نہ رہ جائے — ٹھہر نہ جائے کہیں انتظار آنکھوں میں
وہ رونے والا ہوں شعلہ کہ بعد مرگ مرا — نباہیں مردم دیدہ مزار آنکھوں میں

شکر کو شکوہ جفا سمجھے | کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے
ہم تیری بات ناصحا سمجھے | کوئی سمجھے ہوئے کو کیا سمجھے
مرض الموت کو شفا سمجھے | درد کو جان کی دوا سمجھے
اس تڑپنے کا مدعا سمجھے | دل بدخو تجھے خدا سمجھے
کر دئے اک جہاں کے بت خود بیں | اے سکندر تجھے خدا سمجھے

شعلہ کل ہی تو میکدے میں تھے
آج تم کس کو پارسا سمجھے

یہ رنگ بڑا پاکیزہ ہے اگر مشق سخن جاری رہتی تو یقیناً یہ رنگ نکھر کر بہت دلکش ہو جاتا لیکن غزل سے آپ کی طبیعت ہٹ چلی اور ۱۸۸۶ء میں غزل گوئی بالکل ترک کر دی مگر جیسا کہ خود کہتے ہیں ع

شعلہ چھٹتا ہے کہیں شوق سخن تادم زیست

ذوق سخن نہ چھوٹا۔ غزل میں مضمون آرائی کے بجائے طبیعت کا ولولہ محبوب حقیقی کی نغمہ سرائیوں میں ظاہر ہونے لگا۔ سری کرشن جی کی بھگتی میں بالکل رنگ گئے۔ ڈوب ڈوب کے قلبی کیفیتوں اور حسن عالم افروز کی کرشمہ سازیوں کے ترانے سنانے لگے وہ ترانے جن پر روح وجد کرتی ہے۔ اس رنگ کی آپ کی ایک مستقل تصنیف "نزم بنواراین" ہے جسے پریم کے پجاری حرز جان بنائے رکھتے ہیں اور اس کے بعض حصوں کا بڑی عقیدت سے روزانہ پاٹھ کرتے ہیں۔ شاعری کے تمام جوہر اصلی آب و تاب کے ساتھ اس تصنیف میں نمایاں ہیں۔ جوش

رنگینی، مصوری، برجستگی، شدت و لطافت جذبات سبھی کچھ ہے۔ البتہ زبان میں ہندی کی آمیزش زیادہ ہے۔ اس کی وجہ ہے پریم اور بھگتی کی لطیف و شدید کیفیات مادری زبان کا سہارا لئے بغیر ادا نہیں ہو سکتیں۔ اگر "ارباب فن" اس کو نقص سمجھتے ہیں تو سمجھیں اُن سے کون تعرض کر سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نادر نمونے موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ "بزم برندابن" کی ابتدا اس جوش سے ہوتی ہے جیسے پہاڑ سے آبشار اُبلتا ہے۔

سری جگدیش برندابن بہاری
سری رادھا رمن مادھو مراری

سری گوبند رادھا کرشن گوپال
مدن موہن سری گھنشیام نند لال

سری مرلی منوہر شیام سندر
سری بھگوان گوپی ناتھ گردھر

سری جدبیت سری بانکے بہاری
چتر بھج شیام مورت چکر دھاری

مکٹ دھاری مدن گوپال موہن
نول سندر چھبیلے لال موہن

تو ہی ہے حسن رخسار حقیقت
تو ہی ہے پردہ بردار حقیقت

تو ہی ہے جلوہ فرمائے دو عالم
تو ہی ہے خود تماشائے دو عالم

تو ہی لوح طلسم جان و تن ہے
تو ہی بخشندہ روح و بدن ہے

تو ہی وحشت فزائے عشق رسوا
تو ہی نقش و نگار حسن زیبا

تو ہی ہے موجد ایجاد کونین
تو ہی ہے بانیٔ بنیاد کونین

تو ہی ہے رونق گرمیٔ بازار
تو ہی خود جنس تو ہی خود خریدار

تو ہی ہے نغمۂ بلبل چمن میں
تو ہی غنچہ تو ہی ہے گل چمن میں

تو ہی پروانہ تو ہی شمع محفل ۔ تو ہی گلبن تو ہی شور عنادل
زمین و چرخ مہر و ماہ تیرے ۔ دو عالم ہیں تماشاگاہ تیرے
فنا طرز خرام ناز کی آن، ۔ لقا اک لب کی تیرے مند مُسکان
بُت ست[1] چیت چولہ ماکھن گئے لٹیرے ۔ حیات و موت دونوں کھیل تیرے
نمود آفرینش ہے تجھی سے ۔ وجود آفرینش ہے تجھی سے
تو ہی خلاق ہے کون و مکاں کا ۔ تو ہی رزاق ہے ہر انس و جاں کا
الگ کب تجھ سے تیری گفتگو ہے ۔ غرض اک تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے
تو ہی ہے سب سے برتر سب سے بالا ۔ تو ہی ہے حال عصیاں سننے والا
ادھم بگڑے ہوئے لاکھوں سنوارے ۔ میری بھی ٹیر سن لے پران پیارے
شہنشاہ جہاں عالم پناہ ہے ۔ برائے خود سوے شعلہ نگاہ ہے

عرضداشت

عجب نہ ہے کچھ میری حالت کا اظہار ۔ سراسر ہوں ادھم پاپی گنہگار
نہ لائق التماس التجا کے ۔ نہ قابل اپنی عرض مدعا کے
ندامت نامۂ اعمال سے ہے ۔ خجالت آپ اپنے حال سے ہے
نکما ہوں نکمی زندگی ہے ۔ یہی ہستی کو خود شرمندگی ہے
نہ عقبےٰ کا نہ دنیا دیں کا ۔ عجب کچھ ہوں نہیں لیکن کہیں کا
اسیر بند دنیا ہوں سراسر ۔ گرفتار قفس بے بال و بے پر

---

[1] اس ترکیب پر ارباب فن مسکرا اٹھینگے مگر اس شعر کی لذت بھگتو سے پوچھیے۔ جگر بریلوی

وہ ننگ اختلاط آب و گل ہوں — کہ ربطِ جسم و جاں سے منفعل ہوں
وہ آوارہ، وطن جس نے نہ دیکھا — وہ بلبل ہوں چمن جس نے نہ دیکھا
الگ ہوں، دور ہوں سب سے جدا ہوں — عجب بیکس ہوں بے برگ و نوا ہوں
نہ کوئی چھوڑ جانے کی نشانی — نہ کوئی یادگار زندگانی،
نہ ذکر حق ہے نے فکر عمل ہے — نہ کرم و دھرم نے ودیا نہ بل ہے
نہ جوگی ہوں نہ سنیاسی جتی ہوں — نہ رند بادہ کش نے متقی ہوں
نہ زاہد ہوں نہ ہوں مست خرابات — نہ عابد ہوں نہ ہوں اہل کرامات
میری غفلت کی حد کچھ بھی نہیں ہے — خیال نیک و بد کچھ بھی نہیں ہے
نہیں چھونے کے قابل جسم ناپاک — ملیگی کس طرح سے خاک میں خاک
غرض جو کچھ ہوں سب تجھ کو خبر ہے — میرا انجام کیا مد نظر ہے
ہمیشہ سے گنہگاروں پہ رحمت — ہمیشہ ہے تیری بخشش کی عادت
کیا دشمن کا بھی اودھار تو نے — اُتارا ڈوبتوں کو پار تو نے
دیالو دین بندھو کے سہارے — تھکا بیٹھا ہوں منزل کے کنارے
نہیں اک وقت کا توشہ بغل میں — جھکا پڑتا ہے سر فکر عمل میں
کٹھن رستہ ہے اور منزل کڑی ہے — جو گٹھری سر پہ ہے بوجھل بڑی ہے
نہ رہبر کوئی راہ پُر خطر میں، — اندھیرا ہو گا ہر جانب نظر میں
بُرا ہے وقت وہ جس کا کہ ڈر ہے — سماں یہ ہے کہ جو پیش نظر ہے
دم آخر رواں آنکھوں میں ہو گا — کسی دن یہ سماں آنکھوں میں ہو گا
بدلتی ہوں محبت کی نگاہیں — ہر اک جانب ہوں حسرت کی نگاہیں

دم رخصت ہو گھر والوں نے گھیرا
کھڑا ہو سب لدا اسباب میرا

ہجوم اہل ماتم ہو سرھانے
عزیز و اقربا خویش اور یگانے

ہر اک کی ہو نگاہ حسرت آلود
کھڑی ہو بیکسی بالیں پہ موجود

میرے ہر کام باہم بٹ رہے ہوں
اُٹھانے والے بھائی چھٹ رہے ہوں

غرض سامان رخصت جب ہو تیار
پڑے جان اور اجل میں آکے تکرار

اُسے تعجیل ہو حکم قضا کی
اسے ہو ڈھیل عرض مدعا کی

وہ بپھری ہو کہ آگے دھر کے نکلوں
یہ مچلی ہو کہ درشن کرکے نکلوں

پڑا جھگڑا ہو کچھ آپس میں بھاری
وہ کیا بس اک تمہاری انتظاری

نظر آجائے چھب بانکی ادا کی
مُندیں آنکھیں تو ہو جھانکی ادا کی

تصور رشتہ جاں میں جکڑ لوں
چھُٹے تب نبض جب دامن پکڑ لوں

جب آئے آنکھ میں دم پران پیارے
لگا ہو دھیان چرنوں میں تمہارے

وہی ہو دھیان جس کو میں دکھاؤں
وہی جھانکی ہو جس کو میں بتاؤں

جھانکی

کدم کی چھانو ہو جمنا کا تٹ ہو
ادھر مرلی ہو ماتھے پر مکٹ ہو

کھڑے ہوں آپ اک بانکی ادا سے
مکٹ جھونکوں میں ہو موج ہوا سے

خمیدہ ناز سے ہو قد بالا
مکٹ گھیرے ہوئے ہو مہ کا ہالا

ستارے جھڑ رہے ہوں ہیبت سے
گتھی موتی کی لڑیاں ہوں مکٹ سے

کسی نازک کمر ہو کاچھنی سے
بندھی بنسی ہو جامہ کی تنی سے

بھری گجروں سے ہو نازک کلائی — بنے ہوں برگ گل دست حنائی
بڑی سنگھار کی ہو پھول مالا — گلے میں دست شوق برج بالا
برابر ہوں سری رادھا کشوری — مدھر سُر بانس کی بجتی ہو پوری
کمر اُلجھی ہوئی نازک کمر سے — ہوا اُلجھا پیت پٹ نیلامبر سے
مکٹ سے چندر کا ہالے سے ہالا — کڑوں سے ہار بن مالا سے مالا
لڑی بیسر سے اور مُکتا سے مکتول — لٹوں سے کریٹ کنڈل سے کرن ہو
اِدھر اُلجھے ہوئے بازو سے بازو — اُدھر اُلجھے ہوئے گیسو سے گیسو
صفائے رنگ سے آئینہ ہو زنگ — جھلکتا گور میں ہو شیام کا رنگ
تبسم ہو دم نظارہ باہم — عیاں اِک چھب میں ہو حسن دو عالم
جُدا ہوں گو برائے نام دونوں — بنے ہوں ایک رادھا شیام دونوں
بہمدیگر ہو عکس حسن زیبا — کنھیا رادھا ہوں رادھا کنھیا
جو ہو یوں حسن یکتا کا نظارا — بہار روئے زیبا کا نظارا
گرے گردن ڈھلک کر پیت پٹ پر — کھُلی رہ جائیں خود آنکھیں مکٹ پر
اگر اِس چھب کا آخر میں سماں ہو — میرا مرنا حیات جاوداں ہو
دوشالے کے عوض ہو برج کی دھول — پڑیں اُترے ہوئے سنگار کے پھول
ملے جلنے کو لکڑی برج بن کی — بنے اکسیر یوں پُھک کر بدن کی

غرض اِس طرح ہو انجام میرا
تمہارا نام ہو اور کام میرا

پنڈت رتن ناتھ سرشار

سرشار کا سن ولادت نہ معلوم ہو سکا۔ چکبست[۱] نے لکھا ہے کہ محمد علی شاہ کے آخری عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ چار برس کی عمر تھی جب والد پنڈت بیج ناتھ قضا کر گئے۔ ماں نے پرورش کی۔ سرشار بلا کے ذہین و طباع تھے۔ شوخی و طراری طبیعت میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی بذلہ سنج، حاضر جواب، آزادہ رو، آزاد منش، خندہ رو، بڑے بے تکلف اور بیباک شخص تھے۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے سرشار نے عملی طور پر ثابت کر دکھایا۔ خلقی خوش طبعی اور ظرافت سے خود ہمیشہ بشاش و خنداں رہتے تھے اور دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے تھے۔

تعلیم کی ابتدا یقیناً مکتب میں ہوئی ہوگی کہ مکتب ہی اس زمانے میں عام درسگاہ تھا۔ فارسی عربی کی کتب متداولہ پر عبور حاصل کیا لیکن کوئی فاضلانہ استعداد پیدا نہیں کی۔ حافظہ کی یہ حالت تھی کہ ہزاروں شعر اُردو فارسی کے ازبر تھے۔ صحت مذاق سے ان کو ہر محل استعمال کرتے تھے۔ انگریزی میں بھی کافی استعداد حاصل تھی۔ اس زبان کی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں پائی لیکن کوئی ڈگری حاصل نہیں کی راقم الحروف کے والد آنجہانی کے سرشار اسی کالج میں ہم سبق تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اُستادوں نے رتن ناتھ کو آزاد کر رکھا تھا۔ ننگے سر، بال بکھرے ہوئے، اچکن کے بٹن کھلے عجب لااُبالیانہ

---

[۱] مضامین چکبست صفحہ ۳۳

پنڈت رتن ناتھہ سرشار

اندازسے کلاس میں آتے تھے۔ پڑھنے لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا ایسی
میں کوئی ڈگری کیونکر ملتی۔ ان کو تو قدرت آزادہ روی، شوخی و بذلہ سنجی
میں یگانۂ روزگار بنا کر چمکانے والی تھی وہ سنجیدہ تعلیم کے کس طرح
متحمل ہو سکتے تھے۔

کسب معاش کے لئے پہلے کھیری اسکول میں مدرسی کی اسی زمانہ میں
مراسلہ کشمیر، اودھ پنچ، مراۃ الہند اور ریاض الاخبار میں مضامین لکھنے
شروع کئے۔ طبیعت میں انشا پردازی کا خداداد جوہر موجود تھا عربی
فارسی کی ضروری تعلیم حاصل کر ہی چکے تھے طبیعت کی شوخی اور شستہ
مذاق سے طرز تحریر میں ادبی شان کے ساتھ ساتھ دلکشی بھی پیدا کرلی
اور آپ کا انداز مطبوع ہونے لگا۔ مدرسی کا سلسلہ بہت دنوں قایم
نہ رہ سکا ۱۸۷۸ء میں منشی نولکشور نے اودھ اخبار کی ادارات آپ کو
سپرد کی۔ اپنی قابلیت اور زور قلم سے آپ نے اس اخبار کو چمکا دیا
۱۸۹۵ء میں حیدرآباد گئے۔ مہاراجا سرکشن پرشاد انجہانی کی قدردانی اور
جوہر شناسی نے خوش آمدید کہا دو سو روپیہ کے اس سرکار میں نوکر ہوگئے
مہاراجا صاحب نظم و نثر میں اصلاح لینے لگے۔ سرشار کی میکشاریوں اور
بے اعتدالیوں کے باعث یہ سلسلہ قایم نہ رہا۔ فکر معاش نے پھر ستایا
ان کی زندگی اطمینان اور آسودگی سے بسر نہ ہوئی۔ ادھر بادہ خواری کی
کثرت نے دماغ کو جلد کمزور کر دیا۔ صحت بھی خراب و خستہ ہوگئی۔ آخر
عمر میں بہت ضعیف و لاغر ہوگئے تھے حرارت غریزی کب کی فنا ہو چکی

تھی حرارت قلب بھی ایک دِن رخصت ہوگئی اور ۱۹۰۳ء میں پیام اجل آگیا۔

سرشار کی طرز نگارش مختلف اخباروں کی نامہ نگاری ہی کے زمانے سے پسندیدہ ہو چلی تھی لیکن ابھی اُس مشہور و معروف فسانہ کی ابتدا نہیں ہوئی تھی جو علم و ادب کی رہتی دُنیا تک اُردو کے لئے سرمایۂ افتخار رہے گا۔ اِس فسانہ کا آغاز کس طرح ہوا چکبست لکھتے ہیں۔

دراصل کیفیت[۱۵] فسانہ مذکور کی بنیاد پڑنے کی یوں ہے کہ جب حضرت سرشار کھیری سے لکھنؤ آئے تو یہاں شب و روز یارانِ دقیقہ رس، صبح نفس کی صحبت میں گزرتی تھی۔ اُس صحبت میں جہاں ایک سے ایک حاضر جواب وطرار موجود تھا وہاں منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ، پنڈت ترِبھون ناتھ ہجرؔ انجہانی بھی شریک ہوا کرتے تھے.... اِس صحبت میں ایک روز پنڈت ترِبھون ناتھ ہجرؔ نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھیئے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ ہنسیئے تو وہ ڈان کوئِک ذاٹ، ہے اگر اُردو میں اِس طرز کا فسانہ لکھا جائے تو خوب ہے۔ حضرت سرشار کے دِل پر اُس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اُردو میں ڈان کوئک ڈاٹ“ کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ اودھ اخبار میں ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شایع ہونے

---

[۱۵] مضامین چکبست صفحہ ۳۵ اور اُس کے آگے۔

لگے ۔ یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے
مثلاً کبھی محرم پر ایک مضمون نکل گیا کبھی جہلم پر کبھی عیش باغ کے
میلے پر۔ اُس وقت تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دس بیس مضامین
نکلکر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور حضرت سرشار کا بھی شاید یہی منشا ہو
مگر لوگوں کو یہ سلسلہ مضامین ایسا بھایا کہ اس کے قایم رکھنے کی کوشش
کی گئی ۔چنانچہ مختلف مضامین کی لڑیوں کو گوندھ کر فسانہ کا سلسلہ نکالا
ایسے مضامین میں جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت ہی کم تھا سلسلہ
پیدا کرنا آسان کام نہ تھا اور اصل تو یہ ہے کہ کامل سلسلہ پیدا نہ ہو سکا اگر
سلسلہ ہے تو اتنا ہے کہ اِس فسانہ کے رستم داستان میاں آزاد خانہ برباد ہر فن میں طاق
ہر کمال میں مشتاق ہیں جتنے علوم عقلی و نقلی ہیں اُن میں اِن کو مداخلت ہے
سپہ گری کے فن میں بھی برق ہیں۔ شاعر بھی ہیں حسن میں اگر یوسف ثانی کہئے تو
بجا ہے ۔ صبح ہوئی اور یہ بوے گل کی طرح گھر سے نکلے اور دُنیا بھر کی سیر پر
کمر باندھ لی ۔کبھی لکھنؤ کا محرم دیکھنے چلے آئے کبھی عیش باغ کے میلے پہونچے
کبھی کسی نواب کی دربار داری کی غرضکہ یہ جہانیاں جہاں گشت آدمی ہیں اِنکے
لئے کسی خاص ارادے یا مشغلے کی ضرورت نہیں ہے ۔

ہر صبح میزند چو شفق جوش خون ما   موقوف بر بہار نہ باشد جنون ما

"اس کوچہ گردی میں ایک روز اِن کی نگاہ ایک ناظورۂ ملایک فریب سے
لڑ گئی ۔ اِدھر سے پیغام وصال ہوا بعد ہزار ناز و نیاز اِس پری پیکر
نے جو کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون تھی اِس شرط پر ان سے

میں ایسے افسانے کا شایع ہونا بالکل ایک نئی بات تھی اس موقع پر اس امر کا اعلان بھی لازمی ہے کہ محض قصہ سمجھکر فسانۂ آزاد کی وقعت کا اندازہ کرنا سراسر نافہمی ہے اِس فسانہ کی دلچسپی کا انحصار اس کی داستان کے مسلسل ہونے پر نہیں ہے حضرت سرشارؔ نے اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے "

"مگر صرف اسس تہذیب کا خوشنما پہلو ہی نہیں دیکھایا ہے بلکہ اِس کے وہ عیوب بھی جو اِس کے جوہروں کو چھپائے ہوئے ہیں اور جو ہر تہذیب کے زوال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ظرافت کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں خصوصاً محلات کے طرز معاشرت اور بول چال کا وہ رنگ دکھایا ہے کہ باید و شاید۔ بیگمات کی نستعلیق چال ڈھال اور شستہ و پاکیزہ تقریر کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نوخیز اور کم سن لڑکیوں کی شوخی اور طراری کا عالم دِل پر بجلی گراتا ہے۔ ہر ایک بادہ جوانی سے سرشار ہے رگ رگ میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ایک ایک بات سے ہزار رنگینیاں پیدا ہیں، قدم قدم پر ناز و انداز قربان ہوتے ہیں مگر ایسی حیا پرور کہ فرشتے اِن کے دامن پر نماز پڑھیں۔ جہاں دیدہ بڑھیوں کی محبت آمیز بدگمانی اپنے رنگ میں لطف دے جاتی ہے اِن کی زبان سے جو نصیحت آمیز کلمے نکلتے ہیں وہ ادب اور سلیقے سے معمور ہوتے ہیں۔ ماما ئیں، مغلانیاں ہیں کہ ہوا سے لڑتی ہیں ضلع جگت میں طاق ہیں، زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے رستے چلتے لوگوں

شادی کرنا منظور کی کہ یہ روم جائیں اور سلطان کی فوج میں شریک ہوکر روس کے خلاف لڑیں۔ حضرت آزاد بھی اپنی دُھن کے پکے تھے سیدھے روم پہونچے وہاں سے سرخ رو ہوکر اپنی محبوبہ کے پاس آئے اور خوشی خوشی بیاہ رچایا۔ اصل قصہ "فسانۂ آزاد" اِسی قدر ہے مگر مصنف کے زور قلم کا یہ عالم ہے کہ پچیس سو صفحے اِس مختصر مطالب کے ادا کرنے میں صرف کئے اور داستان کی دلچسپی میں فرق نہ آیا۔ . . . .

. . . . حضرت سرشار کی یہ کیفیت تھی کہ چار آدمیوں میں بیٹھے باتیں کرتے جاتے ہیں اور وہی باتیں فسانے میں لکھتے جاتے ہیں مگر اِس انداز سے کہ عبارت کی شوخی اور مضامین کی تازگی میں سر مو فرق نہیں آتا واللہ کیا زبان پائی تھی کہ جو اِس زبان سے نکل گیا عالم کو بھایا اور تاثیر کا طلسم بن گیا"

۱۱ دسمبر ۱۸۷۸ء لغایت دسمبر ۱۸۷۹ء (یہ افسانہ) برابر شایع ہوتا رہا بعد ازیں ۱۸۸۰ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔ قدر دان سخن شوق کا دامن پھیلائے پہلے ہی سے بیٹھے تھے شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا لفظوں کی نئی تراش، ترکیبوں کی خوبصورتی، کلام کی گرمی، مضامین کی شوخی، طرز تحریر کی نزاکت جواب وسوال کی نوک جھونک، زبان کی پاکیزگی، محاورہ کی صفائی روزمرہ کی لطافت، ظرافت کی گلکاری تراشوں کی نئی پھبن، ایجادوں کے بانکپن نے لوگوں کو حضرت سرشار کا والہ وشیدا بنالیا اُردو

پرپھبتیاں کہتی ہیں نواب صاحب اپنے رنگ میں مست ہیں۔ عجب انداز سے شام کو چوک کی سیر کو نکلتے ہیں۔ گلے میں منت کے طوق پڑے ہیں۔ بازو میں امام ضامن کا روپیہ بندھا ہے۔ تین کم توئی کا چست انگرکھا زیب بدن۔ کمر کا عدم و وجود برابر ہے چوڑی دار پائجامہ پنڈلیوں سے چپکا ہوا ہے نکے دار ٹوپی البیلن سے سر پر رکی ہوئی ہے۔ پانچ چار افیونی مصاحب ساتھ ہیں خدمتگار کے ہاتھ میں خاصدان ہے اور بغل میں بٹیروں کی کابک دبی ہوئی ہے۔ غرضکہ اس صورت پر اس نگار بند معانی نے مختلف تصویریں مانی و بہزاد کے قلم سے کھینچی ہیں اور بیچ بیچ میں ظرافت نے ایسی گلکاری کی ہے کہ جس طرح اتنی بڑی داستان لکھنے میں مصنف کا قلم نہیں تھکا ویسے ہی پڑھنے والا نہیں تھکتا جہاں خوجی کی قرولی میان سے نکلی کہ پڑھنے والوں کی باچھیں کھل گئیں بہروپیے اور نواز عفران کے معرکے ہنستے ہنستے لٹا دیتے ہیں۔ اُردو میں حضرت سرشار اس طرزِ نو کے موجد ہیں اور اُن کا یہ فخر۔

اول بہ شگوں کرد طواف حرم ما ہر مرغ کہ پرزد بہ تمنائے اسیری

نہایت درست ہے۔ پُرانے زمانے کے فسانوں میں "فسانہ عجائب" پایہ عالی رکھتا ہے زندگی کے کل مرحلے روحانی قوتوں کی مدد سے طے کئے جاتے ہیں ان میں انسانی جذبات اور دانش و بینش کی وہ تصویریں نہیں پائی جاتیں جن سے فسانہ کی رونق و وقعت ہے"

فسانہ آزاد میں کچھ عیوب فنی بھی ہیں اول تو وہی ربط و تسلسل کا

فقدان جس کا چکبست نے اوپر اعتراف کیا ہے ربط و تسلسل ناول کے لئے لازمی ہے دوسرے کردار نگاری میں بھی کچھ دستور قدرت اور زمانہ کے خلاف باتیں ظہور میں آگئی ہیں مثلاً آزاد کا چال چلن عجیب گرب ہے۔ ابتداءً اُن میں دُنیا بھر کے تمام عیب موجود تھے لیکن حسن آرا کے عشق کی ہوا لگتے ہی الکدم اِن کی کایا پلٹ ہو گئی اور اِن کا ہر فعل و عمل تہذیب کا نمونہ بنگیا۔ حسن آرا خود اِسی بے عنوانی کا شکار رہے۔ اُس زمانے کی مسلم سوسائٹی میں ایسی تعلیم یافتہ، مغربی تہذیب کی دلدادہ اور روشن خیال عورت کا پیدا ہو جانا واقعات کے خلاف ہے۔ بعض محاورے بھی اپنے مصرف پر نہیں ہیں لیکن بقول چکبست ایسی لغزشوں کی ہستی اتنی بڑی کتاب میں ایسی ہے جیسے کسی قلزم زخار میں خس و خاشاک چکبست لکھتے ہیں۔

"مگر باوجود اِن عیوب کے جن کا ذکر سلسلہ وار کیا گیا ہے فسانۂ آزاد بہ حیثیت مجموعی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اِس کے جوہر اِس کے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہیں میرے دوستو! تحقیقات جدید سے ثابت ہوا ہے کہ آفتاب میں بھی سیاہ داغ موجود ہیں لیکن جس طرح یہ داغ آفتاب کی ضیا نہیں گھٹا سکتے اِسی طرح حضرت سرشار کی طبع نورانی باوجود اکثر خفیف عیوب کے قدردانان سخن کی آنکھوں کو ہمیشہ نور بخشتی رہیگی۔ ہاں جو لوگ تعصب سے شیرہ چشم ہو رہے ہیں وہ چاہے کچھ سمجھیں"

"حضرت سرشار صرف فسانہ نگاری کے موجد ہی نہیں بلکہ اردو کے
سب فسانہ نگاروں میں ان کا پایہ عالی تر ہے۔ آج کس کا منہ ہے کہ
دو صفحے ان کے رنگ میں لکھ سکے۔ ہندوستان میں آج جس قدر ناول
نویس موجود ہیں شاید بارش کے موسم میں اس قدر حشرات الارض بھی
نہ پائے جاتے ہوں گے لیکن سرشار میں اور ان میں زمین و آسمان
کا فرق ہے۔

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

"گو کہ ہم کو حضرت سرشار کے ساتھ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر
کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے مگر چونکہ اہل اسلام کے ایک خاص
فرقے میں آپ کی شہرت بہت ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
دونوں کے طرز تحریر کا مقابلہ کیا جائے انشاپردازی کے میدان میں
سرشار شرر سے کوسوں آگے ہیں۔ شرر کی عبارت سلیس و پاکیزہ
ضرور ہوتی ہے مگر جدت سے خالی وہ بات کہاں کہ ہر حرف اپنے
دامن میں رنگین ادائی کے پھول لئے ہوئے ہے۔ ان کی نثر ہر مقام پر
نان بے نمک و شیر بے شکر ہے۔ ذیل کے اقتباس تمثیلاً درج ہیں
شرر۔ موجودہ زمانے اور مغربی تہذیب نے پنکچولٹی (پابندی وقت)
کا سبق ایک حد تک سب ہی کو دیدیا مگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا
تو ہمارے مشرقی دلربائوں اور ایشیائی معشوقوں نے۔ وہ آج بھی
ویسے ہی (وعدہ) فراموش ہیں جیسے سو دو سو برس پہلے تھے.......

عنفوان شباب کی خود پرستی انھیں اِس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی
کہ اسیر زلف گرہ گیر کے نالہ شبگیر پر چھوٹوں بھی ترس کھائیں۔۔۔۔۔۔۔
مگر عاقبت اندیش عاشق ایک فلک دوز آہ کے ساتھ کہتا ہے در کیا مضائقہ
ہو زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" اور پہلے سے زیادہ ذوق وشوق
کے ساتھ پہلے سے زیادہ عشق بازی پر آمادہ ہوتا ہے (دلگداز ۱ے
جلد ۲، مطبوعہ جنوری ۱۹۰۰ء)
سرشار۔ مجنوں سے کسی ساربان نے کہا کہ میاں دشت نوردی کیوں
کرتے ہو۔ لیلیٰ تمھارے ہتھے چڑھے

ایں خیالست ومحالست وجنوں

مجنوں نے ہنسکر کہا تو اس پھیر میں نہ پڑ تجھے معشوقوں کے عشوے
اور غمزے سے کیا سروکار۔ تو شتر غمزے کا عادی۔ جا اپنے اونٹ چرا
دردلم عشق زلیلیٰ کافیست   خواہش وصل زنا انصافیست
مضامین کے راستے میں شرر کا راستہ بالکل الگ ہے۔ شرر تاریخی
ناول لکھتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ جب اُنھوں نے اِس کوچے میں قدم
رکھا تو اپنی قوت تحریر اور طباعی کا کافی طور پر اندازہ نہ کر لیا۔ اولاً تاریخی
فسانہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو کہ تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو۔ ثانیاً
یہ کہ شاعر کا دماغ اپنے ساتھ لایا ہو یعنی جس زمانے کا ناول لکھے اُس زمانے
کی طرز معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ انگریزی
زبان میں جن فسانہ نگاروں نے اس قسم کے فسانے لکھے اُن کی رگ رگ

تاریخ ماضیہ کے عشق سے معمور تھی وہ تاریخ کے لئے پیدا ہوئے تھے اور تاریخ
اُن کے لئے ۔ حضرت شررؔ ایسے واقعات قدیم کی نسبت ناول لکھتے ہیں جن کا
تعلق تاریخ یورپ سے ہے لیکن یورپ کی کسی زبان میں دستگاہ عالی نہیں
رکھتے ۔ صرف ترجموں سے اپنا مطلب نکالتے ہیں اس حالت میں اِن کا تاریخی
علم مکمل نہیں ہو سکتا ۔ نہ وہ قدیم زمانے کی سوسائٹی کے رمز و کنایہ کافی
طور سے سمجھ سکتے ہیں ۔ علاوہ بریں قلم میں بھی وہ جادو نہیں جو زمانہ دیرینہ کے
مردہ قالبوں میں جان ڈال دے ۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کے فسانے روکھے
پھیکے ہیں ۔ اِن میں صرف تاریخی واقعات درج ہیں مگر جس زمانے
کا وہ اشارہ کرتے ہیں اُس زمانے کے طرز معاشرت کا رنگ نہیں کھلتا
شررؔ کے ناولوں کے سپاہی انگریزی فوج کے سپاہی ہیں جن پر صرف عرب کا
لبادہ لاد دیا گیا ہے ۔ شررؔ کے مقابلہ میں سرشارؔ کی فسانہ نگاری کا دائرہ
ضرور محدود ہے ۔ وہ صرف لکھنؤ کی سوسائٹی کا مرقع نگار ہے لیکن وہ
اِس سوسائٹی کے رگ و ریشہ سے واقف ہے اِس کا ہر نیک و بد پہلو
اِس کی نظروں میں کھنچا ہوا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جس حالت کو بیان
کرتا ہے اُس کا سماں بندھ جاتا ہے وہی کیفیت آنکھوں کے سامنے
پھر جاتی ہے ۔ وہی آوازیں کانوں میں آنے لگتی ہیں ۔ اِس کے فسانوں
کی مخلوق جیتی جاگتی تصویریں ہیں ہم اُس کا فسانہ پڑھتے ہوئے اُس کو
بھول جاتے ہیں اور جو کیفیت وہ بیان کرتا ہے اُس میں ہمہ تن
محو ہو جاتے ہیں ۔ اور واقعی فسانہ نگار کے کمال کا معیار بھی یہی ہے

برخلاف اس کے شررؔ کے فسانوں کی مخلوق یہ دلچسپی نہیں پیدا کرتی۔ اگر وہ بولتے ہیں تو مصنف کی آواز سے اور دیکھتے ہیں تو اُس کی آنکھ سے۔ مکالمہ میں یہ تمیز نہیں ہوتی کہ آدمی بول رہا ہے کہ فونوگراف سے آواز نکل رہی ہے۔ دیکھو خوجی اور مہراج بلی کا ذکر لوگوں میں اس طرح ہوتا ہے جیسے اصل آدمیوں کا۔ مگر شررؔ کی طبع فکر نے ایک مخلوق بھی ایسا نہ پیدا کیا۔ غرضکہ فسانہ نگار وہی کیفیت پیدا کر سکتا ہے جس سے اُس کو کماحقہٗ آگاہی حاصل ہو۔ سرشارؔ جب خود اس اصول سے ہٹے ہیں تو دھوکا کھایا ہے مثلاً کامنی میں اُنھوں نے ہندوؤں کے طرز معاشرت کا رنگ دکھانا چاہا ہے مگر چونکہ وہ خود اس رنگ سے ناآشنا تھے لہذا جس جگہ اُنھوں نے ہندو عورتوں کی چال ڈھال اور گفتگو کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے اُن کا قلم چلتے چلتے رُک گیا ہے۔ مجبور ہو کر اس مرقع میں بھی اسلامی تہذیب کا رنگ بھرنا پڑا ہے۔ ہندو طرز معاشرت کی تشریح میں درپردہ اسلامی جھلک نظر آتی ہے یا یوں کہو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خاتونوں کو ہندوانہ لباس پہنا کر تصویر کھینچی ہے۔ یہ نقص جو سرشارؔ کے ایک ناول میں ہے شررؔ کے کل ناولوں میں زیادتی کے ساتھ موجود ہے۔ آخر میں یہ کہنا نامناسب نہیں کہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو شررؔ اور سرشارؔ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ گو کہ شررؔ کی شہرت سرشارؔ سے کسی حالت میں کم نہیں لیکن یہ امر اس حکیمانہ اصول کی تائید کرتا ہے کہ محض شہرت کو اصلی لیاقت کا معیار نہ سمجھنا چاہئے۔"

فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار نے اور بھی بہت سے ناول لکھے۔ کامنی خدائی فوجدار، سیر کہسار، جام سرشار، منشو کرم دھم، بچھڑی ہوئی دلھن، طوفان بے تمیزی مگر ان میں فسانۂ آزاد کی سی شوخی، تازگی اور دلفریبی نہیں اور بعض تو بہت پھیکے ہیں۔ چکبست نے اپنی زبان میں اس تنزل کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "آب آتشیں نے دماغ ہی میں آگ لگا دی تو گلہائے مضامین بھی آتشبازی کے پھول ہو کر رہ گئے۔ طبیعت بجھ گئی کلام میں گرمی باقی نہ رہی" یہ ضرور ہے کہ دماغ کی قوت و صحت پر تمام انسانی ترقی کا دارومدار ہے اور سرشار کے دوسرے ناولوں کی بے کیفی کی ذمہ دار ایک حد تک بادہ انگور بھی ہو سکتی ہے جس نے اُن کے دماغ کو کمزور کر دیا لیکن اِس انحطاط کا اصلی سبب یہ تھا کہ سرشار کی اُفتادِ طبع نے جس میدان میں اُن کے اشہب قلم کی باگ موڑی وہ اتنا وسیع اور متنوع نہیں تھا کہ وہ فسانۂ آزاد سے آگے بڑھ سکتے یا ترقی عمر کے ساتھ ساتھ اُس میں بھی ترقی کرتے رہتے اپنے رنگ خاص میں فسانۂ آزاد میں اُن کا آفتاب نصف النہار تک پہونچ گیا اس کے بعد زوال ہی کا دور تھا۔ ظرافت کی راہیں اتنی وسیع اور گوناگوں نہیں جن میں تمام عمر کوئی ترقی کرتا رہے جس شخص میں یہ جوہر ہی نہیں اُس کا ذکر ہی نہیں لیکن جو اس وصف سے متصف ہے وہ جلد اس میں کمال حاصل کر سکتا ہے اور یہ کمال یہیں تک ترقی کر سکتا ہے کہ بات میں بات پیدا کی جائے۔ نکتے میں نکتہ نکالا جائے

عبارت کو بذلہ سنجی کے کھراد پر اُتارا جائے اور بس۔ سرشار کے پاس اس ملکہ کا جتنا ذخیرہ تھا بکمال خوبی و خوش اسلوبی فسانہ آزاد میں صرف ہو گیا اس کے پڑھ لینے کے بعد جب اُن کے دوسرے افسانے پڑھے جاتے ہیں تو اُن میں اسی کے فقروں، محاوروں، اور ترکیبوں کی آوازِ بازگشت سُنائی دیتی ہے اور اُس کی کیفیتوں کے بدلے بدلائے نقشے نظر آتے ہیں۔ سرشار کے لئے اس سے کسی طرح مفر نہیں تھا اُن کے قلم و فکر کی جولانگاہ ہی محدود تھی جس سوسائٹی کی کیفیتوں کی مرقع نگاری وہ کر رہے تھے اُس میں اتنی جان اور وسعت ہی نہیں تھی کہ وہ فسانہ آزاد کے رنگ سے ہٹ کر یا اُسی رنگ کو اور زیادہ چمکا کر کوئی کمال دکھا سکتے اس رنگ میں بس فسانہ آزاد ہی اپنا جواب رہا۔

سرشار کو موزونیٔ طبع کا جوہر بھی قدرت سے عطا ہوا تھا مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے چکبست لکھتے ہیں۔

"حضرت سرشار کا کلام عاشقانہ اور رندانہ طرز کا ہوتا تھا۔ مگر طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی عجب عالم دکھاتی تھی اکثر مضمون آفرینی کی طرف بھی جھک پڑتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ مشاعرے میں ایسا شعر پڑھا کہ مشاعرہ اُلٹ گیا۔

حال سب میری سخت جانی کا ۔۔۔ باڑھ کہتی ہے مُڑ کے خنجر سے

واقعی کیا نازک خیالی اور باریک بینی کی داد دی ہے۔ ایک اور شعر ان کا انھیں کے حسب حال یاد آگیا۔

پینے پہ جب آئے ہیں تو پھر بس نہیں کرتے میخانے میں سنتے نہیں سرشار کسی کی

جب پنڈت کشن نراین صاحب در کے ولایت سے واپس آنے پر قوم میں طوفان بے تمیزی برپا ہوا تو اُس کے فرو کرنے کے لئے ایک مثنوی تحفہ "سرشار" کے نام سے لکھی۔ دیکھو تمہید کس مزے کی ہے :"

لندن کی پلا دو آتشہ مے آ پیر مغاں کدھر چھپا ہے
ہُن برسے گا میکدے پہ اے یار رندوں کو جو تو کرے گا سرشار
دا تا پلوا شراب اچھوتی خوشبو خوش رنگ، تیز چوکھی
کوثر کی کھنچی نہیں ہے منظور لیڈی وائن جیسے پیئے حور
سر جوش شراب ناب لادے بوتل منہ سے میرے لگادے
بدمست ہوں پیکے ایک چلو زاہد کو بنائیں خوب اُلو
گھنگھور گھرا ہے آج بادل میخانے کو کردے تو بھی جل تھل
برسادے شراب ناب ساقی دکھلادے آفتاب ساقی
فتوے کاشی کا کون مانے لاکھوں میں بیٹھوں کھلے خزانے
رم جھم یہ برس رہا ہے پانی بے مے ہے حرام زندگانی

ایک مقام پر صبح کا عالم یوں دکھایا گیا ہے۔

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح
تارے چھپتے ہیں جھلملا کر ہے نور سا جلوہ گر فلک پر
بھینی بھینی مہک گلوں کی اور نغمہ زنی وہ بلبلوں کی
اے ساقی مہ لقا بدہ مے اے مرد خدا بخواب تا کے

وقت سحر اور خنک ہوا ہے | بے مے سب کر کرا مزا ہے
اک چلو کے دینے میں یہ تکرار | اُٹھو، جاگو سحر ہوئی یار
دریا کی طرف چلے نہانے | غٹ پریوں کے زنا نخلانے
مرغان چمن بہ نکتہ رانی | چوں برہمناں بہ بید خوانی
نوبت رنگت جما رہی ہے | شہنائی مزہ دکھا رہی ہے

"ہاں اتنا ضرور خیال رہے کہ اس مثنوی میں اکثر مقامات" گلزار نسیم سے رنگ و بو لیکر اپنے مضامین کو تازہ کیا ہے ۱۸۹۴ء میں جو کشمیری سوشل کانفرنس ہوئی تھی اُس میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع یہ ہے

پھلینگے پھولینگے گلزار قوم کے اشجار | اُٹھا ہمالیہ پربت سے ابر گوہر بار

"اس میں تعلی کے اشعار کے زمرے میں ایک شعر یہ بھی تھا"

زباں وہ پائی کہ بے نطق سیکڑوں تو سے | طبیعت ایسی ملی شوخ جیسے چنچل نار

"اس قصیدے کے پچھلے اشعار یہ ہیں جن میں اپنے تئیں خطاب کیا ہے"

ہے اِس کمال یہ لیکن ہزار بار افسوس | کہ تو نے قدر نہ کچھ جانی اپنی خود زنہار
کمال کے لئے لازم جو ہے زوال ضرور | اب ایک قطرہ ہے پہلے تھا قلزم زخار
نہ آب و تاب وہ اگلی سی ہے نہ رنگ روپ | نہ ہیں وہ شاہد مضموں کے پھول سے رخسار
نہ حافظہ ہی رہا وہ نہ قوت ادراک | رہے کہاں سے ہر ایک شئے کی حد سے انکار
ابھی زمانے میں تو بھی امیر ہو جاتا | قبول زر میں نہ ہوتا اگر تجھے انکار

سرشار کا مندرجہ بالا کلام دلچسپی سے خالی نہیں جس کے پڑھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ اور ایسے اشعار دیکھنے کو ملتے اگر سرشار کا مجموعہ نظم

بھی دلدادگان ادب کے سامنے آگیا تو یقیناً وہ پر لطف مجموعہ ثابت ہوگا حالانکہ اُس سے سرشار کی شہرت و فضیلت میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا اِس کا سہرا فسانۂ آزاد ہی کے سر رہیگا جو اردو انشا پردازی کے تاج میں ایک پُر نور ہیرا ہے۔

رواں اُناوی

ولادت ۱۸۸۹ء وفات ۱۹۳۴ء

وہ بادہ نوش حقیقت ہے اِس جہاں میں رواں
کہ جھوم جائے فلک گر اُسے خمار آئے

جگت موہن لال نام رواں تخلص چودھری ال قوم کالیستھ منشی گنگا پرشاد کے چوتھے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن موراواں ضلع اُناؤ تھا۔ حضرت رواں ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو اُناؤ خاص میں پیدا ہوئے۔ ۹ سال کی عمر میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اپنے بڑے بھائی بابو کنھیالال کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی اُناؤ کے ایک مکتب میں مولوی سبحان خاں سے فارسی و عربی پڑھی ۱۹۰۷ء میں موراواں اسکول سے انٹرنس اول درجے میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لئے کننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں ایف اے کی اور ۱۹۱۱ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔ خلقی ذہانت اور طبعی شوق سے ہر امتحان میں اول درجے میں کامیاب ہوئے اور وظیفہ بھی پلیا۔ حضرت رواں

چودھری جگت موھن لال رواں

کے تذکرے میں ہے کہ جب وہ کالج میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ جو طلبا بی۔ اے میں اول میں کامیاب ہوتے تھے اُن کے نام زریں حروف سے کالج کی دیوار پر لکھ دئیے جاتے تھے۔ حضرت رواںؔ کو بھی آرزو ہوئی کہ کاش کبھی میرا نام بھی یہاں لکھا جاتا۔ آخر ایک دن انھوں نے یہ امتیاز حاصل کیا اور آج اُن کا نام بھی دیگر سچے عاشقانِ علم کی طرح کالج کی لوحِ تاریخ پر ثبت ہے۔

شوقِ تعلیم نے بی۔ اے کی ڈگری پر اکتفا نہ کرنے دیا ۱۹۱۳ء میں آپ نے ایم۔ اے پاس کیا اور ذریعہ معیشت کے خیال سے ۱۹۱۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی۔ اس کے بعد آپ مستقل طور پر اُناؤ میں قیام پذیر ہو گئے اور وکالت شروع کر دی۔ بہت جلد کامیاب وکیلوں میں آپ کا شمار ہونے لگا لیکن آپ اس پیشہ سے خوش نہ تھے شاعرانہ مزاج لطافت، رنگینی اور آزادی کا ماحول چاہتا تھا اور کام پڑا تھا وکالت کے میس و کثافت سے۔ کہاں سخن سنجی کی مسرت، ہم سخنوں کی صحبتوں کا لطف، غالب و حافظ کا مطالعہ جس کے رواںؔ دلدادہ تھے اور کہاں ضابطہ دیوانی اور قانون میعاد سماعت کی ورق گردانی، قانونی نظائر و دفعات کی موشگافیاں اور ناتراشیدہ موکلوں کی ناہموار حیناں وچنیں۔ حضرت رواںؔ کی طبیعت کو اس ماحول سے کیونکر مناسبت ہو سکتی تھی۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی مرغِ چمن کو قفس میں بند کر دے فطری رجحانات کے خلاف جب آدمی کوئی کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے

اُسے حد درجہ کوفت ہوتی ہے اور اُس کے جوہروں کی نشوونما خاک میں مل جاتی ہے۔ حضرت رواںؔ کو بھی یہی کلفت تھی جس کا اظہار بھی اُن کے کلام میں کہیں کہیں ہو گیا ہے۔ رباعی

کرتے ہیں عزیز و دست عزت میری کافی ہے ضرورتوں کو دولت میری
ظاہر میں تو کوئی وجہ کلفت کی نہیں لیکن میں خوش نہیں یہ قسمت میری

ہمارے ملک میں ایسی مثالیں بہت ملینگی۔ اِن کے لئے قوم کی بے ہمتی اور غلامی ذمہ دار ہے۔ کچھ بھی سبب سہی بہر حال ایسے دل و دماغ بسا اوقات قدرت کی ستم ظرفی کا شکار ہو جاتے ہیں جو ملک و قوم کی ادبی زینت میں چار چاند لگا دیتے۔

قسمت سے داغ سینہ بنے اس کو کیا کریں خون جگر میں رنگ بہت تھے بہار کے

حضرت رواںؔ بڑے وجیہہ و شکیل آدمی تھے۔ اُن کے مزاج میں تواضع انکسار اور نیکی تھی وہ بڑے خوش طبع اور خوش اخلاق تھے۔ احباب کے ساتھ بڑی مدارات سے پیش آتے تھے اور اُن کی صحبتوں کو ایک نعمت سمجھتے تھے۔

حضرت رواںؔ میں ملکہ شاعری خداداد تھا۔ بچپنے ہی سے موزونی طبع کے جوہر چمک چلے تھے۔ خاندان کے بزرگ اِس سے بہت لطف اندوز ہوا کرتے تھے اور اُن کی تحسین و آفریں اِن کے شوق کو اور تیز کرتی تھی وہ کہتے کہ دیکھو دیوار پر یہ چڑیا بیٹھی ہے اِس پر شعر کہدو۔ آپ دو چار لمحے فکر کرتے شعر موزوں ہو کر زبان پر آجاتا۔

آپ کی چھ سال کی عمر تھی کچھ لڑکوں کے ساتھ گیند بلا کھیل رہے تھے۔ کپڑے کا گیند زیادہ ضربوں کی تاب کیا لاتا۔ پھٹ گیا چیتھڑے باہر نکل آئے۔ اب جو کسی مضبوط کھلاڑی نے ہاتھ مارا تو دور تک چلا گیا آپ نے فوراً ساتھ کے کھلاڑیوں میں سے ایک سے ارشاد کیا

ذرا گیند میرا اُٹھا لائیے   پھٹے چیتھڑے مجھ کو دکھلائیے

یہ طبیعت کا رجحان اور زور اس پر یہ سلسلہ تعلیم لکھنؤ کا قیام۔ وہاں کی شعر و سخن کی صحبتوں میں بھی شرکت ہوتی تھی جو سمند ناز پر تازیانہ کا کام کرتی تھی۔ غرض حضرت رواںؔ نے باضابطہ شعر کہنا شروع کیا۔ لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی آنجہانی سا علامہ دہر اُستاد ملا پھر کیا تھا سخنور باکمال ہو کر چمکے۔

آپ کے شعر کہنے کا طریقہ یہ تھا کہ غزل کہنے سے پہلے تین چار روز تک طبیعت میں شاعرانہ تخیلات کی رَو پیدا کرتے۔ کبھی کسی فارسی شاعر کے دیوان کو دیکھتے یا کسی فلسفہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے۔ جب موزونیت کے ساتھ ساتھ جذبات بھی موج زن ہو جاتے اُس وقت شعر کہنا شروع کرتے اور دو تین گھنٹے میں غزل کہہ لیتے۔

آپ کے منظومات کے تین مجموعے ہیں۔ ایک مجموعہ نیچرل نظموں اور غزلوں کا۔ دوسرا رباعیات کا۔ تیسرا ایک مثنوی ہے جس میں مہاتما بدھ کے سوانح حیات اور فلسفہ ہے دو اول الذکر حضرت رواںؔ کی حیات ہی میں طبع ہو چکے تھے۔ مثنوی ابھی طبع نہیں ہوئی ہے

یہ بڑی پاکیزہ مثنوی ہے جس کے کچھ اشعار مصنف مرحوم کی زبان سے ایک مخصوص نجی صحبت میں سُنے تھے۔ جس میں سرشاہ سلیمان آنجہانی بھی تشریف فرما تھے۔

حضرت رواںؔ کے کلام میں شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ آپ کا مجموعہ ترقی یافتہ دور کا نہایت کامیاب اور قابل قدر نمونہ ہے اس میں قدرتی مضاہر و مناظر بھی ہیں، جذباتی کیفیات بھی ہیں، قومی خیالات و احساسات بھی ہیں فلسفہ، اخلاقیات، عرفانیات اور کچھ واقعات بھی ہیں۔ آپ کی شاعری میں حکمت، پاکیزگی اور بلند خیالی کی روح جاری وساری ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ حضرت رواںؔ زندگی کے اعلےٰ مقاصد کو پیش نظر رکھتے تھے۔ انسانیت کے جوہر سے آشنا تھے بلند اخلاق کے مالک تھے اُن کے دِل میں درد تھا اور دماغ میں حکیمانہ باریک بینی اور تجسس۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا اُن کی نظر بہت گہری جاتی تھی اُن کے تخیلات شعری اور معمولات زندگی میں ایک تسالم و توازن تھا جس نے اُن کو سرتاپا بھی ایک مکمل شاعر بنادیا تھا۔ جب اِس ہمزنگی و توازن کو اُنھوں نے اشعار کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا تو حسن وجمال کے مرقع آنکھوں کے سامنے پیش کر دئے۔ یہ حسن بیان کی کرامت تھی فصاحت وبلاغت کہیں جوش وخروش، کہیں سلاست و صفائی، کہیں نزاکت ولطافت ودبدبہ، کہیں مصوری و مرقع نگاری اور کہیں درد واثر نیکر جلوہ

دکھاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ جلوے سطحی اور رسمی شاعری کے جلووں سے بالکل علیحدہ چیز ہیں۔ آپ کے تمام منظومات میں یہ محاسن نمایاں نظر آتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ جس صنف کو لیا ہے اُس کی تکمیل اُس کی خصوصیات کے اندر کی ہے۔ نیچرل نظموں میں نظم کا جدید رنگ ہے، غزل میں غزل کا رُباعی میں رباعی کا اور مثنوی میں مثنوی کا۔ یہ بڑا کمال ہے اور قادر الکلامی کی دلیل جس کی مثالیں شاذ ہی ہیں۔ میں یہاں سوا مثنوی کے ہر صنف سے کچھ نمونے پیش کرتا ہوں۔ مطبوعہ منظومات میں کچھ ابتدائی مشق کا کلام ہے جو قابل ذکر نہیں بقیہ نظموں میں سے اول "شاعری" کے کچھ بند لیتا ہوں لسان الہند مرزا عزیز لکھنوی آنجہانی کی زبان میں اِس کے تبصرے پر غور کیجیے جو اسے بے نظیر لکھتے ہیں۔

شاعری کیا ہے اک احساس قوانین وجود — دِل کے جذبات کا اظہار بہ تائید قیود
برہمن ہے دِل شاعر بت فطرت معبود — جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسن نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دِل کے آئینہ پہ تصویر اُتر آتی ہے

"شاعر کے معنی پیدا کرنے والے کے ہیں اور شاعری وہ مخلوق ہے جو خالق بھی ہے اِن معانی کو مد نظر رکھتے ہوئے جذبۂ شاعری کو احساس قوانین وجود کہنا بلاغت کی آخری منزل ہے لفظ احساس نے شاعری کو قلب کی ایک کیفیت بتایا اور ادراک سے علیحدہ کر کے اِس پر ترجیح دی۔ یہاں تحقیق و تدقیق کے بعد عقل اور دماغ کی امداد سے قوانین دریافت یا وضع

نہیں کئے جاتے اور پھر ان کو دیگر مسائل کے حل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا
جاتا بلکہ براہ راست تمام اسرار فطرت و رموز حقیقت کو بے نقاب کیا
جاتا ہے۔ دلیل اور بحث کو دخل نہیں جس میں غلطی کا احتمال رہے ع

دِل کے آئینہ پہ تصویر اُتر آتی ہے

لہٰذا جو احکام شاعری نافذ کرتی ہے اِن میں چون وچرا کی گنجائش نہیں کیونکہ
قیاس نہیں مشاہدہ ہے۔

دوسرا باریک نکتہ یہ ہے کہ قوانین وجود کہا گیا ہے یعنی حقیقت
اشیا کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ سائنس ابھی تک قوانین فطرت
دریافت کرنے، اُن کا دائرہ اثر قائم کرنے اور اُن کی ترتیب و تدوین میں
غلطاں و پیچاں ہے۔ قوانین وجود تو بڑی چیز ہیں سائنس اکثر مسایل طبعی
کا جواب نفی میں دیتا ہے یا وجود اشیا کا منکر ہو جاتا ہے۔

پہلے مصرع میں نفس شاعری سے بحث ہے دوسرے میں اس کا
عملی یا موضوعی پہلو دکھایا ہے۔ شاعر نہ صرف قوانین وجود کو محسوس
کرتا ہے بلکہ الفاظ یا نغمۂ موزوں میں اپنے محسوسات کو بیان بھی کر دیتا
ہے مگر وہی نغمے شاعری کے مقدس خطاب کے مستحق ہیں جن میں حقیقت
یعنی قوانین وجود کی ترجمانی ہے۔

شاعری کے وضعی اور موضوعی پہلو ہو گئے۔ اسی شعر کے آخری
ٹکڑے میں یہ بتا دیا گیا کہ فن شاعری کیا ہے۔ قیود کی تائید اور پابندی
کے ساتھ ساتھ یعنی وزن و قافیہ قائم رکھتے ہوئے اظہار جذبات ہو

ورنہ شاعر کا خطاب نہیں مل سکتا۔ یہیں سے نثر کے تمام اقسام دائرہ شاعری سے خارج ہو گئے۔ خواہ کتنے ہی موثر اور جذبات گوناگوں سے لبریز ہوں (اگرچہ جدید تحقیق کے مطابق تخیل جو شعر کا قوی عنصر ہے نظم و نثر کی قید سے بری ہے)

دو تائید قیود کو ذہن نشین کر کے تیسرا مصرع پڑھیئے۔

برہمن ہے دِل شاعر بت فطرت معبود

تشبیہ کی لطافت و ندرت کے علاوہ نفسیات کے اِس مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے علم کی ابتدا خارجی اشیا سے ہو کر انتہا اپنی ذات کے علم و معرفت پر ہوتی ہے جس کے بعد معرفت باری عز اسمہ کا درجہ ہے دِل شاعر برہمن ہے جو اصنام فطرت کی پرستش کرتا ہے۔ تمام مجاز دائرہ شاعری میں آگیا۔ مگر مجاز میں اِس قدر دلکشی کیوں ہے اِس کا جواب چوتھے مصرع میں ہے ؎

جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسن نمود

اب مکاں سے لامکاں تک شاعری کی جولانگاہ ہو گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حجاب ظاہری آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جائیں یا رواں کے پر اثر الفاظ میں نظر راز کے پردوں سے گذر جائے اور شاہد حقیقت کی تصویر دل کے آئینے میں اُتر آئے اِسی کو اصطلاح سلوک میں عین الیقین کہتے ہیں۔

دِل کو برہمن اور فطرت کو بُت کہنے سے جو بے شمار خوبصورت

مناظرِ حسن میں ہر ایک تجلیات و معانی سے لبریز ہے آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں
اِن کی صراحت ناممکن ہے صرف دِل مزے اُٹھاتا ہے پھر اِن روشن مظاہر میں
ایک ایسی برق حسن چمکتی ہے کہ یہ تمام نقش و نگار محو ہو جاتے ہیں صرف پرتو حسن
ازل رہ جاتا ہے۔ یہ مناظر دراصل نورِ حقیقت کے پردے تھے جن کو اُٹھا کر دل
حریمِ حسن میں داخل ہوا اب دِل نہیں رہا بلکہ اِک آئینہ ہے جس میں حسنِ مطلق
اپنے جلوے دکھاتا ہے۔

دوسرا بند۔

اِسی تصویر کا اِک رُخ ہے یہ دُنیائے لطیف — ناظمِ کون و مکاں ہے یہ ہے اس کی تعریف
ہے زیاں اِس کے ادا کرنے کو اِک جزوِ ضعیف — منبرِ بارگہ خاص ہے یہ فنِ شریف

پردہ اسرارِ مجازی کا اُٹھانے والا
آئینہ روئے حقیقت کو دکھانے والا

پہلے بند سے یہ ثابت ہوا کہ دل خلاصہ انوارِ مظاہر ہے لہٰذا اس تصویر کا ایک
رُخ یہ دُنیا ہوئی۔ سائنس کے مساعی میں سب سے اہم یہ کام ہے کہ موجوداتِ
عالم میں جو بظاہر متضاد اور ایک دوسرے کی مخالف قوتوں کا ہنگامہ زار ہے
نظام قایم کرے، یہ ثابت کرے کہ تفریق میں ترتیب اور ترتیب میں تفریق ہے جمادات
نباتات، حیوانات کا تجزیہ کر کے واضح کر دے کہ سب ایک ہی اصل سے
وابستہ اور ایک جوہر کے مختلف مظاہر ہیں۔ مادی چیزوں کی ترتیب میں
سائنس ایک حد تک کامیاب ہوا ہے مگر جہاں ارتباط روح و تن کا
سوال آجاتا ہے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ یہ دِل شاعر ہے جو

ناظم کون و مکاں ہے اور مجاز و حقیقت میں ربط پیدا کر دیتا ہے۔ مجاز ایک آئینہ ہے جس میں عکس حقیقت نظر آتا ہے۔ جیسا بیان کر چکا ہوں تصویر کے دو رُخ ہیں ایک مجاز ایک حقیقت بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دیدۂ بینا میں حقیقت و مجاز کا امتیاز ظاہری اور بے بنیاد ہے حقیقت ہی حقیقت ہے۔ میرؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

جو خوب دیکھو تو ساری وہی حقیقت ہے　　چھپانا چہرے کا عشاق سے تکلف تھا

تیسرے مصرعے میں شاعری کے متعلق ایک اور اہم بات بتائی گئی ہے۔ دلِ شاعر جو کچھ محسوس کرتا ہے اُس کا عشرِ عشیر بھی صفحہ قرطاس پر منتقل نہیں ہوتا۔ اُس محشر جذبات کی مصوری کو الفاظ ناکافی ہیں نطق بیکار ہے۔ باقی تین مصرعے کسی خاص شرح کے محتاج نہیں بجز اس کے کہ دلِ شاعر ایسا آئینہ ہے جس میں جلوۂ دوست منعکس ہوتا ہے۔ چوتھے بند میں اس کی مزید وضاحت ہے۔

دل ہے شاعر کا کہ اک منزلِ انوارِ جمال　　اور جولانگہ دلِ وسعت میدان خیال
نغمہ زن ہوتا ہے جب مست سخن صاف قال　　بزم فطرت میں ہر اک چیز کو آجاتا ہے حال
کوہ جھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رُک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

منزلِ انوار جمال کی خوبصورت ترکیب کے ساتھ ساتھ لفظ منزل کے لفظی معنی (جائے نزول) نے جو معنویت پیدا کی ہے غور طلب ہے انوار جمال دل کے سوا اور کہیں قرار نہیں لیتے (کیونکہ دلِ آئینہ جمال ہے پیشتر کے

بند میں یہ ثابت ہو چکا) اِس بند کی ہیبت تعریف سے مستغنی ہے کوہ میں بلندی ہے مگر جُھکنے کی صلاحیت نہیں چشمے میں روانی ہے رُکنے کی قدرت نہیں مگر جب وجد کا عالم ہوگا جیسا چوتھے مصرعے میں ادعا ہے تو پہاڑ یقیناً جھک جائینگے اور چشمے رُک جائینگے - اِس وقت یہی اُن کی فطرت ہوگی حقیقت اشیا سے اِس طرح گفتگو کرنا کہ مافوق الفطرت باتیں ممکن الوقوع ہو جائیں شاعری کی معراج کمال ہے اور شاعرانہ عظمت کا دار و مدار اسی پر ہے -

پانچواں بند -

نورِ شمعِ دل و جاں دائرۂ شعر میں ہے
وسعتِ کون و مکاں دائرۂ شعر میں ہے

جلوۂ مبرقِ تپاں دائرۂ شعر میں ہے
الغرض سارا جہاں دائرۂ شعر میں ہے

جس بلندی پہ فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
سچے شاعر اُسے ٹھکراتے ہوئے چلتے ہیں

الفاظ کی نشست مصرعوں کی بیساختگی اور اسی کے ساتھ روانی اور جوش قابلِ داد ہے بیت میں شاعر کے ساتھ سچے کی قید نے کس قدر بلاغت پیدا کی ہے -

دو بند اور سُن لیجئے -

پیاری اُردو تیری محفل میں سخنور کم ہیں
سنگریزے تو بہت ملتے ہیں گوہر کم ہیں

چوٹ لگ جائے جن اشعار سے دل پر کم ہیں
جن میں پنہاں ہوں خیالات کے دفتر کم ہیں

میرؔ سمجھا تھا فقط معنی اسرارِ سخن
ختم غالبؔ پہ ہوئی گرمئی بازارِ سخن

موجودہ شاعری پر ایک فاضلانہ نقد و تبصرہ ہے۔

اللہ اللہ یہ ہے وسعت دامان غزل — ختم نہہائے دو عالم پہ ہے پایان غزل
بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شان غزل — پوچھئے حافظ شیراز سے امکان غزل

عنیط ہے آئینۂ راز حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

اس بند کا جواب نہیں موجودہ دور کے بعض حضرات غزل کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اُن کے واسطے یہ بند سبق آموز ہے اگر اس کی شرح کی جائے تو مقدمہ مستقل ایک کتاب ہو جائیگا جس کی گنجائش نہیں ''

نظم لاوارث بچہ کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

آہ اے نو وارد بزم رباط روزگار — آہ اے تازہ اسیر گردش لیل و نہار
آہ اے دیباچۂ شرح کتاب درد دل — آہ اے عنوان باب اضطراب جانگسل

حضرت عزیز لکھتے ہیں کہ اس قسم کے خطابیہ اشعار سے یہ نظم شروع ہوتی ہے اور تسلسل و اثر کے اعتبار سے ایک موتیوں کی لڑی ہے۔ خطاب کے بعد شاعر پوچھتا ہے۔

سچ بتا نیکے! تیرا وارث تیرا والی ہے کون — پھول ہے تو کس شجر کا اور تیرا مالی ہے کون
سچ بتا نیکے! تجھے خاک وطن کا واسطہ — پھول ہے تو جس چمن کا اُس چمن کا واسطہ
اختصار طول آزار نہانی سچ بتا — اے خمار بادۂ کیف جوانی سچ بتا
کیا اُڑا لائی کسی گلزار سے تجھ کو صبا — پھول ہوتے ہیں جہاں ایسے ہی پیارے خوشنما

اس کے بعد شاعر پوچھتا ہے۔

حیف کیا میں مان لوں دُنیا کے لوگوں کی دلیل
تجھ کو سمجھوں ثمرۂ بدکاریٔ نفس ذلیل

دوسرے شعر میں اخلاقی سبق ہے۔

حیف ہے لیکن اگر لوگوں کا کہنا ٹھیک ہے
حیف ہے گر آدمی کی عقل یوں تاریک ہے
باپ ماں کے نفس سرکش کی کہانی ہائے ہائے
اے معاذ اللہ ابن بچے کی زبانی ہائے ہائے

اس کے بعد چند اشعار میں اُس کی ماں کی بیرحمی اور بیدردی پر اظہار افسوس ہے غرض تمام نظم میں جذبات کی ترجمانی اِک حسن خاص سے کی ہے"

ایک چھوٹی سی نظم اور سُن لیجئے۔ اُس کے بعد غزلیات کے متعلق کچھ عرض کرونگا۔

غبارہ

زمیں سے جانب بام فلک رواں ہے تو
مسافرِ رہ بے جادہ و نشاں ہے تو
ہوا پہ اِک فرس شعلہ جست کرکے چلا
کہ کوئی طائر زریں اُڑان بھر کے چلا
بلندیوں کی طرف مثل برق طور چلا
کمال شوق سے دامن میں بھر کے نور چلا
حسین پری کوئی مست مے صبوح چلی
نکل کے قالب خاکی سے جیسے روح چلی
تپ دروں سے غبار سراب دشت ہے تو
فضائے چرخ پر آواز بازگشت ہے تو
بڑا ہے یا کسی میکش کا صبر رندانہ
اُلٹ گیا ہے مے آتشیں کا پیمانہ
فلک کا اہل زمیں کو پیام ہے کوئی
کہ دست ساقیٔ کوثر میں جام ہے کوئی
یہ کوئی آگ کا اُڑتا ہوا شرارہ ہے
کہ آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے
ڈھلک کے دیدۂ سالک سے کوئی اشک نیاز
چلا ہے ہونے کو دامان عفو پر ممتاز
قدم قدم پہ سنبھلتا ہے ڈگمگاتا ہے
قدم قدم پہ مچلتا ہے لوٹا جاتا ہے

فنا کے دوش پہ کچھ اِس طرح سوار ہے تو
کہ بیکسوں کا چراغ سر مزار ہے تو

نظر فروز تعلق بہار ہے تیری
حریف۔ زندگی مستعار ہے تیری

خبر بھی ہے تجھے انجام تیرا کیا ہو گا
مواد زیست تیرا، باعث فنا ہو گا

قدم بڑھائے ہوئے ہاں قدم بڑھائے ہوئے
گداز نفس سے دامن نگر بچائے ہوئے

رواں تو ہے سوئے منزل مگر یہ ڈر ہے مجھے
میری طرح کہیں چلنے سے پہلے جل نہ بجھے

رواںؔ کی غزلیات پر اُن کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے۔

رواں ذوق سخن تیرا تجھے خود داد دیتا ہے
تیرا انداز ہے انداز مرغان خوش الحاں کا

حضرت رواںؔ نے اشعار میں واقعی خوشنوا پرندوں کی سی نغمہ سنجی کی ہے۔ وہ وزنی اور پرشکوہ فارسی عربی الفاظ اور ترکیبوں سے شعر کو گرانبار نہیں کرتے بلکہ سیدھے سادے، نرم، مانوس اور شستہ الفاظ کو اِس خوبصورتی سے ترتیب دیتے ہیں اور ایسے سبک سانچے میں ڈھالتے ہیں کہ موزونیت کا جامہ پہنکر وہ بے انتہا دلاویز ہو جاتے ہیں۔ اپنی تلاش و فکر سے بسا اوقات اُن میں کوئی ایسا ٹکڑا رکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے والا جھوم جاتا ہے، ذیل کے اشعار دیکھیے اور خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے۔

وہ عالم گر نظر آ جائیں جو آنکھوں سے نہاں ہیں
ابھی سارا بھرم کھل جائے دنیائے نمایاں کا

ارادہ ہے کہ چند ے پاس سے اب دل کو قوت دوں
کہاں تک کھاؤں گا دھوکا امید سست پیماں کا

وہ مجھ کو مٹاتے ہیں احسان نہیں کرتے
میں بادِل خوں گشتہ مٹنے ہی کے قابل تھا

احساں نہیں کرتے" دو معنی رکھتا ہے۔ ہر معنی کے ساتھ "بادِل خوں گشتہ"
کی وسیع ترکیب کے مفہوم پر غور کیجئے واقعی جس آدمی کی تمام تمنائیں اور
آرزوئیں خاک میں مل گئی ہوں اُس کو اِس ناکام و نامراد زندگی سے
نجات دیدینا بڑا احسان ہے اور احسان نہیں بھی کیونکہ اُس کا عدم
و وجود برابر ہے۔

بس تھم گیا سفیرِ عمل کہکے یا نصیب! جس جا پہ ختم منزلِ تدبیر ہوگئی

اِس شعر کی تشریح حضرت عزیزؔ انجہانی کی زبان سے سُنئے۔

"اِس شعر میں تدبیر و تقدیر یا جبر و اختیار کے مسئلہ کو عجیب حُسن سے نظم کیا ہے
سفیرِ عمل کی ترکیب اِس شعر کی جان ہے۔ سفیر ایک نہایت مقتدر عہدہ
ہوتا ہے۔ عمل کے ساتھ اِس لفظ کے شمول نے عمل کی اہمیت کو نمایاں
کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سفیرِ عمل کی مشن معمولی نہیں ہے بلکہ کسی نصب العین
کی تلاش ہے۔ اِس نے جادۂ تدبیر اختیار کیا۔ امکانی جد و جہد کی گئی۔
منزلِ تدبیر ختم ہوگئی مگر نصب العین جس طرح دور تھا اب بھی دور ہے
سفیرِ عمل کے مُنہ سے بے اختیار "یا نصیب" نکل گیا۔ یہ فقرہ جس خوبی
سے صرف ہوا ہے اُس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ ایک تو محاورہ
جب انسان کوشش کرکے تھک جاتا اور ناکام رہتا ہے تو" یا نصیب"
کہتا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سفیرِ عمل نے نصیب کو آواز دی کہ
تو میری رہبری کر تدبیر کی سعی ختم ہوگئی۔ سب سے زیادہ شاندار درس
جو اِس شعر میں ہے وہ یہ ہے کہ انسان خواہ تقدیر کا قائل ہو خواہ تدبیر کا

عمل ضروری ہے اس سے کسی صورت میں باز نہ رہنا چاہیئے"

"عمل نے جہاں تک ممکن تھا تدبیر سے کام لیا جب تدبیر کا دائرہ اثر ختم ہوا تو تقدیر کو آواز دی کہ مجھ میں ابھی ہمت باقی ہے آ میری رہبری کر۔ ایسی صورت میں تدبیر اور تقدیر کا فرق صرف ظاہری رہ جاتا ہے انسان کو چاہیئے کہ سرگرم عمل رہے اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دے"

رواں اسی" سادہ سلیس اور دلکش زبان میں بڑے بڑے اسرار کھول دیتے ہیں۔

سہل سی اک بات ہے مرنا مگر از قید زیست — روح کے آزاد ہونے کو زمانہ چاہیئے

یادگاریں دل مردہ کی ہیں سو ہان حیات — شکر ہے ایسے بھی کچھ رنج ہیں جو یاد نہیں

وہیں سے ابتدا ہے کوچہ دلدار کی حد تک — قدم خود چلتے چلتے آ کے رک جائیں جہاں میرا

پیہم دئے وہ رنج کہ انساں بنا دیا — منت پذیر ہوں ستم روزگار کا

کبھی اسی انداز میں رنگینی و تابانی پیدا کر کے جذبات و کیفیات کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

گل و لالہ یہ آخر کر رہا ہے غور کیا گلچیں — وہی خوں ہے جو ٹپکا تھا کبھی چشم عنادل سے

یہ کس نے آخر شب پردہ ہائے نور سے جھانکا — کہ لو دینے لگا ہر ایک ذرہ بزم امکاں کا

تڑپتی پھرتی ہے اک برق عرفاں سکدے بھر میں — کبھی مینا میں خم سے اور کبھی مینا سے ساغر میں

ازل سے ہے یہی باب بہار کی سرخی — جو آفتاب کی پہلی کرن میں آئی ہے

پھر یہ اشعار محض لفظوں اور بندشوں کی بنائی ہوئی تصویریں نہیں رموز حقائق سے لبریز ہیں۔ کبھی انھیں سبک اور شیریں الفاظ سے عجیب ندرت و تازگی پیدا

کر دیتے ہیں۔ تخیل اور طرزِ ادا دونوں ہیں۔

قابلِ دید ہیں دیوانوں کے آپس میں سلوک
ان کو زنجیر سے زنجیر بدلتے دیکھا

تیرے مطلب کے تصدق تیرے مقصد کے نثار
حکم نظم آفرینش اذن قتل عام تھا

یہ کہلے صبح نے کی ختم شمع کی ہستی
یہ داغ خوں ہے میری آستین کے قابل

اسی کو نعمت حسن بیان بھی کہتے ہیں
کہ چپ بھی رہتے ہیں اور داستان بھی کہتے ہیں

کبھی ہلکی سی چٹکی لیکر میٹھا درد پیدا کر دیتے ہیں جو رفتہ رفتہ رگ و پے میں پھیل جاتا ہے

دلِ گم گشتہ کے ملنے کی صورت گر یہی ٹھہری
لئے آتے ہیں تھوڑی خاک ہم بھی کوئے قاتل سے

جانے ہو تو خیر جاؤ کچھ اصرار بھی نہیں
لیکن جو تم نہیں تو دلِ زار بھی نہیں

مٹائے دیتے ہیں بنیاد آشیانے کی
فضول کون سہے سختیاں زمانے کی

ذرا کمی تو کرے شام کی اداسی میں
چراغ گور نہ دے ساتھ رات بھر نہ سہی

کبھی شعر کو درد و اثر سے لبریز کر کے تڑپا دیتے ہیں۔

ابھی تک فصلِ گل میں اک صدائے درد آتی ہے
وہاں کی خاک سے پہلے جہاں تھا آشیاں میرا

جانے والے چل دئے دنیا کی محفل چھوڑ کر
رونے والے ایک دن کیا عمر بھر رویا کریں

تذکرہ زنداں میں ہے گلزار پر بجلی گری
آج میرے آشیاں میں روشنی ہو جائیگی

یہاں "روشنی" کے لفظ نے وہ محاکاتی و معنوی حسن پیدا کیا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بہر تقدیر کچھ دن کاٹنا تھے قید ہستی کے
قفس برباد کر کے آشیاں برباد کیا کرتے

ارے میرے دلِ خنداں کے رونے والے
بہت دنوں میں بہار اس چمن میں آئی ہے

کسی طرح نہ میرے دل کو جب قرار آئے
میری بلا سے خزاں آئے یا بہار آئے

گلہ فضول ہے طول شب جدائی کا ۔۔۔ بہت سی راتیں ہوئیں ایک کی سحر نہ سہی
ذرا کمی تو کرے شام کی اُداسی میں ۔۔۔ چراغ گور نہ دے ساتھ رات بھر نہ سہی

حکیمانہ مسائل و اخلاقیات رواںؔ کی شاعری کی جان ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ دقیق سے دقیق رموز کو نہایت سلیس اور صاف زبان میں ادا کیا، اور اپنی طرز خاص سے نہایت دلکش بنا دیا ہے اور غزل کی خصوصیت سے گرنے نہیں دیا۔ کچھ مثالیں اوپر آ چکیں کچھ اور دیکھیے۔

مآلِ زندگی ہے کام کرنا کام کرتا ہوں ۔۔۔ تاسف ہے اگر ہو کاوشِ سود و زیاں مجھ کو

تقدیر جب معاون تدبیر ہو گئی ۔۔۔ مٹی پہ کی نگاہ تو اکسیر ہو گئی

اِس قالب خاکی میں کیا میں نے ترقی کی ۔۔۔ آوارۂ منزل ہوں آوارۂ منزل تھا

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے ۔۔۔ یہی قانون فطرت آپ عالمگیر دیکھیں گے

نہیں ہے چشم انساں درخور کیف نظر ورنہ ۔۔۔ ہر اک خاموش نقطہ میں ہے عالم نخترستاں کا

نہ گل ہوئی ہے نہ شمع حیات گل ہوگی ۔۔۔ ہزار بار یونہی انجمن میں آئی ہے

اہل جہاں کے کفر و توہم کا کیا علاج ۔۔۔ آئینہ کہہ رہا ہے کہ آئینہ ساز تھا

یہی ہستی اِسی ہستی کے کچھ ٹوٹے ہوئے رشتے ۔۔۔ وگرنہ ایسا پردہ میرے اُن کے درمیاں کیا تھا

انسانی عظمت۔

اُتار دیتے ہیں لاشہ میرا کہاں احباب ۔۔۔ یہ آسمان نہیں اِس زمین کے قابل
سنگ زمین کعبہ خود بڑھکے جبیں کو بوسہ دے ۔۔۔ ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیۂ نیاز میں

میں نے چند نمایاں خصوصیتوں کے لحاظ سے کچھ اشعار پیش کئے بہت سے اشعار ایسے رہ گئے جو اپنے لئے ابھی علٰحدہ عنوان چاہتے ہیں لیکن

بخوف طوالت قلم انداز کئے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ شاعری کی نزاکتیں ہر قسم کی تحلیل و تجزیہ کی متحمل نہیں ہوتیں۔ ایک ایک شعر میں کئی کئی خوبیاں ہوتی ہیں اچھے کلام کی پہچان یہی ہے۔ رواں کا کلام اِس خصوصیت میں ممتاز ہے۔ کچھ متفرق نمونے پیش کئے گئے اب کچھ مسلسل اشعار درج ذیل ہیں۔

غزل

تقدیر جب معاون تدبیر ہو گئی — مٹی پہ کی نگاہ تو اکسیر ہو گئی
چھینٹیں جو خوں کی دامن قاتل پہ رہ گئیں — محشر میں میرے قلب کی تفسیر ہو گئی
شبنم اُڑی گلوں سے میرا نقشہ کھنچ گیا — مرجھا گئی کلی میری تصویر ہو گئی
میں کہہ چلا تھا داورِ محشر سے حالِ دل — اِک سرمگیں نگاہ گلوگیر ہو گئی
بس تھم گیا سفیرِ عمل لگ گئے یا نصیب — جس جا پہ ختم منزلِ تدبیر ہو گئی

توڑا ہے دم ابھی ابھی بیمارِ ہجر نے
آئے مگر حضور کو تاخیر ہو گئی

گل ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا — تو ہی دیکھا اے میرے خلاق حسن رائگاں میرا
ہوا اِس کو اڑا لے جائے اب یا پھونک دے بجلی — حفاظت کر نہیں سکتا میری جب آشیاں میرا
وہیں سے ابتدائے کوچۂ دلدار کی حد ہے — قدم خود چلتے چلتے آ کے رک جائے جہاں میرا
غنیمت ہے نفس دو چار جو باقی ہیں اب ورنہ — کبھی کا لٹ چکا سرمایۂ سود و زیاں میرا
ابھی تک فصل گل میں اک صدائے درد آتی ہے — وہاں کی خاک سے پہلے جہاں تھا آشیاں میرا
رواں سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا — وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

اسی کو نعمت حسنِ بیاں بھی کہتے ہیں — کہ چپ بھی رہتے ہیں اور داستاں بھی کہتے ہیں

جہاں قدم نہیں رکھتے کسی کے دیوانے — اسی زمین کو ہم آسماں بھی کہتے ہیں

کسی طرف نظر یاس کر کے رو دینا
میری زباں میں اسی کو فنا بھی کہتے ہیں

یہ کس نے آخر شب پردہ ہائے نور سے جھانکا — کہ لو دینے لگا ہر ایک ذرہ بزم امکاں کا

نہیں ہے چشم انساں در خور کیف نظر ورنہ — ہر اک خاموش نقطہ میں ہے عالم محشرستاں کا

خمیر گل میں شاید ذرہ ہائے قلب بلبل ہیں — یہ کیا ہے ورنہ ہنس کر پھاڑنا جیب و گریباں کا

وہ عالم گر نظر آجائیں جو آنکھوں سے پنہاں ہیں — ابھی سارا بھرم کھل جائے دنیائے نمایاں کا

ازل کے دن نظر آئی تھیں وہ بکھری ہوئی زلفیں — ابھی تک ہے اثر دل پر اسی خواب پریشاں کا

قدم رکھنا سنبھل کر وادی الفت کے دیوانو — حد گلشن سے ہے دست و بغل ڈانڈا بیاباں کا

کوئی تفسیر باب زندگانی میں نہیں ممکن — حیات و موت بھی اک نام ہے تبدیل عنواں کا

معاذ اللہ ان جمعیتوں پر جب یہ عالم ہے — نہ جانے کیسا منظر ہوگا اجزائے پریشاں کا

ارادہ ہے کہ چندے یاس سے اب دل کو قوت دوں — کہاں تک کھاؤں گا دھوکا امید سست پیماں کا

مجھے گھیرے ہوئے ہے ہر طرف ذوق گنہگاری — یہ دنیا آئینہ خانہ ہے میرے نفس عصیاں کا

مہ و خورشید ہیں بگڑے ہوئے نقش قدم جس کے — کوئی دم کیجئے اندازہ اس کے روئے تاباں کا

اثر کچھ بھی سہی میں شوخئ جدت کا قائل ہوں — کہ وہ پیکاں سے بھرنا چاہتے ہیں زخم پیکاں کا

رواں ذوق سخن تیرا تجھے خود داد دیتا ہے
ترا انداز ہے انداز مرغان خوش الحاں کا

خوشی جو قلب غریب الوطن میں آئی ہے — شعاع نور ہے بیت الحزن میں آئی ہے

تیری نگاہ جراحت نواز کے صدقے | یہ تازگی میرے داغ کہن میں آئی ہے
کہاں نصیب تھی ہوش و خرد کے عالم میں | وہ ایک بات جو دیوانہ پن میں آئی ہے
چلو وہیں دلِ پژمردہ لے چلیں اپنا | جہاں سے بادِ بہاری چمن میں آئی ہے
ہر ایک ذرہ ہے جدت طراز رنگ بہار | جدید موج شراب کہن میں آئی ہے
ازل سے ہے یہی بابِ بہار کی سرخی | جو آفتاب کی پہلی کرن میں آئی ہے
نہ گل ہوئی ہے نہ شمع حیات گل ہوگی | ہزار باریوں ہی انجمن میں آئی ہے
ارے میرے دلِ خنداں کے روندنے والے | بہت دنوں میں بہار اس چمن میں آئی ہے

یہ تازگی یہ لطافت یہ سادگی یہ ادا
رواںؔ کسی کی شباہت چمن میں آئی ہے

انجام یہ ہوا ہے دلِ بیقرار کا | تھمتا نہیں ہے پانوں ہمارے غبار کا
پہلے کیا خیال نہ گل کا نہ خار کا | اب دکھ رہا ہے پانوں نسیم بہار کا
پیہم دیئے وہ رنج کہ انساں بنا دیا | منت پذیر ہوں ستم روزگار کا
اس کو خزاں کے آنے کا کیا رنج کیا قلق | روتے کٹا ہو جس کو زمانہ بہار کا
مجبوریاں غضب ہیں وگرنہ خدا کی شان | میں اور یوں گزار دوں موسم بہار کا
غافل نگاہ ہوش سے رنگ چمن کو دیکھ | پروردہ خزاں ہے زمانہ بہار کا

نکلا ہے دم رواںؔ کا تمنا کے ساتھ ساتھ
اللہ رے زور نالۂ بے اختیار کا

شاعر اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے۔ ملک کے سیاسی حالات اور قومی رجحانات سے بھی رواںؔ کا دل بہت متاثر تھا نظموں سے گذر کر غزل میں بھی ان تاثرات کی جھلک آگئی

ستم پر ناز تھا صیاد کو اِس کی خبر کیا تھی   کہ دینگی درس آزادی قفس کی تیلیاں مجھ کو
میں آواز سلاسل ہوں مقید رہ نہیں سکتا   پر پرواز آزادی ہیں میری بیڑیاں مجھ کو

اب میں حضرت رواں کی رباعیات کے متعلق کچھ لکھتا ہوں۔ رباعی اصناف نظم میں سے وہ صنف ہے جو چار مصرعوں پر ختم ہوتی ہے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرع کا ہم قافیہ ہونا لازمی ہے۔ رباعی کی بحر بحر ہزج میں مخصوص ہے اور اس میں دس ارکان مستعمل ہیں۔ قصائد میں مدح سرائی ہوتی ہے غزل میں اکثر و بیشتر حسن و عشق کے معاملات باندھے جاتے ہیں۔ رباعی کا میدان بہت وسیع ہے اِس میں ہر قسم کے مضامین کی گنجائش ہے لیکن حکمت و موعظت، اخلاقیات و الہیات، رندی و مستی کے ترانے اِس میں زیادہ گائے گئے ہیں۔ رواں سے پہلے اُردو شاعروں نے جو رباعیاں لکھیں وہ محض رسماً و رواجاً لکھیں یعنی ہر صنف شعر میں قدرت نظم کا ثبوت دینے کے لئے البتہ دبیر و انیس کو اِدھر زیادہ توجہ ہوئی۔ انھوں نے رباعی کے لئے ایک خاص مصرف نکال لیا تھا یعنی مرثیوں کی بسم اللہ رباعی سے کرتے تھے۔ اِن کی رباعیاں جو کچھ ہیں اور جس منزل تک ہیں خوب ہیں اصغر گونڈوی بھی اِن رباعیوں کے متعلق یہی لکھتے ہیں۔

"اُردو میں[1] رباعیاں اگرچہ کم و بیش عام شعرا نے لکھی ہیں مگر اِس میں میر انیس اور مرزا دبیر کو ایک خصوصیت امتیازی حاصل ہے لیکن جس زمانے میں اور جس مذاق و ضرورت کے ماتحت یہ رباعیاں لکھی گئیں

---

(۱) مقدمہ رباعیات رواں مرتبہ اُردو مرکز لاہور صفحہ ۱۲

اُس کے اعتبار سے اِن رُباعیوں کو اسی مقام پر رہنا بھی چاہیئے سلطان ابوسعید ابوالخیر، سحابی، عمر خیام اور سرمد وغیرہ فارسی شعرا نے جس طرح اپنے میدان کو مختص کر کے فارسی رباعیوں کو ایک خاص درجہ دیدیا اُس کی مثال اُردو میں بہت کم ہے۔ جناب رواںؔ کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو رُباعیوں میں جدید مذاق کو ملحوظ رکھکر فلسفیانہ پہلوؤں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے بیان میں دلآویزیاں پیدا کی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقلید و تتبع کے سیلاب میں بہتے نہیں بلکہ خود سوچتے ہیں اور اپنی گرہ کی چیز بازار میں پیش کرنا چاہتے ہیں اور اُن کی وہ خصوصیت ہے جس نے ہمیں اِن چند صفحات کے لکھنے پر مجبور کیا"

حضرت رواںؔ نے رباعیات اِس غور و فکر اور اِس انداز سے لکھیں کہ وہ اِن کا سب سے بڑا کارنامہ ہو گئیں۔ منصف مزاج سخن شناس اِس پر متفق الرائے ہیں علی گڈھ یونیورسٹی کے علمی و ادبی رسالہ سہیل بابت ماہ جنوری ۱۹۳۶ء کے صفحہ (ع) پر حضرت رواںؔ کے متعلق لکھا ہے۔

" دورِ جدید کے ممتاز شعرا کی صف اول میں تھے۔ آپ عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد تھے اگرچہ آپ کا سارا کلام ایک خاص کیفیت درد و اثر کی لئے ہوئے ہے مگر آپ کی رباعیاں خاص طور پر آپ کا کارنامہ ہیں"

لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی مقدمہ "رُوحِ رواں" میں صفحہ ۴۳ پر لکھتے ہیں۔

" انیس و دبیر کی بدولت رباعیوں کا ایک مختصر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے مگر اُن میں تنوع مضامین نہیں بلکہ دائرہ تخیل محدود ہے ......"

آگے چلکر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں،

" یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ رواں کی رباعیاں بہ اعتبار تنوع مضامین زبان اُردو میں ایک خاص اضافہ ہیں اور بقول جناب اثر اگر مشق جاری ہے تو کسی زمانے میں اُردو کے خیام کا لقب زیب دیگا"

واقعی حضرت رواں کی رباعیوں نے اُردو کے خزانے میں وہ بیش بہا اضافہ کیا ہے جس کی نظیر نہیں لیکن اس پر بھی بعض لوگوں کی کوتاہ نظری اور تنگ خیالی کی جو حالت ہے اُسے ایک اُردو کے ہی ادیب کی زبان سے سُنئے "ہم نے جب[۱] جناب رواں کی رباعیاں سُنیں تو ہم پر دیر تک ایک پُر کیف سکوت طاری رہا۔ ہمیں اِس کا اعتراف ہے کہ ہم ارباب فن نئے آداب" سے جیسے ہم اپنی زبان میں رسمیات کہیں گے بہت کم واقف ہیں ورنہ نعرہ تحسین سے اگر چھت نہ اُڑا سکتے تاہم فضا میں ایک ہلکی سی لہر تو ضرور پیدا کر دیتے۔ ہم نے موصوف سے یہ کہا کہ آپ اِن رباعیوں کو کتاب کی صورت میں شائع کرائیں ہمارے خیال میں اگر آپ کا کُل کارنامۂ شاعری ضائع ہو جائے جب بھی آپ کی یہ چند رباعیاں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور وہ اُردو شاعری کے لئے بجا طور پر قابل فخر یادگار ہونے کی مستحق ہیں لیکن ہمارے

۱؎ اصغر گونڈوی مقدمہ رُباعیات رواں صفحہ ۲

حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ بعض ارباب علم و فن" کے نزدیک اِن رباعیوں کو کوئی اہمیت نہیں چند شعرائے اُردو کی رباعیوں کے بعد انسانی دِل و دماغ سے رباعی لکھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہوگئی۔ پیشینوں کے اعترافِ کمال کا کتنا غلط مفہوم ہے علم بردارانِ علم و فن کے اِن فیصلوں سے نمایاں ہوتا ہے"۔

اس نا قدر شناسی اور کس مپرسی کے بارہ بار حضرت رواںؔ شکوہ سنج نظر آتے ہیں اور بڑی حسرت و یاس سے کہتے ہیں۔

گل ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدر داں میرا تو ہی دیکھ اے میرے خلاق حسن رائگاں میرا

بھلا دیگی ہمیں دو دن میں دُنیا —— ہماری شاعری کیا اور ہم کیا

خیر اس داستان کو جانے دیجئے یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ رباعیات رواںؔ سے لطف اندوز ہوجیئے۔ رباعی کی تعریف ہے کہ ہر مصرع پہلے مصرعے میں بڑھ چڑھ کے ہو اور چوتھا مصرع برجستگی و حسن معنی کے اعتبار سے رباعی کی جان ہو۔ رباعی لکھنے والے کا کمال اس میں ہے کہ وہ چار مصرعوں میں واحد شعر کی سی تاثیر، اور چستی پیدا کر دے یوں چار مصرعے کسی بحر میں بھی موزوں کر دینا بڑی بات نہیں۔ رواںؔ کی رباعیات اس معیار پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ بلحاظ معنی اِن میں بے انتہا تنوع ہے۔ مناظر قدرت جذبات و کیفیات، زندگی و مستی، فلسفہ و حکمت، جدید سائنس کے نظریئے، اخلاقیات والہیات سبھی کچھ ہے۔ اس اعتبار سے اُردو میں کسی کی رباعیوں کو رواںؔ کی

رباعیوں سے نسبت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن پر تبصرہ کرتے ہوئے لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی مرحوم نے اِن کے ساتھ ساتھ خیام کو پیش کیا ہے لکھتے ہیں۔

انساں معذور فکرِ انساں معذور ۔۔۔ یہ کس کو خبر کہ کیا ہے اس کو منظور
پیمانہ بدست رند اور اُس سے قریب ۔۔۔ تسبیح بدست واعظ اور اُس سے دور

"انسان[۱] اِس ادراک سے عاجز ہے کہ کون سا عمل اُس کی بارگاہ میں محبوب ترین ہے۔ ہزاروں سال سجدے کرے مگر بے سود اور ایک نعرۂ مستانہ بھی اُس کے تقرب کے لئے کافی ہے۔" رباعی بہ اعتبار بندش و چستی الفاظ فصاحت کا بہترین نمونہ ہے۔ عمر خیام نے بھی زاہد سے اِسی طرح خطاب کیا ہے۔

تو لائق نکتہ ہائے باریک نۂ ۔۔۔ جز در خور گور تنگ و تاریک نۂ
من فاسقم واز در حق دور نیم ۔۔۔ مسکیں تو کہ زاہدی و نزدیک نۂ

اِس دارِ فنا میں مقصدِ دل کیا ہے ۔۔۔ کہئے تعبیر خواب باطل کیا ہے
جب قلب کو ایک دم بھی راحت نہ ملی ۔۔۔ آخر اِس زندگی کا حاصل کیا ہے

"رباعی کا مقصد یہ ہے کہ شاعر کو حیرت ہے اِس دُنیا کا اور میری ہستی کا منشا کیا ہے۔ دِل کو جب دم بھر سکون نہیں تو پھر زندگی کا منشاء طلسم جب فانی تو اُس کے بنانے کی علت؟ اِس مضمون کو خیام نے بھی عجیب دلکش پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

۱؎ مقدمہ روح رواں صفحہ ۵۴ اور اُس کے آگے۔

ہر چند کہ رنگ و بوے زیباست مرا
چوں لالہ رُخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طرب خانہ دہر
نقاش من از بہر چہ آراست مرا

مصر عوں کی سجاوٹ تعریف سے بالاتر ہے۔

توصیف صفت کسی کو معلوم نہیں
اس کی غایت کسی کو معلوم نہیں
عالم ہے اسیر دام نیرنگ نمود
اصلی حالت کسی کو معلوم نہیں

"سلسلۂ علت و معلول تحقیقات کے بعد بھی منکشف نہ ہو سکا عالم کے دقیق النظر حکما اس بات کے معترف ہیں کہ اصلی علت کا پتہ ملنا دشوار ہے سقراط بھی اِسی خیال کا موید ہے۔ خیام نے بھی ایک رباعی میں یہی بات کہی ہے۔

ہر چند دلم ز علم محروم نہ شد
کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
اکنوں کہ بہ روے کار در می نگرم
معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

یہ کیا کہ حیات جاودانی کیا ہے
پہلے دیکھو جہان فانی کیا ہے
اِس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے روا
یہ تمھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

"زندگانی جاوید کی خواہش ہر دل میں پنہاں ہے اور انسان اِس فکر میں حیران و سرگرداں رہتا ہے کہ حیات ابدی کس طرح حاصل ہو مگر ناکامی کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ اُس کی جستجو غلط راستے اختیار کرتی ہے وہ موت کو منافی حیات سمجھتا ہے حالانکہ غور کرنا چاہئے کہ اصل منشا ہے زندگی کیا ہے یعنی اِس دُنیا اور ہستی دُنیا کا مآل کیا ہے۔ اگر راز سمجھ میں آجائے تو موت سے بے تعلق ہو جائے اور نخل حیات اِس طرح بار آور

ہو کہ خزاں کا اندیشہ نہ رہے۔ حیات و مرگ دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ اِس حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرے یہ بات جبھی حاصل ہو سکتی ہے جب حیات و مرگ کا اِس طرح تجربہ کیا جائے کہ یہ دونوں کیفیتیں بالارادہ ایک دوسرے میں منتقل ہو سکیں اِسی قدرت کا احساس تھا جس نے حافظ سے یہ شعر کہلوایا۔

عزم دیدار تو دارد جان بر لب آمدہ   باز گردد یا بر آید چیست فرمان شما

اُردو کا شاعر بھی کہہ گیا ہے ؎

فنا کیسی بقا کیسی جب اُس کے آشنا ٹھہرے

دِل تیشۂ باغباں سے کیوں مضطر ہو   شاید یہ قلم ہی نخل بارآور ہو
مقراض اجل ہے قاطع شاخ حیات   ممکن ہے اِسی میں رازِ جاں مضمر ہو

"جسے ہم اجل سمجھتے ہیں بہت ممکن ہے کہ حقیقی حیات وہی ہو۔ لہٰذا موت سے ہراساں نہ ہونا چاہیئے انداز بیان کی خوبی ظاہر ہے۔ کل حیات ایک نخل ہے اور ہر متنفس کی زندگی ایک شاخ ہے۔ بعض کو قطع کر کے باغبان اجل نئی قلمیں لگاتا ہے اِس طرح اور درختوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے جن میں اصلی قلم کی خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ زندگی کا مفہوم اِس سے وسیع ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ہم دوسروں میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ ایسے نقوش ایسی یادگاریں جن میں ہماری حیات کا پرتو ہے دوسروں کو ودیعت کر سکتے ہیں۔

فطرت کہتی ہے ظلمتوں کے اُس پشت   کیا ہو باران نور اگر ہو یک مشت

صبح خنداں کی اک حنائی انگشت
ہنگامہ طور کر رہی ہے برپا

"یہ رباعی صبح کی بے نظیر تصویر ہے۔ آفتاب کی پہلی کرن کو صبح خنداں کی "حنائی انگشت" کہنا کس قدر لطیف استعارہ ہے گویا ایک حسین معشوق از راہ شوخی انگشت حنائی بلند کر کے عاشقوں کو تہدید کر رہا ہے۔ یہ دلربا انداز دیکھکر فطرت کی ہر شے زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ جب اس ایک انگشت حنائی کے نظارے نے ہنگامہ طور برپا کر دیا تو شاید قیامت برپا ہو جائے اگر یہ شاہد رعنا (آفتاب) تدریجاً جلوہ نما ہونے کے بجائے یکایک نظر افروز ہو"

"رباعی کے چاروں مصرعے وسیع معانی کے حامل ہیں پہلے مصرعے سے صبح کا دھندلکا پیش نظر ہے۔ تمام فطرت شب یلدائے انتظار طے کر کے ظہور صبح کی مشتاق ہے۔ تاریکی چھٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ اشتیاق اور اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ یکایک افق مشرق سے صبح کی پہلی کرن ایک خوبصورت، ہنس مکھ معشوق کی انگشت حنائی کی طرح پردہ سے باہر نکلتی ہے۔ اب قلب عارف کے سرور و وجدان کا کیا پوچھنا۔ جو بیخودی ایک تبسم پنہاں سے ارنی گوے طور پر طاری ہوئی وہی حالت اس وقت اس کے دل کی ہے فوراً اس راز حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اگر جمال دوست پردے پردے میں اور وہ بھی بدرجہ نظر افروز نہ ہو بلکہ یکایک حجابات مجاز (جس میں ایک آفتاب بھی ہے) چاک کرتا

ہوا عیاں ہو تو کسے تاب نظارہ باقی رہے"۔
"چونکہ فطرت قائل ہے ہنگامۂ طور کے ٹکڑے سے صبح کی تمام
چہل پہل اور اُس کے سرور انگیز تاثرات کا نقشہ آنکھوں میں پھر
جاتا ہے۔ ہر شے اپنے خالق کی یاد میں مست ہے۔ طائر چہچہار ہے
ہیں درختوں پر وجد طاری ہے۔ شاخیں جھوم رہی ہیں۔ صحن چمن میں
نسیم لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہے۔ گلوں نے بند قبا کھول دئے موذن کی
اذاں اور ناقوس کی صدا ، فضا کو موسیقی سے لبریز کر رہے ہیں
دلوں کے ساغر بادۂ عرفاں سے چھلک رہے ہیں۔

دِل صرف حصولِ جام و مینا کر دے
جاں وقف حضورِ حسن یکتا کر دے

تو راز نشاط پوچھتا کیا ہے رواں
غرق مے ناب دین و دنیا کر دے

"شعرا کے کلام میں شراب سے مراد ہر جگہ شراب ہی نہیں بلکہ وہ حقائق
و معارف کی گفتگو بھی انھیں الفاظ میں کرتے ہیں بقول مرزا غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

"اِس رباعی میں شاعر کا خیال صرف معرفت ہے حسن یکتا (ذات احدی)
کے لئے وہ جان کو وقف کرنے کی ہدایت کرتا ہے اِس صورت میں
راز نشاط یہی ہے۔ اُس کی معرفت حاصل کئے بغیر اس کی حضوری دشوار
ہے۔ خیام بھی ایک رباعی میں اپنی سرمستی کا اظہار عجیب دلکش انداز
سے کرتا ہے۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ مرنے کے بعد کہاں جائیں گے
وہ اپنی سرمستی میں جواب دیتا ہے شراب میرے سامنے رکھ دے

اور جہاں جی چاہے جا۔

بائیم خریدار مئے کہنہ و نو | وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت | مے پیش من آرو ہر کجا خواہی رو

نوروز ہے غرق بادہ دنیا کردے | میرا ارمان آج پورا کردے
پی لوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی | تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کردے

"اردو میں اِس رباعی کی وہی منزلت ہے جو فارسی میں خیام کی رباعیوں کا مرتبہ ہے اِس کا زور اور جوش وخروش داد طلب ہے"

اب ایک دوسرے ادیب وشاعر اصغر گونڈوی مرحوم کی تشریحات کے ساتھ رواںؔ کی بعض رباعیاں سُنئیے۔

گر ریگ نہیں تو سطح دریا بھی نہیں | جوہر جو نہیں تو محض دھوکا بھی نہیں
یہ تو نہیں کہتے ہم کہ عالم کیا ہے | لیکن جو سمجھ رہے ہیں ایسا بھی نہیں

"اِس[1] بیان کی اصلی لطافت یہ ہے کہ ابتدائی دو مصرعوں میں عوام کی اِس ظن وتخمین کی جانب ہی اشارہ کیا گیا ہے جو کبھی کبھی عالم کی ماہیت کے بارے میں کیا گیا لیکن اِن خیالات کی تردید کے بعد یہ ذمہ داری محسوس ہو رہی تھی کہ عالم اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ سمجھ رہے ہیں عالم وہ نہیں ہے۔ عالم کے بارے میں اور ایک جگہ اِس تحیر کا اظہار فرماتے ہیں۔

پابندیٔ ذوق اہل دِل کیا معنی | دلچسپیٔ جنس مضمحل کیا معنی

---

[1] مقدمہ رُباعیات رواں مرتبہ اُردو مرکز لاہور صفحہ ۲۲ اور اُس کے آگے۔

اے ناظمِ کائنات کچھ تو بتلا آخر یہ طلسمِ آب و گل کیا معنی

"ایک جگہ تمام واردات کو افسانہ خوابناک کہتے ہیں پھر دُنیا اور نظمِ دُنیا کی طرف اشارہ کرکے انسانی مصروفیتوں اور کاوشوں پر اِس طرح اظہارِ تعجب کرتے ہیں۔

دردِ دلِ چاک چاک کس سے کہئے افسانۂ خوابناک کس سے کہئے

دُنیا معلوم نظمِ دُنیا معلوم بے وجہ کا انہماک کس سے کہئے

"بے وجہ کا انہماک کس سے کہئے"، معنویت کے علاوہ بہ لحاظ لطافت و برجستگی بھی اِس مصرع کی تعریف نہیں ہو سکتی،

"روح انسانی ایک جوہر لطیف ہے خدا کے ساتھ انقیاد و محبت اس کا خاصہ ازلی ہے۔ اِس جسد عنصری میں پہونچکر اپنی دیرینہ عظمت کی تلاش ایک تقاضائے فطری ہے لیکن اِس طلب و جستجو کی راہیں اگر مختلف ہوں تو اس سے اصل جذبۂ طلب و جستجو پر کوئی حرف نہیں آتا اور مذہب حقیقی معنوں میں اِسی طلب و جستجو کا نام ہے۔

اپنی عظمت کی آرزو سب کو ہے اگلی حالت کی آرزو سب کو ہے

تفریق مذاہب ایک دھوکا ہے رواںؔ کھوئی دولت کی آرزو سب کو ہے

"محققین کے نزدیک سوسائٹی یا ہیئت اجتماعیہ کی مثال اس زنجیر کی ہے جس میں بے شمار کڑیاں ہوں اور وہ سب کی سب باہم مربوط ہوں اگر اِن میں سے ایک چھوٹی سے چھوٹی کڑی بھی الگ ہوجائے تو زنجیر کی کل ہیئت زنجیری برباد ہو جائے۔ اِس لئے

سوسائٹی کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی جماعت کے نظام ترکیبی کا ایک ضروری عنصر ہے اِسی اصول کی بنا پر باوجود اِس کے کہ ہر فرد اپنی فردیت کے اعتبار سے اپنی ہر چیز کا مالک ہے مگر بایں ہمہ اُسے یہ حق حاصل نہیں کہ خود کشی کر سکے۔ اِس لئے کہ خود اُس کی فردیت اُس کی ذاتی چیز نہیں بلکہ سوسائٹی کی ہیئت کاملہ کا ایک ترکیبی جزو ہے جس کے ضائع ہونے سے جماعت کی کل ہیئت تعمیری و ترکیبی کو صدمہ پہونچتا ہے۔ اِس لئے وہ سوسائٹی ہی کی چیز ہے اور سوسائٹی کی عظمت اور اُس کا قیام وبقا اسی کی حقیر و ناتواں ہستی کا رہین منت ہے۔ وہ لوگ جن کی حکیمانہ نظر ہیئت اجتماعیہ کے اِس نکتہ پر ہے وہ کسی کمزور سے کمزور اور معمولی سے معمولی فردیت و شخصیت کو بھی بنظر تحقیر نہیں دیکھتے۔ جناب رواںؔ اِس حقیقت کو ذرہ اور کوہ و صحرا قطرہ اور موج و دریا کی تشبیہوں کے ساتھ بے نقاب کرتے ہوئے یہ بلیغ اشارہ بھی کر رہے ہیں کہ کوہ و صحرا کی وسعت و بلندی موج و دریا کا زور شور، امرا کا تزک و احتشام، ذرہ و قطرہ یعنی غریب اور حقیر افراد کی بدولت ہے۔"

ذرہ جو نہیں تو کوہ و صحرا بھی نہیں ۔۔۔ دریا جو نہیں فضائے بالا بھی نہیں
قطرہ جو نہیں تو موج دریا بھی نہیں ۔۔۔ اے ہستیِ بے نوا یہ ہنستے والے

ان دو ادیبوں نے رباعیات رواںؔ پر تبصرے کئے ہیں اُن کے مندرجہ بالا اقتباسات سے بخوبی ظاہر ہے کہ یہ رباعیاں اُردو

میں مخصوص منزلت رکھتی ہیں اِن کو دیکھکر قارئین کے دل میں جو اشتیاق پیدا ہوگا اُس کا احترام کرتے ہوئے چند رُباعیاں اور پیش کرتا ہوں

رُباعی

کس کے جلووں کی یہ فراوانی ہے
کیسی آخر یہ بزم نورانی ہے
یہ ماہ دو ہفتہ اور یہ صبح جمیل
کس کا رخسار کس کی پیشانی ہے

مانا کاوش تھی، کاوشِ غم تو نہ تھی
گریہ تھا مگر نوائے ماتم تو نہ تھی
بچپن میں جو بات تھی جوانی میں کہاں
خندہ بھی تھا پھر فشانِ پیہم تو نہ تھی

پھر قلب پہ بجلیاں گراتی آئی
ہر سمت اِک آگ سی لگاتی آئی
کیسے جاتے ہیں زخمہائے کہنہ
پھر صبح بہار مسکراتی آئی

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
ایک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

اُف باغِ اُمید کے نمو کی تاثیر
پتے پتے کے رنگ و بو کی تاثیر
کانٹوں میں بھی دلکشی گلوں کی سی ہے
اللہ رے فریب آرزو کی تاثیر

جب نفس پہ فتحیاب ہو جاتا ہے
انسان عظمت مآب ہو جاتا ہے
اُف عشق کے سوزشِ دروں کی تاثیر
ہر داغِ دِل آفتاب ہو جاتا ہے

تقدیر کا راز فاش ہو جانے دے
قربان رزق معاش ہو جانے دے
اِک لذتِ غم میں دو جہاں کی خوشیاں
صدقے ہو جائیں کاش ہو جانے دے

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے
دِل بے پرواز ہے اسیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعث قید رواں
محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

دِل مائل گریہ کس لئے ہوتا ہے
کیوں بے سبب آنسوؤں سے منہ دھوتا ہے

جب موت یقینی ہے تو کیوں روتا ہے

لاحل نہیں عقدۂ صعوبات جہاں
ہے معجزۂ حیات امید حیات
ہے لطف و غم زمانہ تنقید حیات
ہے جان کے ساتھ آرزو جینے کی
بیشک ہوتی ہے اِس سے تائید حیات

میں نور چراغ بزم جانانہ ہوں
خود آپ ہی شمع آپ پروانہ ہوں
چُپ ہوں جب تک کہ نامکمل ہوں ابھی
روشن ہوتے ہی گرم افسانہ ہوں

جب زندہ دلوں ہیں زندہ دِل ہے دُنیا
اور مضمحلوں میں مضمحل ہے دُنیا
ترتیب دیا ہے دل نے یہ نکتۂ خاص
ہم سب فانی ہیں مستقل ہے دُنیا

کل صبح نے مسکرا کے تاروں سے کہا
ہو جائینگے اب تمھارے انوار فنا
تاروں نے کہا کہ ہم رہیں گے یوں ہی
تو آئیگی اور ختم ہو جائیگی آ

جتنے انوار حسن صورت کے ہیں
سب نغمہ نواز بزم قدرت کے ہیں
یہ آب و سحاب و برق و باد و باراں
پردے دو چار ساز فطرت کے ہیں

پھر وصل ہی وصل ہو جدائی نہ رہے
تفریق گناہ و پارسائی نہ رہے
اسرار حیات کو سمجھنے کے لئے
لازم ہے خودی و خود نمائی نہ رہے

اپنے ساقی سے کل یہ پوچھا میں نے
کتنے میخوار تشنہ لب آتے ہیں
بولا کہ مقدرات ہیں بادہ و ظرف
آنے کی اگر کہو تو سب آتے ہیں

میرے ساقی شراب صافی دینا
کچھ جس سے گنہ کی ہو تلافی دینا
اُترے نہ خمار زندگی بھر جس کا
ایسی دینا اور اتنی کافی دینا

تابع ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے
آزادیٔ دِل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے باز آئے ہم
فطرت سے ہمیں جدا کئے دیتی ہے

مخمورِ مئے سحر ہیں مرغانِ چمن
غنچہ غنچہ ہے زمزمہ خوانِ چمن
سوکھی کلیوں کے پاس بھی ہو کے ذرا
اے موجِ نسیمِ صبح اے جانِ چمن

—

ساقی مئے صاف ارغوانی لانا
کم جس سے ہو کچھ غمِ نہانی، لانا
ترسی ہوئی مدتوں سے ہے روحِ رواں
سرچشمۂ بادۂ جوانی لانا

—

حیران نہ ہو مرضیِ مولا کیا ہے
دُنیا کیا ہے مآلِ دُنیا کیا ہے
سرگرمِ عمل ہوتا بہ امکانِ عمل
اس سے بے فکر یہ نتیجا کیا ہے

—

دل تو نے دیا ہے، ذوقِ غمخواری دے
جاں دی ہے تو نفرتِ دل آزاری دے
تخلیق کی غائتوں کو پورا کر لیں
آنکھیں دی ہیں تو نورِ بیداری دے

—

محفوظ ستم اگر یہ چھالا ہوتا
دل کا انداز ہی نرالا ہوتا
دیکھو دیکھو کہاں رکھے دیتے ہو پاؤں
تم نے آئینہ توڑ ڈالا ہوتا

—

مطلوب ہے زخمِ دل جو سیتے نہ بنے
جینا کس کام کا جو جیتے نہ بنے
مے مجھکو حلال ہی نہیں بلکہ ثواب
مے اُس پہ حرام جس سے پیتے نہ بنے

—

حالِ دل کچھ خراب سا رہتا ہے
یعنی اک پیچ و تاب سا رہتا ہے
کھلتا نہیں رازِ وجہِ کلفت لیکن
ہر وقت اک اضطراب سا رہتا ہے

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے ہمعصر سخنور کی وفات پر اِس طرح اشکِ ماتم بہائے ہیں۔

کیا موت نے تصویر مٹائی افسوس
اِک آن میں ہو گئی جدائی افسوس
ایامِ شباب اور پیغامِ فنا
اے عمرِ رواں یہ بیوفائی افسوس

—

اِک ایسا صدمۂ جانکاہ پہونچا ہے کہ سہ رہکر
خود اپنی زندگی کی تلخیوں کو بھول جاتا ہوں

نہ پوچھ اس عزتِ غم کو کہ ہو جاتا ہوں شرمندہ
اگر بھولے سے بھی میں تیرہ قسمت مسکراتا ہوں

کبھی سازِ خرد کی سادہ مشی پر آہ بھرتا ہوں
کبھی زلف جنوں کی برہمی پر سر جھکاتا ہوں

نہ جانے کون مطرب اُٹھ گیا ہے بزمِ عالم سے
کہ اپنے دل کے اندر ایک سناٹا سا پاتا ہوں

فضا تاریک ہو جاتی ہے تارے کانپ اُٹھتے ہیں
رواں کی موت پر راتوں کو جب آنسو بہاتا ہوں

مادھو رام جوہر

فرخ آباد کے ساہوکاروں میں جوہر کا خاندان بہت ممتاز اور باوقار سمجھا جاتا تھا۔ تموّل کے ساتھ اِس خاندان میں علمی ذوق کی بھی فراوانی تھی شعرو ادب سے بڑی دلچسپی تھی جوہر لالہ جواہر مل کے بیٹے تھے۔ ملکۂ شاعری خداداد ملا تھا۔ منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے تلمذ حاصل کیا مطالعہ اور مشقِ سخن سے شاعری کے جوہر کو خوب چمکایا۔ علم عروض و قافیہ میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ سخن سنجی و سخن گستری میں اپنے وقت کے مسلمہ اُستاد تھے۔ اہلِ ہنر اور اہلِ سخن کے بڑے قدر دان تھے اُن کے ساتھ بہت سلوک و مراعات کیا کرتے تھے۔ منیر اُن کی وجہ سے اکثر مدتوں فرخ آباد میں قیام کرتے، شب و روز شعر و سخن کے چرچے اور جلسے رہتے۔ کبھی جوہر خود دہلی لکھنؤ اور اکبر آباد میں، جو شاعری کے گہوارے تھے، جاکر مہینوں قیام کرتے اہلِ کمال سے صحبتیں گرم رہتیں

سخنوری و سخن فہمی کی داد دیتے۔ غرض جوہرِ شمعِ کمال کے پروانے تھے اور دِن رات اسی کے عشق میں زندگی کاٹتے تھے۔

خاندانی وجاہت اور ذاتی قابلیت کے باعث بہادر شاہ کے آخر زمانہ سلطنت میں مختار شاہی کا عہدہ اِن کے لئے تجویز ہوا تھا سال ولادت معلوم نہ ہو سکا مؤلف خمخانہ جاوید نے لکھا ہے کہ اوایل چودھویں صدی ہجری میں انتقال کیا سید رفیق احمد مارہروی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۹۰ء[1] میں رحلت کی۔

کلام میں صرف غزلیات کا کچھ انتخاب نظر سے گزرا بڑا عمدہ اور مزیدار کلام ہے۔ مضامین کے لحاظ سے تو وہی شانہ و آئینہ، رقیب و رقابت، طعن و تشنیع، بوسہ و دشنام، نامہ و پیام ہجر و وصال کے اذکار و معاملات ہیں لیکن اس صفائی، شوخی اور خوبصورتی سے نظم ہوئے ہیں کہ طبیعت پھڑک اُٹھتی ہے۔

نیند آنکھوں میں بھری ہے کہاں رات بھر رہے ۔۔۔ کس کے نصیب تم نے جگائے کدھر رہے
تڑپ رہا ہے دِل اک ناوک جفا کے لئے ۔۔۔ اُسی نگاہ سے پھر دیکھئے خدا کے لئے
محبت کیجئے ظاہر نہ مجھ سے بندہ درگزرا ۔۔۔ بڑے میرے نصیب اللہ مجھ پر آپ مرتے ہیں
بوئے گل سونگھ کر بگڑتے ہیں ۔۔۔ یہ پری رو ہوا سے لڑتے ہیں

اسی رنگ میں درد و اثر کی کیفیت بھی پیدا کرتے ہیں۔

اُس نے پھر کر بھی نہ دیکھا میں اُسے دیکھا کیا ۔۔۔ دیدہ یا دِل راہ چلتے کو یہ میں نے کیا کیا

---

[1] عشرت کے تذکرے میں بھی یہی سن وفات درج ہے۔

غیر ممکن ہے جو ٹھنڈا ہو کلیجہ اُن سے — اور وہ آگ لگائینگے بجھانا کیسا
یوں تو مُنہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو — جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے
جس نگاہوں سے لیا ہے دلِ شیدا میرا — ڈھونڈھتا ہے اُنھیں تیروں کو کلیجا میرا
ہوگی ضرور صبح تیری اے شب فراق — ہم کو نصیب دیکھئے ہو یا سحر نہ ہو
کبھی ایسی صفائی اور درد کے ساتھ بڑی سچی اور لگتی ہوئی باتیں کہہ جاتے ہیں
اور بڑی جامعیت کے ساتھ جو اُستادی کی خاص شان ہے۔
کیا یاد کرکے روؤں کہ کیسا شباب تھا — کچھ بھی نہ تھا ہوا تھی کہانی تھی خواب تھا
دوست دو چار نکلتے ہیں کہیں لاکھوں میں — جتنے ہوتے ہیں سوا اتنے ہی کم ہوتے ہیں
ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں — اے آسمان میں بھی کبھی آفتاب تھا

جو مصرع ضرب المثل ہے۔

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

آپ ہی کا ہے۔ پورا شعر سُن لیجئے۔

بھانپ ہی لینگے اشارہ سر محفل جو کیا — تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

ندرت سے بھی آپ کا کلام خالی نہیں۔

نہ ابروے پرخم نگہ برگشتہ — ہم نے ٹیڑھا جسے دیکھا اُسے خنجر جانا
میرے ہوتے نگہ قہر رقیبوں کی طرف — دیکھئے دیکھئے یہ تیر خطا ہوتا ہے

کچھ اور اشعار درج ذیل کرتا ہوں۔

آتی ہے اُس کے کوچے سے آواز دردناک — ہم ہوں کہ دل ہو کوئی تو دونوں میں مر گیا

وصف لکھا ہے جو ابروئے بت دلخواہ کا ۔۔۔ میرے مطلع پر ہے دھوکا سب کو بسم اللہ کا
وصف حسن پاک کی تحریر سے اے شمع طور ۔۔۔ صفحۂ دیواں میں ہے عالم تجلی گاہ کا
اختر اقبال جب چمکا کیا سجدہ تجھے ۔۔۔ عرش کا تارا ہے ہر ذرہ تیری درگاہ کا
تو جو کاہیدوں کو غالب اہل رفعت پر کرے ۔۔۔ ہیں دے کوہ گراں کو بوجھ برگ کاہ کا
ہیں تیری درگاہ میں ہمدوش فقر و سلطنت ۔۔۔ مرتبہ یکساں نظر آیا گدا و شاہ کا

روز کہتے تھے کبھی غیر کے گھر دیکھ لیا ۔۔۔ آج تو آنکھوں سے اے رشک قمر دیکھ لیا
آہوں سے آگ لگا دینگے دل دشمن میں ۔۔۔ چھپ کے رہتے ہیں جہاں آپ وہ گھر دیکھ لیا
ہم سے پردہ ہے کہیں چاندنی کی سیریں ہیں ۔۔۔ کھل گیا حال بس اے رشک قمر دیکھ لیا
کون سوتا ہے کسے ہجر میں نیند آتی ہے ۔۔۔ خواب میں کس نے تمھیں ایک نظر دیکھ لیا
آنکھیں سلواریں مگر ذوق تصور نہ گیا ۔۔۔ گو نظر بند ہوئی تو بھی ادھر دیکھ لیا
بچ گیا نقد دل اب کے تو نظر سے اس کی ۔۔۔ آئیگا پھر بھی اگر چور نے گھر دیکھ لیا
اتنی سی بات پر آنکھیں نہ نکالو صاحب ۔۔۔ کیا خطا کی تمھیں جو ہم نے اگر دیکھ لیا

کیا یاد کرکے روؤں کہ کیسا شباب تھا ۔۔۔ کچھ بھی نہ تھا ہوا تھی کہانی تھی خواب تھا
اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں ۔۔۔ وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

یہ مصرع ۔

وہ دِن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

ضرب المثل ہے ۔

محمل نشیں جب آپ تھے لیلےٰ کے روپ میں ۔۔۔ مجنوں کے بھیس میں کوئی خانہ خراب تھا
پیری میں ایک ہی سے ہمیشہ رہینگے دن ۔۔۔ وہ اور تھا زمانہ جسے انقلاب تھا

تیرا قصور وار خدا کا گنا ہگار
ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں

ارمان سب نکال لے دُنیا ہے چار دن
کیا پوچھتا ہے ہجر کی شب کی مصیبتیں
مستوں نے بس میں رحمتِ حق کو بھی کرلیا
کیوں مضطرب ہیں شام سے ایسے جو آج آپ

یاد آتے ہیں جوانی کے مزے پیری میں
بھنکے دِل کی طرف تیر لفظِ بسم اللہ
غیر ممکن ہے جو ٹھنڈا ہو کلیجہ اُن سے
آخر اک روز تو پیوندِ زمیں ہونا ہے

غیر کے دِل کو مئے عشق سمجھکر دینا
بیوفا ذات حسینوں کی ہے اے حضرتِ عشق
مینہ برستا ہے ہوا چلتی ہے خوب اے ساقی
کہتے پھرتے ہیں یہ کوچے میں پریزادوں کے
دردِ سر کا نہ شبِ وصل چلے گا فقرہ
یار بندے ہیں محبت کے فقط اے ساقی
یہ بھی ہے ڈھنگ کوئی بادہ کشی کا کیا خوب

بوئے گل سونگھ کر بگڑتے ہیں
دِل نچے شہرِ حسن میں کیوں کر

جو کچھ کہ تھا یہی دلِ خانہ خراب تھا
اے آسمان میں بھی کبھی آفتاب تھا

باقی جو رہ گیا وہ پھر اے یار رہ گیا
اکثر نکل نکل کے دم اے یار رہ گیا
رندوں میں گھر کے ابر گھر بار رہ گیا
کہئے تو کس گلی میں دِلِ زار رہ گیا

قدرت اللہ کی تھا وہ بھی زمانا کیسا
دیکھیں تو آپ اُڑاتے ہیں نشانا کیسا
اور وہ آگ لگا دینگے بجھانا کیسا
جامۂ زیست نیا اور پُرانا کیسا

جام کم ظرف ہے مُنہ تک نہ کہیں بھر دینا
دِل کو دینا تو ذرا سوچ سمجھکر دینا
لے اُڑے پیتے ہی ایسا کوئی ساغر دینا
خانہ برباد ہیں رہنے کو کوئی گھر دینا
دم دلا سے یہ کسی اور کو جا کر دینا
شیشہ جس دل سے اسی آنکھ سے ساغر دینا
یہ کسی اور کو مُنہ پھیر کے ساغر دینا

یہ پری رو ہوا سے لڑتے ہیں
لوٹ ہوتی ہے ڈاکے پڑتے ہیں

نامہ بر نا امید آتا ہے
ہائے کیا سست پانوں پڑتے ہیں

یہ واعظ کیسی بہکی بہکی باتیں ہم سے کرتے ہیں
کہیں چڑھ کر شراب عشق کے نشے اُترتے ہیں

محبت کیجئے ظاہر نہ مجھ سے بندہ درگزرا
بڑے میرے نصیب اللہ مجھ پر آپ مرتے ہیں

ہر اک موسم میں کشت آرزو سرسبز رہتی ہے
نہ دردِ غیر کو ہوگا یہاں تو چین کرتے ہیں

یہ جوڑا کھولنا بھی پیچ سے خالی نہیں انکا
اُلجھ جاتا ہے دِل جب بال شانوں پر بکھرتے ہیں

تکلف کے یہ معنی ہیں سمجھ لو بے کہے دِل کی
مزا کیا جب ہمیں سنئے یہ کہا تم سے کہ مرتے ہیں

جھومتے آتے ہیں کیا ابر سیاہ
نشہ میں چور یہ متوالے ہیں

ناتوانی کے سبب اے وحشت
خار بھی میرے لئے بھالے ہیں

اس طرح جھوم کے چلیئے نہ حضور
سب کہینگے کہ یہ متوالے ہیں

آتش گل سے مناسب ہے خدارا بلبل
ہاتھ دھوتا ہے کوئی جان کے انگاروں پر

چار آنکھیں ہوتے ہی برچھی جگر پر چل گئی
بات کچھ مُنہ سے نہ نکلی رہ گئے ہم دیکھکر

دو ہی دِن میں یہ صنم ہوش رُبا ہوتے ہیں
کل کے ترشے ہوئے بت آج خدا ہوتے ہیں

تصور زلف کا ہے اور میں ہوں
بلا کا سامنا ہے اور میں ہوں

بتوں کو کیوں دیا یہ قد و قامت
قیامت میں خدا ہے اور میں ہوں

کیا بتائیں مزاج کیسا ہے
ہم کہاں دِل کہاں خدا جانے

عمر بھر مفت میں کھویا کئے ناداں رہے
دِل نے چاہا جسے اُس کے لئے حیران رہے

یوں تو مُنہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو
جب میں جانوں کے میرے بعد مرا دھیان رہے

کیا بتاؤں کس طرح دِل آگیا
کیا کہوں کیونکر محبت ہو گئی

جواہر سنگھ جوہر

اِس صاحب کمال کے متعلق تذکروں سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کا وطن کہاں تھا اور کس سرزمین کو اِس کی ولادت کا فخر حاصل ہوا اور کب مصنف خمخانہ جاوید نے لکھا ہے کہ جوہر راجا لال جی بہادر کے جو سرکار امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ میں سلطنت اودھ کے بخشی فوج تھے خواہر زادے تھے۔ اِس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب و شعر کا پایۂ تخت لکھنؤ آپ کا وطن تھا اور انیسویں صدی کے ربع اول کے آخر میں یا ربع دوئم کے شروع میں آپ کی ولادت ہوئی۔ لکھنؤ میں کایستھ بڑے بڑے عالم و فاضل اور سخنور ہوئے ہیں انھیں میں آپ کا خاندان بھی تھا۔ آپ کے والد منشی بختاور سنگھ زبردست عالم اور سخنور کامل گزرے ہیں۔ راقم تخلص کرتے تھے۔ جوہر اپنے والد سے بھی سبقت لے گئے اور آسمانِ سخن پر آفتاب کی طرح چمکے۔ فارسی کے عالم متبحر اور شاعر باکمال تھے۔ گل محمد خاں ناطق سے تلمذ تھا۔ اُردو میں خواجہ وزیر سے مشورت کی۔ پھر خود اُستاد ہو کر رہے۔ آپ کا کلام عروسِ شاعری کا بیش بہا زیور ہے اور بزم ادب کے لئے صد مایۂ زینت۔

آپ کے ایک مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں لکھنؤ کے تحصیلدار رہے۔

پوچھتے ہیں مجھ کو یوں قاصد سے وہ   جوہر تحصیلدار لکھنؤ

جب سلطنت اودھ کو زوال ہوا تو مہاراجا سر درگجے سنگھ والی بلرامپور آپ کے علم و فضل اور کمال کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ آپ کو اپنے پاس بلا کر رکھا۔ دوستانہ نوازشیں کرتے رہے اور فیض صحبت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ زندگی بھر اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دیا ۱۸۸۱ء میں جوہر نے انتقال کیا۔

جوہر تمام عمر اپنے خون جگر سے سینچ سینچ کر چمنستان اُردو کو شاداب کرتے رہے۔ ایسے ایسے سدا بہار پودے لگائے اور ایسے ایسے پھول کھلائے جن کی شمیم جانفزا دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ پانچ دیوان اپنی جگر کاویوں کا ثمرہ چھوڑے۔ دو مطبع نولکشور اور تین مطبع رفاہ عام سیالکوٹ میں چھپے۔ مصنف کے زمانے میں کچھ جلدیں ہدیۃً دوست احباب میں بٹ گئی ہونگی باقی ان مطبعوں کی الماریوں میں مدتوں مدفون رہی ہونگی پھر کیڑے چاٹ گئے ہونگے۔ آج اُردو دنیا میں نہ جوہر کا کوئی نام جانتا ہے نہ اُن کا کلام کہیں دیکھنے یا سننے میں آتا ہے وہ کلام جو موتیوں میں تولنے کے قابل تھا۔

واجد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے زمانے میں اُردو شاعری جس شغلۂ تعشق و تعیش سے عبارت تھی وہ محتاج تشریح نہیں جس قسم کے عشق بازانہ، مبتذل یا بادر ہوا اشعار سے اس دور کے دواوین بھرے پڑے ہیں اُن سے اُردو دنیا نا واقف نہیں۔ اُس وقت کیسا ہی پاکیزہ خیال شاعر ہوتا اس ہوا سے اُسے بچنا محال تھا اس لئے

کہ خاص وعام کا یہی مذاق تھا۔ جوہر بھی اس رنگ سے کلیتہً بچ تو نہ سکے
لیکن اس میں اپنی انفرادیت کے ایسے نقوش ثبت کر دئے جو پاکیزگی سے
ہمدوش ہیں۔ خواجہ وزیر کے شاگرد ہونے کے لحاظ سے خاندان ناسخ
سے منسلک تھے۔ ناسخ نے خارجی مضامین کے اصنام تراشے جو خیالی نقش
ونگار سے مزین ہیں اور نہایت خشک وبے کیف۔ خواجہ وزیر نے اس انداز
میں رنگینی و دلکشی پیدا کی اور ناسخ کے شاگردوں میں بہت مشہور ہوئے
ایک غزل تو ایسی کہہ گئے جو ہمیشہ اہل ذوق کو تڑپایا کرے گی۔

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر ۔۔۔ زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

لیکن ان کا اصلی رنگ یہ تھا۔

گر الٹ کر دیکھئے تصویر پشت آئینہ ۔۔۔ سیدھی ہو جائے ابھی تقدیر پشت آئینہ
کرتے ہو باتیں رکھ کے جو شمشیر دوش پر ۔۔۔ سیکھے زبان تیغ نہ تقریر دوش پر
تماشا دیکھتا ہے وہ اثر اس چشم جادو میں ۔۔۔ اشارے سے کرے گی رقص پتلی چشم آہو میں
قوت بازو ہوئی ہیں اے سمن بر انگلیاں ۔۔۔ طائر رنگ حنا کو تنکیں پر انگلیاں

ناسخ اسکول کا انداز دیکھتے ہوئے جوہر کے یہاں بھی کاغذی گل بوٹوں
کی ہی توقع ہو سکتی تھی مگر ایسا نہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جذبات
کی آنچ بھی دی اور درد واثر بھی بھرا چونکہ فارسیت دل ودماغ میں
بسی ہوئی تھی اس کا جلوہ اردو میں بھی جھلک رہا ہے۔ فارسی الفاظ
اور ترکیبیں بہت برتتے ہیں مگر اس سلیقہ سے جیسے نگینے جڑ دئے ہوں
شعر جگمگا اٹھتا ہے اور اس کے دلکشی کی انتہا نہیں رہتی کس شکوہ

و جلال کا مطلع کہا ہے۔

دیکھتا ہے صبحدم وہ مہر انور آئینہ ۔۔۔ بنگیا ہے مطلع خورشید خاور آئینہ

ذیل کا مطلع کیسا شاندار، خوبصورت اور دل ہلا دینے والا ہے۔

اور دیکھئے۔

بھڑکی گلوں سے آتش دل ہجر یار میں ۔۔۔ پھُنک جائے باغ آگ لگے اس بہار میں

دل ناشگفتہ رہگیا کوشش ہزار کی ۔۔۔ اس باغ میں ہوا ہی نہ آئی بہار کی

پہلے مصرعے میں "ناشگفتہ" کی ترکیب یاقوت کا ایک ٹکڑا ہے۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت بھی غور طلب ہے۔ یعنی ارمان، اُمید، آرزو، ولولہ اور ساری وہ دنیا جس سے زندگی میں رنگینی اور جان ہے ایک غنچۂ ناشگفتہ میں سمٹ سمٹا کر ختم ہو گئی۔ اب "کوشش ہزار کی" کی جامعیت دیکھئے یعنی اس غنچہ کے کھلانے میں تمام انسانی مساعی و تدابیر میں سے کوئی اُٹھا نہ رکھی گئی مگر اسے نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ اس کی شگفتی ہوائے بہار پر منحصر تھی دوسری لاکھ تدابیر عمل میں آتیں کیا ہوتا سو ہوائے بہار نے اِدھر رخ ہی نہ کیا۔ "ہی" کی بلاغت داد سے مستغنی ہے ایک بار شعر کو پھر پڑھئے اور لفظ پر غور کیجئے۔

دل ناشگفتہ رہگیا کوشش ہزار کی ۔۔۔ اس باغ میں ہوا ہی نہ آئی بہار کی

ذیل کا مطلع کس دبدبہ اور بلند آہنگی کے ساتھ کہا ہے اور کس بلند ہمتی کا سبق دیا ہے۔

جو ہے جری بحکم خدا لازوال ہے ۔۔۔ شہباز ہے حرام کبوتر حلال ہے

بحکم خدا، کا وہ ٹکڑا رکھ دیا ہے جس پر معنویت و بلاغت نثار ہوتی ہے
خوبصورتی اور دلکشی آپ کے کلام کے نمایاں وصف ہیں، اخلاق، تصوف
اور معرفت کے موتی بھی اسی رنگ میں آپ نے بکھیرے ہیں اور اس فراوانی
سے کہ مابہ الامتیاز کی صورت اختیار کر لی ہے۔

کس کو ہے اس کے فروغ شمع وحدت کی نظر — ایک موسیٰ ہی تھا پروانہ تجلی گاہ کا
قصور اے شیخ دیں ثابت نہیں منصور و سرمد کا — انا الحق حسن سنت ہے انا بے میم احمد کا
کیوں طاق کعبہ رخنۂ دیوار کعبہ ہے — زاہد جو اس کا تیر نظر کارگر نہ تھا
سب کھینچتے ہیں نالۂ گرم اس کے واسطے — اک شمع نے لگائی ہے یہ انجمن میں آگ
نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا — فقط ایک نام نکوئی رہے گا

اوپر کا شعر ضرب المثل ہے۔

دیکھنے کو دو ہیں آنکھیں در حقیقت اک ہے نور — ایک ہی جلوہ ہے اس کا کافر و دیندار میں

اوپر جو چند جواہر پارے پیش کئے گئے خمخانۂ جاوید سے منتخب ہیں۔ کچھ
اور اسی سے نقل کرتا ہوں۔

اصل مطلب ایک ہے آگاہ نا آگاہ کا — ہے الکھ کا ترجمہ عربی میں لفظ اللہ کا
دیکھے جو بنا ہوا انساں صنعت رب حفیظ — طاق ابروے بتاں گنبد ہے بسم اللہ کا
کس کو ہے اس کے فروغ شمع وحدت کی نظر — ایک موسیٰ ہی تھا پروانہ تجلی گاہ کا
پسند عاشقاں نغمہ ہے یہ درد و مصیبت کا — کہ بزم عیش میں گاتے ہیں مضموں سوز و فرقت کا
پری و حور ہیں ناجنس کیا لطف آدمیت کا — بشر ہیں ہم بشر سے ہے مزہ اپنی طبیعت کا
خدا نے لذتیں دنیا میں دیں تم بد سمجھتے ہو — نتیجہ زاہدو اچھا نہیں کفران نعمت کا

خدا کا بیٹا یا معشوق کہنا کفر مطلق ہے — منزہ سب سے ہے رتبہ خداوند حقیقت کا
الوہیت، فنا، تخلیق شانیں خاص اُس کی ہیں — پرستش کرتے ہیں ہم نام رکھکر اُس کی قدرت کا
صنم بھی اس کے مظہر ہیں کروں سجدہ نہ کیوں جو تم — نظر آتا ہے جو کچھ ہے نمونہ اُس کی قدرت کا

ترے ہنسنے نے کر دی عشرت صبح وطن پیدا — دکھایا لطف مستی نے تری شام غریباں کا
نکالے جانے پر جنت سے گر ہے نسل آدم کی — گزر ممکن نہیں اے شیخ پھر جنت میں انساں کا

منجم کوئی ایسی رات ہو گی — کہ آئے وہ مہ کامل ہمارا

جس جلوے نے تھا طور شرارت سے جلایا — دیکھا جو تجھے مجھ کو دوبارا نظر آیا

دیکھا جو بڑھ کے شوق سے اک راہبر نہ تھا — پہونچا وہاں ہیں خضر کا جس جا گذر نہ تھا
گردش سے آسمان کی کسی جا مفر نہ تھا — کس سرزمین پہ یہ فلک فتنہ گر نہ تھا
میں عشق سے وہ حسن سے بیہوش دونوں تھے — جو کچھ ہوا معاف کوئی باخبر نہ تھا
کیوں طاق کعبہ رخنۂ دیوار کعبہ ہے — زاہد جو اُس کا تیر نظر کارگر نہ تھا
کچھ اور ہی مزا ہے نئے شوق و ذوق کا — جو لطف پہلے دن تھا وہ بار دگر نہ تھا
ٹھہرا وصال وعدۂ فردائے حشر پر — دل کو یہاں تحمل روز دگر نہ تھا

سوتے فتنے کو جگانے کو ہوا تو پیدا — کی تری آنکھوں نے کیفیت جادو پیدا
آفت جاں ہوا عالم کے لئے تو پیدا — کس بلا کے ہوئے یہ چشم و رخ و گیسو پیدا
وہ جوانی کے مزے دلبر کمسن ہیں کہاں — غنچہ جب تک کہ نہ ہو گل نہ ہو خوشبو پیدا
مست عاشق کو تری بوئے دہن کرتی ہے — ایک غنچے سے نہ ایسی ہوئی خوشبو پیدا
دونوں ہاتھوں سے بلائیں تری لیتا ہے یہ حسن — چہرے پر تیرے یہ اے بت نہیں ابرو پیدا
دل ابھی آپ کے کوچے میں تڑپکر پہونچے — ہو جو پہلو سے نکل جانے کا پہلو پیدا

فیضِ انوارِ ازل حصے میں ہے اول سے — جملہ مخلوق سے پہلے ہوئے ہندو پیدا

شکل آئینہ گزر خلوت اصنام میں ہے — شکر خالق ہے کہ جوہر ہوئے ہندو پیدا

دل مے عشق سے مسرور ہوا خوب ہوا — جام خالی تھا یہ معمور ہوا خوب ہوا

خواب میں وصل سے مسرور ہوا خوب ہوا — کچھ تو بارے غم دل دور ہوا خوب ہوا

مجھ کو مارا تو نے اے بیداد گر اچھا کیا — قصہ طول محبت مختصر اچھا کیا

یہ حسن و ناز نہ پریوں میں ہے نہ حور دل میں — خدا کی شان ہے پیدا کئے بشر کیا کیا

شراب و صحبت احباب و باغ و رقص سرور — مدام عیش میں جوہر ہوئی گزر کیا کیا

جلد لا ساغر الماس میں ساقی مے لعل — موتی برساتا ہوا ابر گہر بار آیا

تیرا عاشق یہ رند مست ہوا — شیخ ملحد لحد پرست ہوا

تپ فراق میں تن ہے یہ درد مند اپنا — جدا جدا ہوا جاتا ہے بند بند اپنا

یکتائی پہ ہے ناز تو اتنا بھی رہے یاد — تم سا مجھے تو تم کو بھی مجھ سا نہ ملیگا

جوہر سا کہیں ڈھونڈھ نگا ہو تو بتا دیں — عاشق بھی ہو شاعر بھی ہو ایسا نہ ملیگا

بھولے ہیں ہم صفیر بھی مجھ کو کہ تا قفس — مژدہ بھی کوئی لیکے نہ آیا بہار کا

خار کی طرح ملی باغ جہاں میں تقدیر — جس سے لپٹوں وہ چھڑا لیتا ہے دامن اپنا

اللہ نے نکالا ضلالت سے شیخ کو — کعبہ سے عزم جانب کوئے بتاں کیا

جگانے صبح وہ بالیں پہ بے نقاب آیا — اٹھو بھی صبح ہوئی سر پہ آفتاب آیا

ہے بار جو شبنم کا بھی ہو پیرہن اُن کا — نازک ہے ہتھیلی سے زیادہ بدن اُن کا

ایک بوسہ لیکے عاشق شادماں ہو جائیگا — او بت گلفام کیا تیرا زیاں ہو جائیگا

ہر شیخ و شاب شکل کا دیوانہ ہو گیا — کعبہ تمھارے جانے سے بتخانہ ہو گیا

مجھے اِن جھوٹے وعدوں پر یقیں آنے لگا کب آیا — ملیگا وہ قیامت میں تو سمجھونگا کہ اب آیا

ہم آئے عشق بازی کو تم آئے دلنوازی کو — کوئی اس عالم اسباب میں کب بے سبب آیا

کیا آئے کیا چلے میں نظر بھر کے دیکھ لوں — ٹھہرو کہ حوصلہ دِلِ بسمل میں رہ گیا

خیال زلف سے ہے دیدہ پر آب میں سانپ — تیرے دکھانے کو یہ شیدہ ہیں حباب میں سانپ

یہ عشق افعی گیسو کی دیکھئے تاثیر — کہ رات بھر نظر آتے ہیں مجھ کو خواب میں سانپ

ارغوانی شراب کا ہو دور — آئی رندان بادہ خوار بسنت

ہوکے آیا ہے زرد پوش وہ گل — سر سے ہے پاؤں تک نثار بسنت

جو ہے بچیگا کوئی نہ دُنیا میں جان لو — موت از برائے عالم و عالم برائے موت

میرے مرض کا کچھ نہیں غیر از فنا علاج — دم لیکے غم یہ جائیگا ہے اِس کا کیا علاج

کثرت سے اختلاف کی سچ کس کو جانئے — مصنوعی سب ہیں قصہ دین و کتاب شرع

سب کھینچتے ہیں نالہ گرم اُس کے واسطے — اِک شمع نے لگائی ہے یہ انجمن میں آگ

مانند شمع ہو گا میرا شعلہ پیرہن — مرتے یہ سوز دل سے لگیگی کفن میں آگ

کب کسی گلبن میں پھولے اِس قدر بیکار گل — چشم گل، لب گل، جبیں گل، گوش گل، رخسار گل

صبر آہی جائے گا اے ناصحو — تھک کے خود ہو جائیگا ناچار دل

غفلت ہے مے سے کیفیت لب جاں بخش جاناں میں — خضر دوڑو بجھانے لگ گئی آگ آب حیواں میں

داد اس ظلمتکدے سے کوئی کیا پائے گا خاک — شمع دن کو جلتی ہے اندھیر ہے درگاہ میں

بعید عقل ہے یہ احترام دیر و حرم — مکان ساختہ خود کو کیا سلام کریں

نالوں کا میرے رنگ اڑا یا ہے فغاں میں — بلبل کہیں کانٹے نہ پڑیں تیری زباں میں

بھڑکی گلوں سے آتش دل ہجر یار میں — پھک جائے باغ آگ لگے اس بہار میں

کچھ نہیں ماتم زدوں کو لطف سامانِ بہار
گل ہیں خنداں باغ میں شبنم ہے گریاں باغ میں

طوف در تیرا جو ہو گبر و مسلماں کو نصیب
بت پرستی چھوڑ دیں تم بت پرستی چھوڑ دیں

گردشیں ہیں نام روزی سے زمانے کیلئے
ہے امام سبحہ تک گردش میں دانے کے لئے

سبحۂ صد دانہ میں اعداد حق پیدا نہیں
حق کو بھولا شیخ تا حق آٹھ دانے کے لئے

غیب سے جو ہر مدد ہوتی ہے ہمت چاہئے
مستعد رہئے مقدر آزمانے کے لئے —

جائز نہیں از دو صوم مے پر گال ہے
زاہد حرام تیرے فاقے حلال ہے —

گر نہ ہو حاصل کسی سے مدعائے دل نہ ہو
آدمی کو رب اعلیٰ پر توکل چاہئے

بوئے فرحت بھی تو ہو تجھے روشنی سے روح کو
قبر بلبل پر چراغ روغن گل چاہئے —

وہ بادہ خوار ہوں ہو تجھو نگا جب لب کوثر
تو دینگے ساقی کوثر بھی بھر کے جام مجھے —

ہوں دونوں مست بادہ تو دونا سرور ہو
تم بھی پیو جو خاطر مہماں عزیز ہے —

کہیں کیا جو فراق یار میں دم پر گزرتی ہے
ہمارا دل ہی واقف ہے جو کچھ ہم پر گزرتی ہے

الٰہی موت بہتر ہے جہاں میں نامرادی سے
مراد دل نہ ہو حاصل تو پھر کیا خاک جینا ہے

زیارت کو حسیں آتے ہیں جو ہر میرے مرقد پر
یہ مشہد ہے نجف ہے کربلا ہے یا مدینہ ہے —

کیفیت او ہے لب میگوں سے آب کی
ہے تیرے جھوٹے پانی میں مستی شراب کی

رائے ٹیکا رام تسلّی

تسلّی کے بزرگوں کا وطن پرگنہ کریل ضلع اٹاوہ تھا۔ تسلّی بخشی گوپال رائے کے لڑکے تھے جن کے بڑے بھائی رائے بھولا ناتھ نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں دیوان کچہری بخشی گری تھے۔ تسلّی لکھنؤ میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ بڑے خلیق، متواضع اور شگفتہ مزاج تھے۔ اہل کمال کے بڑے قدردان،

شعر و سخن کے دلدادہ، کتابوں سے بجد گرویدگی رکھتے تھے۔ ہزاروں روپیہ کے صرف سے اپنے کتب خانے میں بڑی بڑی نادر تصانیف اکٹھی کی تھی علمی ذوق گھٹی میں پڑا تھا۔ شاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ فارسی اور ریختہ دونوں خوب کہتے تھے۔ فارسی میں فاخر مکیں اور اردو میں مصحفی سے تلمذ تھا۔ امیرانہ شان و اہتمام سے بسر کرتے تھے۔ خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۸ء تک حیات تھے۔ عشرت لکھنوی کے تذکرے میں ہے کہ ۱۸۶۲ء تک حیات تھے۔

کلام سے اُستادی کی شان ٹپکتی ہے۔ بڑے پیارے اشعار ہیں۔ زبان پُرانی ہے مگر کلام میں میر کی سی فنادگی، مسکینی، مٹھاس اور سوز گداز ہے۔ ہائے کیا مطلع کہا ہے۔

اب بھی اِس نیمجان میں کچھ ہے ۔ فائدہ امتحان میں کچھ ہے

افسوس کہ یہ جواہر پارے زیادہ دستیاب نہ ہوئے جو ملے حاضر ہیں

دیکھے سماں جو اِس مژۂ اشکبار کا ۔ ہو جائے شق جگر رگ ابر بہار کا

آنکھیں سحر تلک میری در سے لگی رہیں ۔ کیا پوچھتے ہو حال شب انتظار کا

جس کے قدم تلے دل خوباں لے گئے ۔ مذکور کیا ہے اپنے دلِ خاکسار کا

فہمیدہ والے کرتے ہیں دولت پہ کب گھمنڈ ۔ کیا اعتماد زندگیٔ مستعار کا

بھاگتا ہے میرے تصور سے ۔ کس قدر بد گمان ہے کافر

دن پھرے پھر مگر تسلّی کے ۔ ان دنوں مہربان ہے کافر

کیا مُنہ جو کوئی آ دے تیرے تیر کے مُنہ پر ۔ یہ ہم ہیں کہ مُنہ رکھ دیا شمشیر کے مُنہ پر

جیسی تیری تصویر لکھی کلک قضا نے
گر دل میں خفا ہے تو پھر اِس بات کو ناداں
جانے دے تسلی تو نہ کر فکر سخن کا

—

کب میں نے کہا پیارے تم مجھ سے جدا بیٹھو
آتے ہی کہا تم نے بس گھر کو میں جاؤنگا
کیا جانے تمھیں کس نے یہ بات سکھائی ہے
مانگا جو تسلی نے اِک بوسہ تو دو پیارے

—

جو چاہے سلطنت اُسے ظل ہما ملے
دیتے نہیں تسلی کو ہو اور کچھ تو تم

—

اب بھی اِس نیم جان میں کچھ ہے
کیوں ستاتا ہے دیکھ تو پیارے

—

تو نہ میری ہی جان ہے کافر
نہ سنی تو نے ایک بات کبھو

—

جب ہمیں دیکھتے ہو دیتے ہو گالی کیا خوب
میرا ہی جگر یہ ہے کہ میں سینہ سپر ہوں

وہ حسن نہ دیکھا کسی تصویر کے منہ پر
کہہ بیٹھو مت عاشق دلگیر کے منہ پر
پھبتا ہے سخن مصحفی و میر کے منہ پر

—

پہلو سے میرے تکیہ پہلو کو لگا بیٹھو
آخر کو تو جاؤ گے اکدم تو بھلا بیٹھو
جب پاس میرے آؤ تب منہ کو بنا بیٹھو
منہ پھیر کے ظالم نے یوں ہنس کے کہا بیٹھو

—

مجھ کو وہی ہوس ہے کہ وہ مجھ سے آ ملے
بوسہ ہر ایک شعر کا اُس کے صلے ملے

—

فائدہ امتحان میں کچھ ہے
اِس دلِ ناتوان میں کچھ ہے

—

تجھ پہ شیدا جہان ہے کافر
ہم کو اِس بات کا گلہ ہی رہا

—

یارے اب آپ نے یہ وضع نکالی کیا خوب
رستم تو چڑھے اِس بت بے پیر کے منہ پر

—

یہاں جو کچھ تیری سج دھج میں مرزائی نکلتی ہے
کہاں مرزا مزاجوں میں یہ رعنائی نکلتی ہے

دیا نراین نگم

منشی دیا نراین نگم

ولادت سنہ ۱۸۸۲ء | وفات سنہ ۱۹۴۲ء

منشی دیا نراین نگم ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۸۲ء کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے دادا منشی شیو سہائے یہیں وکیل تھے اور کانپور ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین۔ والد منشی شیو پرشاد بھی وکیل تھے۔ منشی دیا نراین نگم نے گھر پر ہی اُردو فارسی پڑھی۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں کانپور گورنمنٹ ہائی اسکول کے پانچویں درجے میں داخل ہوئے۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں انٹرنس کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ مرحوم کے بزرگ انھیں وکیل بنانا چاہتے تھے لیکن اُن کا طبعی رجحان خدمتِ ادب کی طرف تھا۔ مضمون نگاری کا شوق بڑھ چلا تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں اُن کا پہلا مضمون رسالہ مخزن میں نمودار ہو چکا تھا۔ وکالت کی طرف مائل نہ ہوئے اور سنہ ۱۹۰۳ء میں رسالہ زمانہ کی ادارت سنبھالی۔ یہ رسالہ اسی سال بریلی سے نکلا تھا۔ ابتدا ہی سے اُنھوں نے اس ادبی پودے کو اپنی محنت سے سیراب کرنا شروع کیا۔ چالیس سال تک اُس کی آبیاری میں جی جان سے مصروف رہے اور اسے ہرا بھرا تناور درخت بنا دیا۔ کانپور جیسے گرم خشک اور دخان انگیز مقام میں اُن کی ذات سے ادبی مشاغل و تفریحات کا ایک مرکز قائم تھا جیسے ریگ زار میں نخلستان۔ افسوس سنہ ۱۹۴۲ء میں ظالم موت نے اُن کو ہم سے چھین لیا۔

منشی جی کا قد لانبا تھا، بدن چھریرا چہرہ کتابی اور رنگ سانولا۔ اچکن۔ چوڑی دار پائجامہ، سیاہ گول فیلٹ ٹوپی یہ لباس اُن کو زیب دیتا تھا۔ زمانہ تعلیم میں بھی اُن کا یہی لباس رہا۔ کوٹ پتلون اور ہیٹ کا جادو اُن پر نہ چلا۔ اِس سے مزاج کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی وضع کے پابند تھے۔ مزاج میں سادگی تھی اور طریق بودوباند میں شستگی و پاکیزگی یوں تو اُنھوں نے سنجیدہ و متین طبیعت پائی تھی لیکن اُنھیں شیریں کلامی اور خوش طبعی کے جوہر بھی عطا ہوئے تھے۔ اُن کی گفتگو بڑی پُر لطف، لذیذ اور شکریں ہوتی تھی۔ اُن کی باتوں میں منطق کا ساز ور ہوتا تھا۔ وہ بڑے مردم شناس اور مزاج داں تھے۔ وہ آدمی کی تحریر و تقریر استعداد و اقتدار سے بہت جلد پتہ لگا لیتے تھے کہ وہ اُن کے مختلف النوع غرض کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتا ہے۔ پھر اُس کو اپنی تحریر و تقریر کے اثر اور خوشگوار طرزِ عمل سے اپنی ذات سے ایسا وابستہ کر لیتے تھے کہ وہ اُن کے تعلقات کو ایک قابل قدر چیز سمجھتا تھا۔ اُن کے دفتر کا کوئی ملازم اگر بد دل ہو کر کام چھوڑ دینے پر آمادگی ظاہر کرتا تو وہ باتوں باتوں میں اُس سے ایسی کوئی چھبتی ہوئی بات کہہ جاتے کہ اُس کا غصّہ فوراً ٹھنڈا ہو جاتا اور وہ خاموش ہو کر اپنے ارادہ سے باز رہتا۔ مثلاً منشی کلیان رائے بی۔ اے زمانہ کے یادگار نمبر کے صفحہ ۱۰۶ پر لکھتے ہیں۔

"ایک مرتبہ دفتر میں ایک صاحب سے کچھ جھڑپ ہو گئی۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کا کام اب مجھ سے نہ ہوگا۔ فوراً انگریزی میں کہنے لگے۔

Never mind but I expected you will not leave me in my old age. I can find a man in your place but not the love of and for an old assisstant.

تالیف قلوب اور شیریں کلامی ہر شخص کا حصہ نہیں۔ منشی جی آنجہانی کی کامیابی کا خاص راز یہی تھا۔ اس کے علاوہ وہ بڑے چاق چوبند، حاضر دماغ اور سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ ان کی نگاہ بہت دور رس تھی وہ اپنے مطمح نظر کے مطابق اپنی مختلف قسم کی مصروفیتوں کا ایک مکمل اور واحد نظام ذہن میں رکھتے تھے اور اس کی کوئی چول ادھر ادھر نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ ان کے حسن تدبیر کی خوبی تھی۔ وہ ہر شخص سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں ان کی بے تعصبی کو بہت دخل تھا سچ تو یہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ بے تعصب تھے اور مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لئے ہندوؤں کی جائز ناخوشی کی بھی پروا نہ کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ بقول جناب نظامی بدایونی اُن کا حلقہ احباب مسلم دوستوں کی کثیر تعداد سے بھرا تھا۔

تالیف قلوب اور فصاحت لسانی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ آنجہانی بڑے محنتی تھے اور ظاہر ہے کہ کسی طرح کی کامیابی بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی آنجہانی جس کام کو ہات لگاتے اُسے بڑے استقلال ہوشمندی اور جانفشانی سے انجام دیتے۔ ہر وقت اُس کی لگن لگی رہتی،

دوست احباب سے اُسی کا ذکر رہتا اُسی پر بحث ومباحثہ ہوا کرتا اِس ہر لمحہ کے انہماک سے وہ مشکل سے مشکل مرحلوں کو آسان اور خوشگوار بنا لیتے تھے۔
سیاسی معاملات میں انجہانی اعتدال پسند اور بہت محتاط واقع ہوئے تھے۔ آزادی کو اپنے مُلک کے لئے ضروری تو سمجھتے تھے مگر سرکار برطانیہ کی برکتوں کے بھی قایل تھے حصول آزادی کے لئے وہ عملی جدوجہد کو برا سمجھتے تھے اور سیاسی مقاصد کی کامیابی کے لئے آئینی طریقوں پر اُن کا ایمان تھا۔
آنجہانی کی مالی حالت ابتدا ہی سے بہت اچھی نہ تھی لیکن اپنی لیاقت محنت اور حسن تدبیر سے اُنھوں نے اپنے حالات کو بہت بہتر بنالیا تھا۔ ایک طرف خود فارغ البالی، ناموری اور عزت حاصل کی دوسری طرف بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنے بیٹوں کو اعلےٰ تعلیم دیکر بڑے بڑے عہدوں پر فائز دیکھا۔ رسالہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ۱۹۱۲ء میں ایک ہفتہ وار اخبار "آزاد" نکالا۔ یہ اخبار بڑا کماؤ پوت ثابت ہوا کئی سال کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں فارسی کے پروفیسر بھی رہے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے میونسپل بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ بعض مقامی سبھاؤں کے رکن بھی رہے رائے صاحب کا خطاب بھی پایا الہ آباد یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور ممتحن بھی رہے۔ غرض اُن کی زندگی مختلف قسم کے فرائض کی انجام دہی میں صرف ہوئی۔ پبلک بھی خوش رہی اور حکام بھی۔

منشی دیا نرائن نگم انجہانی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو ادب کی وہ خدمت ہے جو مسلسل چالیس سال تک رسالہ زمانہ" کے ذریعہ اُنھوں نے انجام دی۔ اُردو کے کسی رسالہ کو ایسی طولانی عمر نصیب نہیں ہوئی اور ایک ایسے اُردو رسالے کے لئے جس کا مدیر ہندو ہو یہ طویل العمری واقعی اعجاز ہے۔" زمانہ" کو دو طرح کی مشکلات کا مقابلہ کرنا تھا وہی جو ہر رسالے کو ابتدا میں پیش آتی ہیں۔ ایک مالی مشکل دوسری قلمی۔ مالی حالت" زمانہ" کی کبھی قابل اطمینان نہ ہوئی اور اکثر اس کی بدولت انجہانی کو نقصانات اُٹھانے پڑے لیکن اِن نقصانات سے کبھی اُن کی ہمت و استقلال میں تزلزل پیدا نہ ہوا اور رسالے کی رفتار میں کبھی بے ربطی پیدا نہیں ہوئی۔ قلمی مشکلوں کو اُنھوں نے اپنے حُسن اخلاق، حسن لیاقت اور معاوضوں سے بہت جلد آسان کرلیا۔ ملک کے بڑے بڑے ادیبوں نے اس پرچہ کے لئے مضامین لکھے۔ مولانا شبلی حالی، نذیر احمد، شرر، اکبر، نظر، سرور، زوال، پریم چند، اقبال، عزیز، چکبست، شوق، شاد، فانی سبھی مرحومین نے اپنے رشحات قلم سے زمانہ کی بلند ادبی حیثیت قایم رکھنے میں امداد دی اور جو اب حیات ہیں اپنی اعانت سے دریغ نہیں رکھتے۔ زمانہ" کا معیار ہمیشہ اونچا رہا اور ادبی تہذیب و متانت کا حامل جس روش سے یہ جاری ہوا تھا اُسی پر برابر قایم رہا اور اُمید کی جاتی ہے قایم رہے گا۔ ادب و شعر کی دُنیا میں سیاسی انقلابات کی طرح بڑی بڑی آندھیاں آئیں لیکن" زمانہ

کی مستقل اور متین روش میں کوئی فرق نہ آیا۔ ادبِ لطیف، عریاں نویسی، رومان وغیرہ اور نظم کی نکٹی بوچی صورتوں سے جو انگریزی بحروں کی نقل ہیں ایسی ہی دیگر خرافات سے اس کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ "زمانہ" میں بحث مباحثے بھی چھڑتے رہے لیکن ذاتیات اور دلآزارانہ مضامین سے اس نے ہمیشہ اجتناب کیا۔

"زمانہ کی چالیس سال کی جلدیں ایسے ایسے بلند پایہ مضامین سے بھری پڑی ہیں جو اُردو زبان کے لئے گرانبہا دولت ہیں۔ ادب کا کوئی سنجیدہ شعبہ ایسا نہ ہوگا جس پر نہایت پُرمغز مضامین نہ موجود ہوں، ادب، شعر، تاریخ، مذہب، تہذیب و تمدن، مصوری، موسیقی، سنگتراشی، معاشیات، طبعیات، اثریات، لسانیات، نفسیات، طنزیات، مضحکات، سیاسیات، فلسفہ، اخلاقیات، روحانیت وغیرہ وغیرہ تمام موضوعات پر بڑے بڑے عالموں اور ماہروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایک ایک موضوع پر یہ تمام مضامین اکھٹے کر کے کتابی صورت میں شائع کئے جائیں تو اُردو میں متعدد علوم وفنون پر بہترین تصانیف کا اضافہ ہو جائے اور شاعری اور انشاپردازی کے بیش بہا مجموعے تیار ہو جائیں۔ حق یہ ہے کہ "زمانہ" نے کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے اُردو زبان کی ایسی گراں قدر خدمت انجام دی ہے جس کے بارِ احسان سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور جس سے ہمیشہ آئندہ نسلیں استفادہ کرتی رہینگی۔

منشی دیانرائن نگم آنجہانی نے اعلےٰ تعلیم پائی تھی اس پر خلقی ذہانت ذوق مطالعہ، صحافت کا مشغلہ اور سب پر طرہ ان کی محنت کی عادت رفتہ رفتہ وہ ایک کامل ادیب ہوگئے۔ اُن کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے اُس پر بے تکلف لکھتے جاتے تھے۔

اُن کی تحریر جامع اور مانع ہوتی تھی نہ کوئی اہم پہلو چھوڑتے تھے نہ فضولیات کا اضافہ ہوتا تھا۔ طرزِ استدلال میں معقولیت اور زور تھا عبارت سلیس، سلجھی ہوئی اور رواں ہوتی تھی جسے اپنی خلقی خوش طبعی سے بڑا پُر لطف بنا دیتے تھے۔ وہ باتوں باتوں میں بڑی میٹھی چٹکی لے لیتے تھے اور پتہ کی بات کہہ جاتے تھے۔ درد و اثر کی جگہ کافی درد و اثر بھی پیدا کر دیتے تھے کتنے ہی دوسرے آدمیوں کی تحریر میں ان کی تحریر ملا کر رکھ دیجئے وہ خود بول اُٹھیگی کہ میں کس قلم کی آواز ہوں۔ اُن کی زبان وہی زبان تھی جو وہ بولتے تھے۔ وہ اس عام بول چال میں عربی فارسی کے مروجہ الفاظ اس سلیقہ سے کھپاتے تھے کہ وہ کوئی اجنبی یا اوپری چیز نہیں معلوم ہوتے بلکہ بالکل اپنے معلوم ہوتے ہیں وہ کبھی بڑی بڑی فارسی عربی ترکیبیں یا موٹے موٹے لغت نہیں برتتے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اُردو ہندی کو اس سلاست سے لکھا جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہوتی جائیں۔

آنجہانی مجموعی حیثیت سے بذاتِ خود ایک ادارہ کی شان رکھتے تھے کیا بہ لحاظ ایک بزرگ خاندان کے، کیا بہ لحاظ ایک سودمند اور معزز شہری

اور سماجی رکن کے اور کیا بہ لحاظ ایک صحیفہ نگار و ادیب کے اُن کی زندگی ہر پہلو سے کامیاب زندگی تھی۔ اُنھوں نے اسے ایک چھوٹے پودے سے لیکر سر سبز تناور درخت ہو کر پھول پھل لانے تک خود ہی سینچا اور شاداب کیا۔ خود اُن کو عزت و آسودگی حاصل تھی، اُن کی اولاد تعلیم یافتہ اور لائق ہوئی۔ دنیا میں اِسی کو خوش بختی کہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آخر میں یعنی مرنے سے دو تین سال پیشتر خانگی صدمات بھی اُنھیں پہونچے جس سے اُن کی کچھ زندگی بے کیف ہو گئی آنجہانی نے اپنی اہلیہ کی دائمی مفارقت کا صدمہ سہا۔ کچھ دِن بعد اپنی بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھا۔ اِن حادثوں نے اُن کے دِل میں پژمردگی ضرور پیدا کر دی ہو گی لیکن اُن کے ہموار لائحۂ عمل استوار طور و طریق اور خلقی خوش طبعی میں آخر وقت تک فرق نہ آیا وہ اِسی زندہ دلی، استقامت اور انہماک کے ساتھ اپنے مشاغل میں مصروف رہے جو اُن کی عادت تھی اور جب پیام اجل آیا تو خوش خوش جانِ حسن کی امانت تھی اُس کو سونپ دی۔

منشی جوالا پرشاد برق

ولادت ۱۸۶۲ء   وفات ۱۹۱۱ء

برق آنجہانی کے مفصل حالات معلوم کرنے کی میں نے بہت کوشش کی مختلف تذکرے دیکھے بہت مختصر حال مِلا۔ خمخانۂ جاوید جیسا ہمہ گیر

منشی جوالا پرشاد برق بی - اے

تذکرہ انجہانی کے ذکر سے خالی نکلا۔ کئی حضرات کو خطوط لکھے کہ اُن سے کچھ حالات معلوم ہونے کی توقعات تھیں۔ بعض نے جواب بھی نہ دیا اور جہاں سے جوابات آئے اُن میں کم و بیش وہی حالات تھے جو چکبست نے مضامین چکبست میں لکھے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجہانی کے حالات کے متعلق چکبست ہی کے مضمون کا کچھ اقتباس دیدیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"منشی جوالا پرشاد صاحب برق ضلع سیتاپور قصبہ محمدی میں پیدا ہوئے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۳ء تاریخ ولادت ہے۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ محمدی میں گزرا۔ ۱۸۷۸ء میں ضلع کھیری سے انٹرنس کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا اور وظیفہ پایا۔ ۱۸۷۹ء سے کیننگ کالج میں تعلیم پاکر ۱۸۸۲ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا ۱۸۸۳ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کی اور فدائے قوم منشی کالی پرشاد انجہانی کے دامن عاطفت کے سایہ میں کچھ عرصہ تک وکالت کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۱۸۸۵ء کے آخری حصہ میں وکالت کا سلسلہ ترک کرکے منصفی کا عہدہ قبول کر لیا اور اس صیغے میں خاطر خواہ نام آوری اور ترقی حاصل کی۔ اکثر اڈیشنل سشن جج اور سشن جج کے عہدے پر بھی قایم مقامی کی حیثیت سے ممتاز رہے۔ اور ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کی جانب سے گریون کمیٹی کے ممبر بھی مقرر ہوئے مگر جب ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں بعارضہ طاعون انتقال کیا تو اُس وقت اُن کا مستقل عہدہ جج خفیفہ

کا تھا۔ اِن کے انتقال پر شبیر صاحب جوڈیشل کمشنر نے کرسی عدالت سے فرمایا کہ قابلیت کے اعتبار سے اودھ کے سب ججوں میں بابو جوالا پرشاد اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے"۔

آنجہانی ایک معزز و ممتاز سریواستو کالیستھ خاندان کے چشم و چراغ[۱] تھے۔ جو قصبہ محمدی میں کئی پشتوں سے آباد تھا۔ آپ کے والد قصبہ کے راجا کے یہاں دیوان تھے۔ ذہانت و ذکاوت آپ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ طباعی خمیر تھی۔ واقعی آپ نے برق وش طبیعت پائی تھی گول چہرہ، بلند کشادہ پیشانی، گندمی رنگ، دہرے بدن کے شکیل و وجیہہ آدمی تھے۔ آپ کے خاندان میں علم و ادب کا ہمیشہ سے چرچا رہا۔ آپ کی تہذیب و تربیت نہایت پاکیزہ تھی۔ خلق، تواضع۔ نشست و برخاست کے آداب، شستہ و شگفتہ طرز تکلم سب باتوں میں آپ کی طرز معاشرت ممتاز تھی۔

علمی ذوق آپ کو بزرگوں سے ترکہ میں ملا تھا اِس پر خداداد ذہانت و طباعی نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ ملکۂ شاعری بھی قدرت نے عطا کیا تھا۔ طالبعلمی کے زمانے ہی سے آپ کو شاعری اور مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ پہلا مضمون تیرہ سال کی عمر میں کالیستھ سماچار میں لکھا۔ لکھنؤ میں آئے تو بڑے بڑے طبیعت دار شاعروں اور انشا پردازوں

---

[۱] عشرت لکھنوی نے اپنے تذکرے میں برق کو پنڈت لکھا ہے جو بالکل غلط ہے۔ برق کالیستھ تھے اُن کے لڑکے لکھنؤ میں ابھی موجود ہیں۔ جگر بریلوی۔

سے صحبتیں رہیں منشی سجاد حسین، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی احمد علی شوق قدوائی آپ کے خاص دوست تھے۔ یہ بزرگ اُس زمانے میں اودھ پنچ کے اراکین میں سے تھے۔ برق انجہانی نے بھی اودھ پنچ میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ چکبست لکھتے ہیں "کہ منشی صاحب موصوف ان معدودے چند لوگوں میں تھے جنھوں نے ابتدا سے اودھ پنچ کے پودے کو سینچا۔ ان کی ذہانت اور طباعی ضرب المثل تھی اور زباندانی اور شاعری کے اعتبار سے لکھنؤ کے سخن سنجوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے"

"برق انجہانی کی طبیعت کی تیزی و طراری اور شاعرانہ ذوق، آزادی و فراغت کے طالب تھے یہاں عدالتی فرائض کی سنجیدہ گرانباری، بے کیفی اور خشکی روز و شب پر حاوی، نہیں معلوم انھوں نے اس حوصلہ شکن تضاد میں کس طرح تسالم پیدا کیا اور کہاں سے اتنا وقت نکال لیا کہ ہزاروں صفحے نظم و نثر کے لکھ ڈالے اور ایسے لکھے کہ ایک ایک صفحے کو تختۂ چمن بنا دیا۔ جس صنف پر قلم اُٹھایا اُسے کمال کو پہونچا دیا۔ شوخی و ظرافت ہے تو اپنے معیار پر، سنجیدہ مضامین ہیں تو اپنے معیار پر، ناول اور ڈرامے ہیں تو اپنے معیار پر۔ سب پر طرہ یہ کہ نظم و نثر دونوں میں یکساں طور پر آپ کے سحر نگار قلم نے معجز نمائیاں کی ہیں۔ تمام عمر آپ نے اُردو ادب کی خدمت کی۔ ان مضامین کے علاوہ جو اودھ پنچ اور بعض دیگر اخباروں میں نکلے شیکسپیر کے نو دس ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کیا بنکم چندر کے کئی بنگالی ناولوں کا ترجمہ کیا۔ اِن ترجموں میں معشوقۂ فرنگ، فیروز گلنار

اور اتھیلو کا ترجمہ خاص کارنامے ہیں۔ طبغراد ناولوں میں پرتاب رومنی، ہار آستین مرنا لنی خاص طور سے مشہور ہوئے۔ شیکسپیر کے علاوہ دوسرے انگریزی ناولوں اور ڈراموں کے ترجمے بھی کئے جو غیر مطبوعہ ہیں جن میں سے چند، معلوم ہوا ہے کہ مولوی مسعود حسن صاحب ادیب کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

آپ کے بنگالی ناولوں کے ترجموں میں اصل کی سی تازگی اور لطف ہے طبغراد ناولوں کا کیا کہنا۔ سراپا بیان کرنے میں تو آپ ید طولے رکھتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت اس کی چلتی پھرتی تصویر کھینچ دیتے ہیں مناظر کا نقشہ کھینچنے میں تو ایک سماں پیدا کر دیتے ہیں بالکل قدرتی دلفریب مضامین، ہوائیں، تازگیاں اور شگفتگیاں آنکھوں کو فرحت اور دل کو سرور بخشنے لگتی ہیں۔ شادمانیوں کا ذکر کرتے ہیں تو کلیجہ اچھلنے لگتا ہے۔ رنج و غم کا بیان کرتے ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے کردار نگاری پر یہ قدرت ہے کہ قصوں کے افراد جیتے جاگتے چلتے پھرتے مختلف الخصایل انسان نظر آتے ہیں۔ زبان کی سلاست، پاکیزگی اور فصاحت ادب کا معیار ہے۔ منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم لکھتے ہیں۔

"مثنوی بہار اور اتھیلو اور رومنی کے ترجموں میں جو زبان بابو جوالا پرشاد برق نے لکھی ہے وہ کیسی پاکیزہ ہے آخر وہ ہندو ہی تو ہیں یقیناً بہت سے مسلمانوں کی کتابوں سے انکی زبان لطیف ہے۔"

منشی جوالا پرشاد کی تصنیفات اور ترجمے اُردو کا نادر سرمایہ ہیں مگر افسوس یہ سب ذخیرہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ متفرق مضامین نظم و نثر تو اودھ پنج اور دوسرے اخباروں کی ساٹھ ستر سال کی پرانی جلدوں میں، اگر وہ جلدیں اب کہیں باقی ہوں، مدفون پڑے ہوں گے۔ ناول اور ناولوں کے ترجمے جو مصنف کے زمانے میں چھپ گئے چھپ گئے اب کسے توفیق ہے جو اُن کو شائع کرائے۔ شاعری میں آپ نے جتنی محنت و کاوش کی وہ قریب قریب سب رائگاں گئی۔ بہتیرا تلاش کیا کہیں آپ کی نظمیں بجز معشوقۂ فرنگ اور مثنوی بہار کے دستیاب نہیں ہوئیں۔ کچھ ظریفانہ اشعار مل گئے۔ معشوقہ فرنگ بھی بہت تلاش سے ملی تھی۔ مثنوی بہار کی کبھی کبھی زیارت ہو جاتی ہے۔ اِس مثنوی کا کیا کہنا۔ زبان و بیان کی خوبیوں کی داد نہیں دی جا سکتی۔ واقعی عروس بہار کی تصویر کھینچ دی ہے، ایسی حسین، رنگین اور پاکیزہ نظم ہے جس کی نظیر نہیں ایک طرف محاورہ کا لطف، بندشوں کی لطافت، ترکیبوں کا تناسب و تقابل، مطالب کا ربط و تسلسل، خیالات کی شگفتگی دوسری طرف قانون روئیدگی و بالیدگی کی نزاکتوں کا انکشاف، نشوو نما کی مسلسل کیفیتوں کا نقشہ، کھیتی کے کاموں کی جزئیات تغیرات موسم سے کاشتکاروں کے امید و بیم کی حالتیں جنگل پہاڑ اور کھیتوں میں ابر و باراں اور بہاراں کا سماں، حسینوں اور مہ جبینوں کے جوش شوق اور ولولوں کا عالم کس کس بات کی تعریف کی جائے۔

لے مباحثہ گلزار نسیم صفحہ ۱۶۰۔

صفائی و روانی کا یہ عالم ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف و شفاف نہر اٹھلاتی بل کھاتی چمنستان میں موجیں مارتی چلی جاتی ہے۔ سر سید احمد خاں نے اِس مثنوی کے متعلق بالکل سچ کہا تھا۔ ع

روے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

حقیقت یہ ہے کہ منشی جوالا پرشاد انجہانی سے ذہین و طباع کم پیدا ہوتے ہیں قدرت نے اپنے خزانے کے بہترین جوہر آپ کی فطرت میں ودیعت کئے تھے۔ آپ کے دِل و دماغ نور کے آئنے تھے۔ اب رہا یہ کہ آپ کی عمر نے وفا نہیں کی یہ قضا و قدر کے معاملات ہیں۔ آپ نے اتنی ہی عمر میں وہ بیش بہا دولت ہمارے لئے مہیا کر دی جس سے ہم ہمیشہ فیضیاب ہو سکتے تھے لیکن ہم نے اِس کی کچھ قدر نہ کی اور غفلت و بے پروائی کے ہاتھوں اسے ضائع و برباد ہونے دیا۔ اُردو ادب و شعر کی زینت اور قدر و قیمت بڑھانے کے لئے جو عرق ریزی برقؔ انجہانی نے کی وہ ظاہر ہے اور اِس کا احسان ہم جس طرح مان رہے ہیں وہ بھی عیاں ہے۔ ہماری غفلتوں کا شاید یہی حال رہے لیکن برقؔ سے فدائیان ادب و شعر ہمیں اپنے روح پرور نغموں سے نوازتے ہی رہینگے۔

پیش خوانی (معشوقہ فرنگ)

ہے کس تماشے کی آمد آمد کہ رشک گلشن ہوا ہے تھیٹر
پرا جمائے کھڑے ہیں گلرو قطار باندھے ہوئے ہیں بر
چمن چمن رج مہ جبیں ہیں مثال گل گوش سامعیں ع
عنادل باغ نغمہ سنجی لبھائیں گے سب کو چہچہا کر

چُنتے ہیں باغ فرنگ سے گُل بناکے گلدستہ لائے ہیں ہم — وہ بھینی بھینی ہے اِس کی خوشبو کہ ہو دماغ آپ کا معطر
ہے ذکر دو گلرخوں کا اس میں کہ بندۂ عشق تھے وہ دونوں — یہ رشک قمری وہ سرو قامت یہ بلبل زار وہ گُل تر
اب آپ نیرنگ عشق دیکھیں ہماری محنت کی داد بھی دیں — وہ برق نے کی ہے گلفشانی کہ بزم ہے یہ حمیں سے بہتر

غزل[1]

اغیار کا کچھ پاس وہ کر جائے تو کیا ہو — دل بے میرا اور لیکے مکر جائے تو کیا ہو
تم ناز کرو شوق سے میں کچھ نہیں کہتا — لیکن کوئی اس ناز پہ مرجائے تو کیا ہو
ان گیسوؤں والوں میں اُلجھا تو ہے او دِل — کمبخت کسی دِن تیرے سر جائے تو کیا ہو
پہونچا تو ہے اُس شوخ کے دامن پہ میرا ہاتھ — کچھ بڑھکے اگر تا بکمر جائے تو کیا ہو
کہتا ہے بلا عشق کو ناصح میرے آگے — دل عشق پہ مایل ہے جو ڈر جائے تو کیا ہو
اُس شوخ کے ملنے میں تو ہوتی ہے بہت دیر — گر عمر میری جلد گزر جائے تو کیا ہو

برق اُس میں وفا ہے تو کسی غیر کے گھر وہ
مانا کہ نہ جائے گا اگر جائے تو کیا ہو

کیونکر کہوں کہ بیٹھا ہے تیوری چڑھائے کون — تم تو خفا نہیں ہو کسے پھر منائے کون
چتون وہ دیکھ لی ہے کہ آپے میں ہم نہیں — دِل کو سنبھالے کون جگر کو بچائے کون
خنجر کو لاگ ہم سے ہے اور ہم کو یار سے — کس کو گلے سے دیکھئے آخر لگائے کون
مجھ کو ادب کا پاس ہے اُن کو غرور حسن — جائے تو جائے کون جو آئے تو آئے کون
غصہ میں جان مانگتے ہیں وہ تو دے بھی دوں — اتنی سی چیز کے لئے آنکھیں چرائے کون
شکوہ کروں ستم کا تو کہتے ہیں ہنسکے وہ — میں ہی نہ جب ستاؤں تو آخر ستائے کون

---

[1] یہ دونوں غزلیں بھی معشوقہ فرنگ سے ماخوذ ہیں۔

وہ تو برس رہے ہیں غضب میں بھرے ہوئے
اے برق تیرے دل کی لگی کو بجھائے کون

دنیا میں ظہور صبح ہوا گلشن پر کیسا جوبن ہے، خورشید کا غنچہ کھلنے لگا اللہ کی قدرت روشن ہے
پیارے پیارے مرغان چمن شاخوں پر بیٹھے گاتے ہیں چلتی ہے نسیم روح فزا جھونکے اٹھلاتے آتے ہیں
باغوں میں ہزاروں پھول کھلے کیا بھینی بھینی خوشبو ہے مستی میں شجر ہیں جھوم رہے اک وجد کا عالم ہر سو ہے
ہر پھول میں اس کی خوشبو ہے اکسیر ہے بوٹی بوٹی میں ہر شاخ میں اس کی خاصیت تاثیر ہے پتی پتی میں

پودوں میں جڑوں میں زہر بھرا زہروں میں نہاں تاثیر شفا
دیکھوں خاصیت برگ و شجر تیار کروں کچھ ان سے دوا

ظریفانہ کلام۔

کلاہ سرخ ترکی دائما بر سر نمی ماند ہمیشہ کوٹ و جاکٹ زیب تن بر تن نمی ماند
زمانہ بر بدلے آئین اے نیچر نمی ماند عروس نو حجاب آلودہ با شوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

برانڈی دائما و بوتل و ساغر نمی ماند چنین بید و چرٹ در دست و لب اکثر نمی ماند
بیا این بوٹ انگریزی ولایہ بر سر نمی ماند عروس نو حجاب آلودہ با شوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

چنیں اسپ خر و سرپٹ میدان تا کجا تازی ہمیشہ گیند و کرکٹ ہمچو طفلاں تا کجا تازی
مزیب در بدن تا کے چنیں پتلون بگو سازی عروس نو حجاب آلودہ با شوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

برانڈی تا کجے از ما بگو اے نیچری نوشی لباس جاکٹ و پتلون بے کھٹکے چنیں پوشی

برائے گردن این رسم لندن تا گنی کوٹسی عروس نوحجاب آلودہ باشوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

کنی گمراہ عالم را بہ اسپیچ زبوں تا کے بہ سر مزمن نمودن اینچنیں خبط وجنوں تا کے
نمودن بول استادہ نمبل سگ کنوں تا کے عروس نوحجاب آلودہ باشوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

خوری تا چند مرغ سر بریدہ را بدیں رغبت حرامے رانمائی اند دلیل خویش چوں حلت
خردمی نالد اے نیچری بریں عقل وبریں ہمت عروس نوحجاب آلودہ باشوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

بجائے سنگ اسود روئے لیڈی را بہ بوسیدن بوقت گیند کرکٹ بے دھڑک بیتاب گردیدن
چو قرآں وحدیث اے نیچری انجیل را دیدن عروس نوحجاب آلودہ باشوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

تو گوئی ذکر اینہ دراکست آں خالق بیچوں کبوتر چوں بجایک رفتہ می سازد نخبر عوں عوں
بترس از داور دادار تو بہ کن ازیں اکنوں عروس نوحجاب آلودہ باشوہر نمی ماند
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

بحر طویل۔
دوش رفتم سوے بازار ۔ کسے یافتم عیار ۔ زہر قید سبکبار۔
بہ تزویر گرفتار ۔ زخود رفتہ وسرشار ۔ سبک خیز
چو لب ہموار ۔ تنش چوں تن زنبور ۔ سیہ خال رُخ حور
مثال شب دیجور ۔ ببر کوٹ و پتلون ۔ بدن شستہ

زصابون - رخش زرد - دلش سرد - تن و جان ہمہ گرد -
نہ او صاحب ایماں - ولے بندہ شیطاں - نہ ہند و نہ
مسلماں - نہ از قوم نصارائی - دو دہر سمت بصد شوق -
گہے تحت گہے فوق - گہے استاد و شاشید -
گہے جست و سرائید - گہے ٹھوکر و سیٹی - گہے چائے و
گہے کافی - ہمیں فکر بہر دم - گشتہ حرص و ہوا را -
گفتم اے ہمسر فرعون - چرا می شدی مطعون - کیسے
نیست چو یارت - چہ بود آخر کارت - ایں وضع کدام
ست کہ داری - چوں شد زخرد عاری - شیشہ ننگ
شکستی - در دانش بچہ بستی - توئی دیوانہ و مدہوش -
رہ عقل فراموش - بہر علم وادب دور - بہ مئے گمرہی مخمور -
بگو نام ونشانت - شوم آگاہ بجانت - مکن دیر خدارا -
گفتہ عدوے ناموس - برو ڈام بگر لوس - ٹم آدمی ہے
کالا - یہ سور کالتالا - من صاحب لو گیم - فدائی بسیر میم -
صاحب ببلی نامم - بجہاں شہرہ عامم - زر موزم تو چہ دانی
کہ ناقابل آنی - بزنم ٹھوکر و کھیٹر - ایٹوگڈ امیر - شکتم روئے شمارا
گفتم اے صاحب اوصاف - مزن بیہودہ بمن لاف -
بہ بیں روے سیہ خویش - بنہ آئینہ در پیش - مشو
طائر نقال - مزن مفت پر و بال - بخور بسکٹ و ہم کیک

مکن ترک رہ نیک ۔ بشو بیر و حسنات ۔ برست از مزخرفات
مبہ بیں صدق و صفارا ۔

نظر پڑا ایک پیر پیچر نرا کی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو سو برس کی یہ قہر و آفت غضب خدا کا
سفید داڑھی یہ کالا جوتا اور اس پہ طرہ وہ سرخ ٹوپی
بدن میں جاکٹ گلے میں پٹے سے عالم اس پر ہے اک لاٹ کا
ہیں باتیں اس کی وہ سحر افسوں کہ سن لیں جس نے ہوا وہ مفتوں
غضب کے فقرے ستم کے جملے اور اس پہ طرز بیاں بلا کا
بہت دنوں تک کیئے کرشمے طرح طرح کے دکھائے نخرے
خدا کے بندوں کے دین و دنیا کو خوب لوٹا غضب خدا کا

مثنوی بہار

اٹھلاتی لجاتی مسکراتی
کس ناز سے ہے بہار آتی
کمسن، الھڑ، حسین، انیلی
چوتھی کی دلھن نئی نویلی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن
اٹھتی کونپل، ابھار کے دن
گہنا پھولوں کا زیب تن کر
دھانی جوڑا اشیا بن گر
گھونگٹ اک ناز سے نکالے
سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے

ہریالی بنی وطن میں آئی — اک سبز پری چمن میں آئی
اتری گلشن میں جب سواری — سورج نے آرتی اتاری
گل نے زرِ گل کیا نچھاور — صدقے ہوئی عندلیب اڑ کر
شبنم بھر لائی کورے کورے — شربت سے گلاب کے سکورے
خورشید نے آئینہ دکھایا — کرنوں نے مورچھل ہلایا
نہریں ہر پھر کے لائیں پانی — سبزے نے بچھایا فرش دھانی
خوشیاں اشجار نے منائیں — میووں کی ڈالیاں لگائیں
غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں — بلبل نے چہک کے دیں دعائیں
ہر شاخ نے ٹھمک کے کی سری ٹیک — ٹوٹی پڑتی تھی ایک پر ایک
مرغانِ چمن نے گیت گائے — ہر رنگ کے زمزمے سنائے

بدلی پھولوں نے اپنی وردی — اودی زنگاری لاجوردی
بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی — کوئل نے یہ پھیر دی منادی
معشوقۂ گلعذار آئی — آئی آئی بہار آئی
سن گن جو ہیں فصلِ گل کی پائی — سردی گھبرائی سٹپٹائی
گردش سے دنوں کی بےخبر تھی — مطلق نہ بسنت کی خبر تھی
ہمجولی کی اپنی پاتے ہی چھاؤں — اتر کو کھسک چلی دبے پاؤں
رنگ اڑ گیا پہلے جو ہوا تھا — گھر مٹ گیا جو بنا ہوا تھا
بیچارے کی کوکھ اجڑ گئی ہے — پالے پہ اوس پڑ گئی ہے
مکھڑے پہ گھٹا ہے غم کی چھائی — چہرے پہ ہے چھوٹتی ہوائی

پھوٹی قسمت پہ روتی ہے برف
ہستی گھل گھل کے کھوتی ہے برف

رنگت ارض و سما کی بدلی
صورت سیرت ہوا کی بدلی

اطراف جہاں میں مچ گئی عید
پہونچا خط استوا پہ خورشید

چشمۂ چارم پہ ہے نمایاں
فیاض زماں مسیح دوراں

چلتی ہے ہوا اسی کے دم سے
ہے نشوونما اسی کے دم سے

بچھڑ کو شعاعیں پالتی ہیں
ہر چیز میں جان ڈالتی ہیں

کرنوں نے گڑی جڑوں میں گھسکر
پیدا کیئے یہ نمو کے جوہر

شاخوں میں جڑوں سے رس پہونچیں
ڈوروں پتوں میں بڑھکے پہونچیں

سجنے لگیں باغ و بوستاں کو
رنگنے لگیں تختہ جہاں کو

فیروزی، صندلی، گلابی
خاکی، عنابی، سرخ، آبی

لاکھی، نارنجی، ارغوانی
طوسی، خشخاشی، آسمانی

کافوری، کاکریزی، لاہی
بادامی، سیاہ، زرد کاہی

عباسی، پیازی، زعفرانی
ماشی، زنگاری، سبز، دھانی

ہر اک کا جدا ہے رنگ و روغن
ہر سبزے پہ ہے بلا کا جوبن

سایہ بھی ہے اِس میں روشنی بھی
سردی سے ملی جلی ہے گرمی

سبزے کا ابھار کیوں نہ بھائے
ہے فصل بہار کیوں نہ بھائے

او آنکھوں کو نور دینے والے
او دل کو سرور دینے والے

کہساروں پہ تو ہی ڈھونڈھا یا
گلزاروں میں تو ہی لہلہایا

ساری خلقت ہری ہے تجھ سے
ہر چیز ہری بھری ہے تجھ سے

اللہ رے نمو کی کارسازی
بخشی گلشن کو روح تازی
بادِ سحری چلی جو سن سن
اُبھرا ہر شاخِ گل کا جوبن
سینوں میں ہوئی اُمنگ پیدا
نئی کلیاں ہوئیں ہویدا
چھیڑا جو صبا نے کسمسائیں
کچھ کچھ دبے ہونٹوں مسکرائیں
پھر گل پہ نسیم نے کھلایا
بڑھ کر پہلو میں گُدگُدایا
باچھیں گئیں کھل خوشی کے مارے
دم پھول گیا ہنسی کے مارے
خوشبو درج دہن سے نکلی
اترائی ہوئی چمن سے نکلی
کچھ ایسی دماغ میں سمائی
شاخِ گل کو ہوا بتائی
اٹھلاتی ہوئی چلی ادا سے
چُہلیں کرتی ہوئی ہوا سے
گھوڑے پہ سوار تھی ہوا کے
جھونکے گئے بن اُڑن کھٹولے
ہر موج نسیم تھی معنبر
خوشبو سے جہاں ہوا معطر
پیارا پیارا سماں جو دیکھا
خلقت کو شادماں جو دیکھا
گھر سے اپنے کسان نکلے
بوڑھے بالے جوان نکلے
تاروں کی چھاؤں منہ اندھیرے
کھیتوں میں پہنچ گئے سویرے
گوڑی، جوتی زمیں کمائی
نیچے کی زمیں اوپر آئی
جب دھوپ نے تیزیاں دکھائیں
سینچا اُنھیں بتریاں لگائیں
چرسے پانی کسی نے کھینچا
بعضوں نے ڈھینکلی سے سینچا
برہا کوئی سنبھالتا ہے
نالی کوئی نکالتا ہے
مِل مِل کے دہاتنیں ہیں گاتی
کھُرپی لئے کھیت ہیں نراتی

کھیتی پہ نثار ہونے والے — وہ جوتنے والے بونے والے
فارغ ہوئے آج جوت بو کر — بیٹھے گھر ہات پانوں دھو کر
پانی کھیتوں میں بھر چکے وہ — جو کچھ کرنا تھا کر چکے وہ
اس کام سے گو ہوئے وہ آزاد — اب فکر ہے فصل ہو نہ برباد
آفت سے اسے خدا بچائے — امید پہ پانی پھر نہ جائے
بے چین ہیں سخت ہے تردد — ہر دم کمبخت ہے تردد
دھڑکا ہے پڑا پڑے نہ افتاد — کھٹکا ہے ہوا کرے نہ برباد
دل میں ہیں یہ وسوسے سمائے — گروہی گیہوں میں لگ نہ جائے
پتھر نہ پڑیں کہ کھیت ہوں گرد — پالا نہ پڑے کہ پیڑ ہوں زرد
گچھوا سے نہ ساری فصل کھو جائے — گیہوں پتلا نہ گر کے ہو جائے
کھیتوں پہ ٹڈیاں نہ چھا جائیں — ہر ہے، گورو نہ کھیت کھا جائیں
چوہوں کے کاٹنے کا ڈر ہے — دیمک کے چاٹنے کا ڈر ہے
کھیتوں میں بیج سڑ نہ جائے — کھیتی پہ اوس پڑ نہ جائے
دل ٹوٹ گیا پھٹے جو بادل — جی چھوٹ گیا ہٹے جو بادل
پالا جو پڑا تو دل ہوا سرد — سرسوں نہ جمی تو رخ ہوا زرد
خورشید حمل سے ہو ہویدا — نیچر میں کرے امتزاج پیدا
برہم نہ مزاج آب و گل ہو — حدت کرنوں کی معتدل ہو
بادل برسا دے ابر نیساں — دانے موتی سے رولے دہقاں
شبنم شبدھ جا تو ڈالیوں میں — موتی سے پرو دے بالیوں میں

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آؤ — اودی اودی گھٹائیں چھاؤ
گھبرا نہ کسان ہے خدا ساتھ — اللہ کے ہیں بڑے بڑے ہاتھ
دُنیا کا رفیق تو ہے دہقاں — عالم کا شفیق تو ہے دہقاں
مفلس، قلاش، بھوکے، محتاج — زردار، امیر، صاحبِ تاج
سب کا تو نے ہے پیٹ پالا — تیرا ہو جہاں میں بول بالا
تیری فیاضیاں ہیں مشہور — کیونکر نہ ہو ہند تجھ پہ مغرور
یارب برسادے ابرِ رحمت — لگ جائے ٹھکانے اِس کی محنت
نیت میں ہو پھل خیاب باری — محنت ہو پھل خیاب باری
ٹھنڈے جھونکے چلیں خدایا — شاخیں پھولیں پھلیں خدایا
ہاں جوشِ نمو بڑھے الٰہی — یہ بیل منڈھے چڑھے الٰہی
پودے جو نہال ہوں تو بن جائے — دہقاں خوشحال ہوں تو بنجائے
اے ابرِ کنوں بہ ہوش در آ — اے رحمتِ حق بجوش در آ
گاڑھی ہے کسان کی کمائی — باشد کہ برو کرم نمائی
دکھلایا دعا نے یہ نتیجا — آہوں سے فلک کا دل پسیجا
نکلا تیزی سے مہرِ انور — حدت سے بھڑک اُٹھا سمندر
کرنوں کی اِدھر بڑھی شرارت — پانی کی اُدھر بڑھی حرارت
قلزم کے بدن میں لگ گئی آگ — مُنہ پر غصہ سے آگئے جھاگ
اِک جوش میں آیا بحرِ زخار — دِل بادلوں کے چڑھے دھواں دھار
چھایا بڑھکر فلک پہ مارا — چھانٹا دِل کا بخار سارا

خورشید کو بادلوں نے گھیرا ‏ عالم میں چھا گیا اندھیرا
کرنوں سے ہوا لطیف ہو کر ‏ چلنے لگی سنکے باد صرصر
بادل ڈرتے ہوا سے بھاگے ‏ باتیں کرتے ہوا سے بھاگے
میدانوں میں بڑھ کے آ گئے وہ ‏ کہساروں پہ چڑھ کے چھا گئے وہ
ٹکرائے پہاڑ سے کہیں پر ‏ جھلا کے برس پڑے وہیں پر
اونچی نیچی پہاڑیوں پر ‏ دھاریں گرتی ہیں لڑکھڑا کر
چشمے کہیں شور کر رہے ہیں ‏ نالے کہیں زور کر رہے ہیں
سوتے ہیں ابل رہے کہیں پر ‏ فوارے اچھل رہے کہیں پر
نہریں اٹھلاتی جا رہی ہیں ‏ لہریں موجیں اڑا رہی ہیں
سبزے سے ہرا ہے دامن کوہ ‏ پھولوں سے بھرا ہے دامن کوہ
تختہ ہے چمن کا یا پہاڑی ‏ گملا پھولوں کا ہے کہ جھاڑی
سبزے کا پہاڑ پر یہ انداز ‏ جیسے چہرے پہ سبزہ آغاز
گھاٹی پھولوں سے رشک گلزار ‏ دائیں یہ درخت سلسلہ وار
معشوقہ و سبزہ رنگ ہے گھاس ‏ ہر پھول میں ہے دلھن کی بو باس
بیلیں ہیں پڑی ہوئی شجر پر ‏ بندھن واری بندھی ہے در پر
چرتے ہیں ہرن پرے جمائے ‏ پھرتے ہیں کنوتیاں اٹھائے
مستی میں کلیلیں کر رہے ہیں ‏ میدان میں طرارے بھر رہے ہیں
کھوہوں میں چھپے ہوئے ہیں زہاد ‏ دنیا بھولی ہوئی خدا یاد
چپ بیٹھے ہیں دھونیاں رمائے ‏ اللہ سے اپنی لو لگائے

جل پیتے ہیں کھا کے جنگلی پھل　　جنگل میں منا رہے ہیں منگل

پھل پھول پہ کرتے ہیں قناعت　　تنہائی میں کرتے ہیں عبادت

صانع کی دیکھتے ہیں صنعت　　اللہ کی دیکھتے ہیں قدرت

ہر شے سے عیاں ہے نور اُس کا　　ہر رنگ میں ہے ظہور اُس کا

افلاک و زمین نجوم و حیواں　ق　دھات اور نبات جن و انساں

جھیلیں، دریا، پہاڑ، چشمے　　اُس کی قدرت کے ہیں کرشمے

مُرغانِ چمن سروں میں گاؤ　　توحید کے زمزمے سناؤ

نہرو ہر پھر کے ہو عبادت　　جھرنو گر گر کے ہو عبادت

سر سجدے کو خم کرو ثمر تو　　جُھک جاؤ شاخ بارور تو

مُرغانِ چمن چہک اُٹھو تم　　گلہائے چمن مہک اُٹھو تم

بُلبُل کی زباں پہ قال آئے　　پتی پتی کو حال آئے

قدرت کے ہتھکنڈے نرالے　　دیکھیں آنکھوں سے آنکھوں والے

تازہ کیا جسم و جاں کو اُس نے　　سرسبز کیا جہاں کو اُس نے

ہے رشکِ جہاں ہر ایک گلشن　　ہر پیڑ پہ ہے بلا کا جوبن

رگ رگ کے نسیم چل رہی ہے　　سبزے پہ ہوا مچل رہی ہے

گیہوں کے کھیت دھانی دھانی　　تختے سرسوں کے زعفرانی

السی کھیتوں میں کچھ تو اودی　　کچھ سرمئی اور کچھ کبودی

ٹیسو سے ہے لال لال جنگل　　مُنہ پر ہے ملے گلال جنگل

آتے ہی بسنت مدھ پر آئیں　　شاخیں آموں کی بور لائیں

کوئل کوکی تو آئے بادل
سر پر گلشن کے چھائے بادل

اوپر چھائی ہوئی گھٹا ہے
نیچے پریوں کا جمگھٹا ہے

شکلیں نکھری ہوئی ہیں سب کی
زلفیں بکھری ہوئی ہیں سب کی

سحر انکھڑیوں میں زباں میں جادو
نظروں میں فسوں بیاں میں جادو

مستانی ادا نشیلی آنکھیں
تیکھی چتون رسیلی آنکھیں

بانکی وہ چھب وہ ترچھی چتون
شوخی، طراری، چلبلاپن

جو ہے وہی کھیلتی ہے ہنسکر
اک اک کو ڈھکیلتی ہے ہنسکر

انداز سے آ رہی ہے کوئی
منہ پھیر کے جا رہی ہے کوئی

ہنستی پھرتی ہے کوئی تنتی
جوڑا پہنے ہوئے بسنتی

کوئی کرتی ہے چھیڑ خانی
دکھلائے کسی کو کچھ نشانی

کوئی بڑی آہ کر رہی ہے
کوئی کھڑی واہ کر رہی ہے

کلیاں چن چن کے توڑتی ہیں
آپس میں شگوفے چھوڑتی ہیں

کھل کھیلی ہیں راگ لا رہی ہیں
مل مل کے بسنت گا رہی ہیں

دنیا تو بہار سے ہے مسرور
ہے برق کا سوز دل بدستور

واں دشت و چمن ہرے ہوئے ہیں
یاں داغ کہن ہرے ہوئے ہیں

گل بے رخ یار خوش نباشد
بے یار بہار خوش نباشد

پنڈت برج نراین چکبست

ولادت ۱۸۸۲ء
وفات ۱۹۲۶ء

"بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے پنڈت برج نراین چکبست ۱۹۲۶ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے مگر چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ اِس پیشہ میں آپ کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں تھا۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ میں آپ رائے بریلی تشریف لے گئے۔ عدالت میں بحث کی اور سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے ریل میں بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی۔ ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھکر ریل سے اُتار کر ویٹنگ روم میں لٹا دیا۔ ڈاکٹر آئے، علاج ہوا مگر سب بے سود۔ ۷ بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا اور آپ کے بڑے بھائی رائے صاحب پنڈت مہراج نراین چکبست ایگزیکیوٹو افیسر لکھنؤ میونسپلٹی گیارہ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر میں رکھکر لکھنؤ لائے۔ جناب کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرعے سے تاریخ نکالی"[1]

---

[1] منقول از حالات مصنف مندرجہ صبح وطن۔

پنڈت برج نرائن چکبست

ان کے ہی مصرعے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا ۱۳۴۴ھ

چکبست کو دیکھنے کی سعادت مجھے نصیب نہیں ہوئی۔ آپ کے دو فوٹو میری نظر سے گزرے دونوں میں دھوپ اور چھاؤں کا فرق تھا۔ ایک سے شان برنائی ٹپکتی تھی دوسرے سے پیرانہ سالی کا سا انحطاط۔ اب اُن کی شکل و شباہت کے متعلق کیا لکھوں۔ آپ قدرتی طور پر ذہین تھے۔ شاعری کا جوہر بھی آپ میں عطیہ قدرت تھا۔ پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی۔ آپ نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اسی گلزار ادب کی خوبو آپ کے مزاج کا خمیر تھی۔ لکھنؤ کی شاعری کا جو خاص رنگ اُس وقت تھا شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں۔ اس رنگ کا مابہ الامتیاز صناعی ہے۔ شعر کی صورت گری میں سارا کمال دیکھا جاتا ہے۔ قلبی کیفیات کی لطافت اور جذبات کی شدت خال خال نظر آتی ہے۔ خارجیت بہت ہے داخلیت کم۔ لکھنؤ کی شاعری کا معیار آتشؔ کے ذیل کے شعر میں منقبط ہے۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا

حضرت چکبست کے روبرو بھی یہی معیار تھا۔ اپنے مضامین میں

اُنھوں نے اکثر شعر و شاعری پر بحث کرتے ہوئے اِسی شعر کو اپنا رہبر بنایا ہے اور اپنی فکر و تخیل سے بھی ایک باہرو کامل مرصع ساز کی طرح کام لیا ہے ۔ آپ کے کلام کا مجموعہ صبح وطن دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک واقعاتی دوسرا غیر واقعاتی۔ واقعاتی حصہ کے ایک سو تیئس صفحات میں مسدس ہیں جو لکھنؤ اسکول کے لئے مرثیوں کو چھوڑ کر بالکل نئی چیز ہیں اس لئے کہ اِس اسکول کی مخصوص جولانگاہ ہمیشہ غزل رہی ۔ اِن نظموں میں چکبست نے ایک مظلوم و محکوم قوم کا قلب کھولکر رکھدیا ہے ۔ اور اُس کے بیدار ہونے والے جذبات کی سچی ترجمانی کی ہے ۔ یہ وہ شاعری ہے جو ایک مفلوک اور غلام قوم کی روح جسکی بھوکی پیاسی تھی ۔ شاعر نے اپنی قوم کے درد کو محسوس کیا ہے اور اپنے احساسات کو اشعار کے سانچے میں اِس خوبی سے ڈھالا ہے کہ مرصع سازی میں بھی درد و اثر کوٹ کوٹ کے بھر دیا ہے بعض نظمیں خالص اخلاقی اور مذہبی رنگ کی ہیں ۔ اُن میں دوگونہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے ۔ ایک تو بلند و پاکیزہ تخیلات دوسرے شاعر کے قلم کی سحر کاری آپ کی مقبولیت کا راز دو باتوں میں ہے ۔ ایک تو آپ نے اُن خیالات و جذبات کی ترجمانی کی جو اِس زمانے میں ملک میں اُبھر رہے تھے دوسرے آپ کا اسلوب بیان آپ عام فہم زبان میں شعر کو کھرا دیہ پر اُتار کے مکمل کرتے

ہیں۔ ہر بند کی ترکیب بڑی نکھری ستھری، پاکیزہ اور چُست ہے۔ خیالات کا ربط و تسلسل بالکل فطری چیز معلوم ہوتا ہے۔ ہر مصرع دوسرے مصرعے سے لپٹا ہوا اور زور دار ہے۔ الفاظ کا تناسب و توازن چُست ترکیبوں کے دلکش سانچے میں ڈھلکر تاثیر کا طلسم بن جاتا ہے
آوازہ قوم" میں یوں ابتدا کرتے ہیں۔

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار — ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار — ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

نگاہ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی — ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی — چلے ہیں بہر زیارت وفا کے سودائی

وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

"مسنر بسنت کی خدمت میں قوم کا پیام"

قوم غافل نہیں ماتا تیری غمخواری سے — زلزلہ ملک میں ہے تیری دل آزاری سے
آگ بھڑکی ہے تیری آہ کی چنگاری سے — خاک حاصل نہ ہوا تیری گرفتاری سے

دل تیرا قوم کے دامن میں دیئے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تیری زنداں میں لئے جاتے ہیں

لہلہاتا ہے محبت کا تیری دل میں چمن — ماں کے دامن سے ہے بڑھکر ہمیں تیرا دامن

تیری تصویر سے ہیں قوم کی آنکھیں روشن — تیرے بالوں کی سپیدی ہے کہ ہے صبح وطن
دل پُر درد کی تصویر ہے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ہے پہنے ہوئے مورت تیری

"قوم کے سورماؤں کی الوداع"

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں — کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں — تیغ زن، برق فگن، قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کے تلوار کے سائے میں قضا چلتی ہے

ان کی رگ رگ میں ہے پیوست شجاعت کے چلن — رن کا میدان ہے ان کے لئے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت ان کو ہے اک شب کی دلہن — مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن
جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں
ساٹھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہاں دلیران وطن دھاک بٹھا کر آنا — طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا — ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا
یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لئے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

اسی نظم میں آگے ایک بند میں کیسا بلند اخلاقی سبق دیتے ہیں۔

گو کہ دنیا سے مٹے شوکت قیصر کا سراغ — شعلۂ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گل نہ ہو دل کے شوالے میں حمیت کا چراغ — بیگناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں داغ

راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کے لئے
خون معصوم کا دوزخ ہے سیاہی کے لئے

اُردو شاعری کا قالب اور روح دونوں ایرانی رہے ہیں۔ اس میں تبدیلی سرور جہان آبادی نے شروع کی حضرت چکبست نے بھی اس راز کو سمجھا کہ اُردو شاعری اگر ہندوستانی خصوصیات سے معرا ہے تو اپنے وطن کے لئے ایک بیگانہ شئے ہے۔ آپ نے بھی ہندوستانی خیالات جذبات اور حالات کی رنگ آمیزی سے اس کو بالکل نیچرل بنانے میں بیش قرار حصہ لیا اور سرزمین ہند کی تشبیہات و استعارات سے عروس شعر کا زیور تیار کیا۔ یہ تشبیہیں اور استعارے نہایت موزوں اور برجستہ ہوتے ہیں اور اس خوبی سے برتے جاتے ہیں کہ شعر کا حسن و اثر بہت بڑھ جاتا ہے۔ بعض جگہ مرکب و مسلسل تشبیہیں نظم کی ہیں اور جو حالت دکھاتا ہے اُس کی تصویر کھینچ دی ہے۔

جب اپنی جا سے اُبلتا ہے چشمۂ کہسار
قدم قدم یہ دکھاتا ہے جوش کی رفتار
مگر جو راہ میں حایل ہو پتھروں کا فشار
تو یوں بکھرتا ہے قطروں میں جیسے اشک کا تار

شباب یوں ہی لٹا بیکسی کے تسیل کا
ستم ہے جوش جوانی میں ٹوٹنا دل کا

اُردو ادب میں سیاسی خیالات کی نشوونما کے سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سب سے پہلے شاعری میں حب الوطنی کے جذبات اور قومی احساسات کس نے ظاہر کئے حب الوطنی سے وطن کی وہ الفت مراد

نہیں جو ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے اور جس کے متعلق کہا گیا ہے۔

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر　　　خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

بلکہ وہ محبت مراد ہے جس کے اثر سے ہندیوں میں قومیت کے خیال کی شیرازہ بندی ہوئی اور جس سے خود مختاری اور آزادی کی آرزو پیدا ہوئی۔ اِس خصوص میں ابھی تک سب سے پہلے شخص منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی نظر آتے ہیں۔ اُن کے بعد حضرت چکبست اور حضرت چکبست کے بعد اقبال لیکن عبدالقادر سروری اپنی کتاب جدید اُردو شاعری میں لکھتے ہیں کہ قومی شاعری[1] کا الہام چکبست نے اقبال سے حاصل کیا۔ واقعات اِس کی تردید ہی نہیں کرتے بلکہ اِس کے برعکس ثابت کرتے ہیں۔ اقبال کی سب سے پہلی نظم ہمالیہ ۱۹۰۱ء میں[2] رسالہ مخزن میں شائع ہوئی۔ یہ نظم بانگ درا کے حصہ اول کی پہلی نظم ہے اور اقبال کا اُردو شاعری کے میدان میں سب سے پہلا قدم۔ اِس حصہ میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں ہیں۔ ان تمام نظموں میں فلسفیانہ مسایل و رموز ہیں۔ کہیں درد قومی کی جھلک تک نہیں۔ محبت وطن کے شعر دو ایک جگہ ملتے ہیں مگر وہ وہی حب وطن ہے جسے ازل سے لوگ ملک سلیماں سے خوشتر کہتے چلے آتے ہیں چکبست کی سب سے پہلی نظم مرقع عبرت ۱۸۹۴ء کی ہے اُس میں لکھتے ہیں۔

آزادی و اصلاح کے جب آتے ہیں اذکار　　　تقلید ہو یورپ کی یہی رہتی ہے گفتار

---

[1] جدید اُردو شاعری صفحہ ۲۰۲　[2] دیباچہ بانگ درا از شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا صفحہ ۱۱۲

موجود مگر ان میں وہ جوہر نہیں زنہار مغرب میں جو تہذیب و ترقی کے ہیں آثار
وہ حب وطن خون میں شامل نہیں رکھتے
گو ولولے رکھتے ہیں مگر دل نہیں رکھتے

یہ بیّن شہادت اس امر کی ہے کہ وہ حب وطن جس کا نصب العین آزادی ہے چکبست کے دل میں شاعر ہونے سے پہلے اپنی گرمی پیدا کر چکا تھا۔ اس نظم کے بعد ۱۹۰۱ء میں مہادیو گوند رنیڈے پر چکبست کا نوحہ ہے۔ یہ محض ایک بڑی ہستی کا نوحہ ہی نہیں بلکہ قومی درد سے لبریز ہے۔ باقی تمام نظموں کا بھی یہی حال ہے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ سروری صاحب نے قومی شاعری سے کیا مراد لی ہے۔ اس سے وہ شاعری ہرگز مراد نہیں ہو سکتی جو وطنی محبت کی محرک ہو کیونکہ اقبال نے ہمیشہ مسلمانوں کو وطن اور اس کی محبت کے خلاف درس دیا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
ترا الاسارے جہاں سے اس کو ہمارے معمار نے بنایا بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اور اقبال کی تو ہمیشہ یہ آرزو رہی۔

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اقبال اڑا کے مجھ کو غبار رہ حجاز کرے
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

مسلمہ طور پر اقبال کا روئے سخن ہمیشہ مسلمانوں کی طرف رہا اور اسلام اور اسلامی عظمت ان کی شاعری کا نصب العین ہے۔ یہ بجائے خود کتنی ہی مقدس خدمت

کیوں نہ ہو بہر حال قومی شاعری نہیں۔

اِس بحث کے بعد میں پھر حضرت چکبست کی شاعری کی طرف آتا ہوں اور آپ کی غزلیات کے متعلق کچھ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لکھنؤ کی شاعری انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں اور حسنؔ و نسیمؔ کی مثنویوں کو چھوڑ کر اُس وقت کی عام اُردو شاعری کی طرح غزل کا ایک دفتر رہ جاتی ہے۔ اِس کا جو ممتاز رنگ ہے اُس کے متعلق اوراق ماسبق میں کہیں مختصراً کچھ عرض کیا گیا جب ترقی یافتہ مذاق کی روشنی میں اِس کی حرف گیری شروع ہوئی تو لکھنؤ والوں کو بھی اِن باتوں کا احساس ہوا جن کے لئے اُن کی شاعری کو بدنام کیا جاتا تھا۔ اُنھوں نے داخلی رنگ بھی اِس میں بھرنا شروع کیا مگر اکثر و بیشتر یہ رنگ آخری ہچکی، نزع و موت، لاشہ و میت بین اور ماتم وغیرہ کے خیالات سے بھر گیا۔ حضرت چکبست نے لکھنؤ کے پرانے اور نئے دونوں زمانوں کے مذموم خیالات سے اجتناب کیا اور خوبیاں لے لیں۔ آپ سے پہلے نظر لکھنوی نے غزل کو لکھنؤ کے رنگ سے بالکل آزاد کر دیا تھا اُن کی غزلیں داخلی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اور تغزل کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ حضرت چکبست نے غزلیں کم کہی ہیں۔ کم و بیش چالیس غزلیں آپ کے مجموعے میں ہیں۔ ان میں اخلاقیات و حقائق زیادہ ہیں۔ سیاسی و قومی خیالات بھی ملے جلے ہیں۔ اسلوب بیان میں آتشؔ کی سی مرصع سازی ہے۔ شعر کی سجاوٹ میں کوئی کسر نظر نہیں آتی۔ بندش کی چستی

بولتے ہوئے الفاظ کا باہم دست و گریباں ہونا، استدلال کی قطعیت نے عجیب حسن پیدا کر دیا ہے۔ میں سوز و گداز کو غزل کی جان سمجھتا ہوں چکبست کی غزلوں میں اس کا تلاش کرنا فضول ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاد کام شاعر غزل نہیں کہہ سکتا۔ لیکن حضرت چکبست نے سوز و گداز کی کمی کو اپنی قوت صناعی سے بہت کچھ پورا کر دیا ہے۔ آپ کی غزلوں میں اگر تڑپ نہیں تو کشش و اثر کافی ہے۔

کچھ ایسا پاسِ غیرت اُٹھ گیا اس عہدِ پُرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں

شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بلبل نشیمن میں
سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں

ہوائے تازہ دل کو خود بخود بےچین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں

زمانے میں نہیں اہلِ ہنر کا قدرداں باقی
نہیں تو سیکڑوں موتی ہیں اس دریا کے دامن میں

شرابِ حسن کو کچھ اور ہی تاثیر دیتا ہے
جوانی کی نمو سے بےخبر ہونا لڑکپن میں

شباب آیا ہے پیدا رنگ ہے رخسارِ نازک پر
فروغِ حسن کہتا ہے سحر ہوتی ہے گلشن میں

نہیں ہوتا ہے محتاجِ نمائش فیضِ شبنم کا
اندھیری رات میں موتی لٹا جاتی ہے گلشن میں

متاعِ دردِ دل اک دولتِ بیدار ہے مجھ کو
دُرِ شہوار ہیں اشکِ محبت میرے دامن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو اُنس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا

بہار آئی ترقی پر ہے سودائے دمبدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

کہا غنچے نے ہنسکر واہ کیا نیرنگ عالم ہے
وجود گل جسے سمجھے ہیں وہ ہے سب عدم میرا

کشاکش ہے اُمید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

اگر کون و مکاں اک شعبدہ تھا اس کی قدرت کا
تو اس دُنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغ ارم میرا

مجھے احباب کی پرسش کی غیرت مار ڈالیگی
قیامت ہے اگر افشا ہوا راز الم میرا

کھڑی ہیں بھیڑیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہید یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا

خدا نے علم بخشا ہے ادب احباب کرتے ہیں
یہی دولت ہے میری اور یہی جاہ و حشم میرا

صدا آتی ہے میرے دل کے ویرانے سے راتوں کو
وہ بہتر ہوں کہ اک گوشہ ہے صحرائے عدم میرا

زبان حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردش افلاک نے جاہ و حشم میرا

کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اس قدر میں نے
کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخ حرم میرا

دل کے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

منزل عبرت ہے دُنیا اہل دُنیا شاد ہیں
ایسی دلجمعی سے ہوتی ہے پریشانی مجھے

جانچتا ہوں وسعت دل حملہ غم کے لئے
امتحاں ہے رنج و حرماں کی فراوانی مجھے

حق پرستی کی جو میں نے بت پرستی چھوڑ کر
برہمن کہنے لگا الحاد کا بانی مجھے

کلفت دُنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے
ہات دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے

خود پرستی مٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی
ماتم احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

قوم کا غم مول لیکر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

ذرہ ذرہ ہے میرے کشمیر کا مہماں نواز ۔۔۔ راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

لکھنؤ میں پھر ہوئی آراستہ بزم سخن

بعد مدت پھر ہوا شوق غزلخوانی مجھے

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا ۔۔۔ آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

نو گرفتار بلا طرز فغاں کیا جانیں ۔۔۔ کوئی ناشاد سکھا دے انھیں نالاں ہونا

چاک ہو کر کفن غنچہ بنا جامۂ گل ۔۔۔ کھل گیا رنج سے شادی کا نمایاں ہونا

رہ کے دنیا میں ہے یوں ترک ہوس کی کوشش ۔۔۔ جس طرح اپنے ہی سایہ سے گریزاں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب ۔۔۔ موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو ۔۔۔ پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا ۔۔۔ ولولوں کے لئے ممکن نہیں زنداں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک ۔۔۔ ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

ہے مرا ضبط جنوں جوش جنوں سے بڑھکر ۔۔۔ ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

قید یوسف کو زلیخا نے کیا کچھ نہ کیا

دل یوسف کے لئے شرط تھا زنداں ہونا

شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت اعلیٰ پایہ کے ادیب و انشاپرداز بھی تھے آپ کے مضامین نثر آپ کی حیات ہی میں چھپ کر شائع ہو گئے تھے۔ یہ مضامین زیادہ تر مشاہیر مصنفین کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ سے متعلق ہیں - ایک مضمون تاریخ پر ہے ایک ذات کی تفریق پر۔ مصنف نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے -

شرح وبسط کے ساتھ اُس پر بحث کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ کا انداز جامع اور مانع بھی ہے۔ عبارت بڑی صاف، سلجھی ہوئی مدلّل اور زوردار ہوتی ہے۔ یہ بڑی خوبی ہے کہ موضوع کی مناسبت سے عبارت کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ شعرا و مصنفین کا ذکر شگفتہ تشبیہوں اور لطیف استعاروں کی زبان میں کرتے ہیں جس سے بڑی رنگینی و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے لیکن صفائی اور روانی جو کلام کا جوہر ہے اُس میں فرق نہیں آنے پاتا۔

لچھمی نراین سرور کا حال یوں شروع کرتے ہیں۔

"جب کشمیر کے چمن زار میں آوارہ وطنی کی آندھی آئی تو بہت سے ہوا خواہان چمن اپنا مسکن چھوڑ کر بوئے گل کی طرح نکل کھڑے ہوئے۔ اِن پریشان حالوں میں اکثر بلبل خوش لہجہ بھی شامل تھے جن کے کانوں میں نغمۂ شیراز سمایا ہوا تھا اور جن کی زبان قند پارسی کی شیرینی سے کامیاب تھی۔ اِن نوا سنجان کشمیر کو عموماً آب ودانہ کی کشش سرزمین دہلی کی طرف کھینچ لے گئی اور وہیں اِن کی زمزمہ پردازیوں کی ہوا بندھی۔ مثلاً پنڈت داتا رام برہمن کی شاعری نے مرزا جواں بخت بہادر اور مرزا خرم بخت بہادر کے دامان دولت کے سایہ میں فروغ پایا۔ یا پنڈت گوبند رام زیرک کو شاہ عالم کی رفاقت کا فخر عمر بھر حاصل رہا۔ اسی طرح صیرفی و ضمیر کی شاعری نے دہلی کی خاک پر نشوونما پائی اور یہ بزرگ

دہلی ہی کی خاک کے پیوند ہوئے۔ لیکن خاک کشمیر کا یہ ذرہ جس کا نام نامی زیب عنوان ہے لکھنؤ کی سرزمین پر آفتاب ہو کر چمکا،،

پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجر کا ذکر یوں شروع کرتے ہیں۔

دو ذوق مرحوم کی تربت کو خدا عنبریں کرے کیا دردناک دل پایا تھا فرماتے ہیں ؎

کھل کے گل کچھ تو بہار جانفزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ شعر اُن بیکسوں کا مرثیہ ہے جن کا چراغ ہستی سرِ شام ہی گل ہو گیا اور جو دُنیا سے ناشاد و نامراد گئے۔ چنانچہ یہ جوانمرگ جس کا نام زیب عنوان ہے، انھیں حرماں نصیبوں میں سے ہے جن کی زندگی کی بہار جانفزا پر قبل از وقت اوس پڑ گئی اور جن کے غنچہ آرزو بن کھلے مرجھا گئے۔ لیکن اِس رواروی کے عالم میں طبیعت کی رنگینی اور بیان کی شوخی نے اپنا سکہ قدر دانوں کے دِل پر جما دیا اور وہ کیفیتیں دکھائیں جن کی یاد اب تک پس ماندہ احباب کے دِل میں درد محبت پیدا کرتی ہے۔ یہ مانا کہ حضرت ہجر کو زمانے نے شہرت عام کا تمغہ نہیں عطا کیا اور مثل صیرفی و ضمیر و نسیم و سرشار کے سخندان کشمیر کی بزم نورانی کے بالا نشینوں میں اِن کا شمار نہیں ہو سکتا مگر تاہم اِس بزم کے جس گوشے میں یہ بیٹھے ہیں اُس گوشے کی اِن کی ذات سے رونق ہے،،

اِن عبارتوں کے مقابلہ میں تاریخ پر جو مضمون ہے اُس کی ابتدا دیکھئے تو اِس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ حضرت چکبست موضوع

کی نوعیت کے اعتبار سے طرزِ تحریر اختیار کرتے ہیں۔ تاریخ اور ذات کی
تفریق وہ موضوعات ہیں جن میں رنگینی و آراستگی کی ضرورت نہیں
بلکہ عالمانہ متانت، منطقیانہ استدلال اور مورخانہ تحقیق کی ضرورت ہے
یہ سب کچھ ان مضامین میں موجود ہے اور مصنف کے قلم کی صفائی، روانی اور
زور بھی اپنی جگہ ممتاز ہے۔ تاریخ پر مضمون یوں شروع کرتے ہیں۔
" موجودہ تہذیب کا یہ ایک علمی اصول ہے کہ دُنیا میں جس قدر رسم و رواج
یا علوم و فنون میں وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور میں آئے ہیں۔ فن
تاریخ بھی اس حالت سے مستثنےٰ نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے
موجودہ زمانے تک یہ فن مختلف تہذیبوں کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا
چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دُنیا میں آئے ہوئے
بہت کم دِن گزرے تھے۔ قدرت کے کارخانے اس کے لئے معمے سے
کم نہ تھے۔ اِس عالمِ حیرت میں اِس کی نگاہوں کے سامنے جو حیرت انگیز
نقشے گزرتے تھے وہ اِس کے دِل پر عجب اثر پیدا کرتے تھے مثلاً وہ
دیکھتا تھا کہ کبھی دِن بڑے ہوتے ہیں کبھی راتیں۔ کبھی چاند سورج
سیاہی میں چھپ جاتے ہیں کبھی سردی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ
دکھاتی ہے کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔
شروع شروع میں وہ قدرت کے کارخانوں میں کوئی انتظام یا ترتیب
نہیں پاتا تھا ......"
حکیم صاحب آنجہانی اعلےٰ پایہ کے نقاد بھی تھے۔ آپ کے تنقیدی

مضامین بڑے معرکے کے مضامین ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے جس قوت اور زور کے ساتھ نسیم کو مٹانے کی کوشش کی تھی اور جس شدومد سے گلزارِ نسیم پر اعتراضات کی بوچھار ہوئی تھی اس کا مقابلہ کرنا اور بازی لے جانا حضرت چکبستؔ ہی کا کام تھا۔ یہ ایسا میدان آپ نے سر کیا جو اُردو دُنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

حضرت چکبستؔ کی تنقید بڑی بے لاگ اور کھری ہوتی ہے اور اُردو ادب کے مختلف تدریجی منازل کی روشنی اُس میں جھلکتی ہے، آپ اُن فروعات پر کم بحث کرتے ہیں جن کو علم برداران علم وشعر کی اصطلاح میں فن کا نام دیا جاتا ہے آپ کی نظر بڑی باریک بین تھی، آپ کسی تصنیف کی خوبیوں اور بُرائیوں کو بڑی جلد دیکھ لیتے تھے اُن کی تہ تک پہونچ جاتے تھے اُسے خالص ادبی کسوٹی پر کستے تھے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر دیتے تھے۔ یہ معیار نہایت پختہ اور معیاد تھا۔ اِس کا مادہ آپ میں خداداد تھا جس پر انگریزی فن تنقید کے مطالعہ نے اور جلا کر دیا تھا اور وسعت بھی پیدا کر دی تھی لیکن۔ انگریزی اصولوں کو آنکھ بند کر کے آپ نے اپنا رہبر نہیں بنایا۔ اُردو مشاہیر نے اپنے کمالات سے جو دلافروز و روح پرور عالم پیدا کیا تھا اُس کی کیفیت بھی نگاہ میں رکھی آپ نے مولانا حالیؔ کی طرح انگریزی شاعری کے ترجموں سے مرعوب ہو کر اُردو سخنوروں کے سارے کمالات کے متعلق یہ فتویٰ نہیں لگایا۔

غزل اور قصیدے کا ناپاک دفتر   عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بڑھکر

آپ نے خدا معاصا و ورع ماکدا کا اصول پیش نظر رکھا اور اخذ و ترک میں حکیمانہ فراست کا ثبوت دیا آپ کا مضمون اُردو شاعری پڑھنے کی چیز ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت چکبست کی ذات جامع کمالات تھی آپ شاعر تھے، ادیب تھے نقاد تھے اور مکمل انسان تھے آپ کی قبل از وقت موت سے اُردو ادب کو بڑا نقصان پہونچا۔ اگر آپ تک زندہ رہتے تو نہیں معلوم کیسے کیسے ادبی جواہر سے اُردو کے خزانے کو مالا مال کرتے۔ حالانکہ وکالت کی روز افزوں، خشک اور بیکیف مصروفیتوں کے باعث شاعرانہ فکر و تخیل سے آپ دور ہو چلے تھے اس مشغلہ میں بہت کمی اور سستی آگئی تھی اور کیا عجب تھا کہ بقول حضرت فراق شعر کے بجائے آپ آئندہ نثر ہی لکھتے۔ اگر ایسا ہوتا جب بھی اُردو ادب کو بہت فائدہ پہونچتا۔ بہرحال جو کچھ سرمایہ آپ ہمیں دے گئے ہیں وہ بہت قابل قدر ہے اور حق یہ ہے کہ آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔

منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی

دفات ۱۹۳۶ء

ولادت ۱۸۴۷ء

منشی مہاراج بہادر کے بزرگوں کا قدیم وطن سکیٹ ضلع ایٹہ تھا لیکن کئی پشتوں سے آپ کے مورثان اعلےٰ دہلی میں مقیم تھے اور اب دہلی ہی کو

آپ کا وطن سمجھنا چاہئے۔ آپ کالیستھوں کے بہت معزز و ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے بعض بزرگ شاہی زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کے دادا منشی خوب چند آخری دور شاہی میں وکیل تھے آپ کے نانا رائے دولت رام عبرتؔ بڑے عالم فاضل اور بلند پایہ شاعر تھے۔ منشی آتمارام حسرتؔ کے سلسلہ میں خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ عبرتؔ راجا کنول نین کے پوتے تھے اور بہت مرفہ الحال تھے۔ دلی کی تباہی کے بعد اِن کا زمانہ بگڑ گیا۔

برقؔ مرحوم منشی ہر نراین داس حسرتؔ کے بیٹے تھے اور ۱۸۹۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۱۹۰۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں ظل پدری سر سے اُٹھ گیا۔ سلسلہ تعلیم بھی منقطع ہو گیا اور آپ دنیوی مکروہات میں پھنس گئے۔ تحصیل علم میں رکاوٹ پڑ جانے کا آپ کو بیحد ملال تھا مگر چارہ ہی کیا تھا تلاش معاش پر مجبور ہوئے اور ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ علم کا شوق بھی برابر دامنگیر رہا چنانچہ ۱۹۱۸ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دوسرے سال الف۔ اے اور ۱۹۲۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی یہ بڑی ہمت استقلال اور سچی علمی لگن پر دلالت کرتا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں سب آرڈنیٹ اکاؤنٹ سروس کا امتحان پاس کیا اور پوسٹل آفس دہلی میں سپرنٹنڈنٹ کے ممتاز عہدے پر فائز ہو گئے۔ اب کچھ فارغ البالی نصیب ہوئی۔ کچھ سال بعد حسب دلخواہ ایک مکان بھی تعمیر کرا لیا اور

باوصف ملازمت کی دِل و دماغ کو بیکار کر دینے والی مصروفیتوں کے
شعر و سخن کے مشاغل سے لطفِ زندگی اُٹھاتے رہے اور اپنے
دم سے دلی میں بزمِ شعر و سخن کی رونق قائم کئے ہوئے تھے کہ دفعتہً سفر
آخرت دربپیش آگیا۔ فروری ۱۹۳۶ء میں اپنے شاگرد جناب شگن چند
صاحب روشن وکیل کی دختر نیک اختر کی شادی میں شرکت کے لئے
پانی پت تشریف لے گئے۔ وہیں پر دفعتہً حرکتِ قلب بند ہوگئی
اور بیرحم قضا نے اِس خوشی و خرمی کے موقع پر آپ کی شمع حیات
گل کر دی۔

برقؔ میانہ قد کے آدمی تھے۔ رنگ گورا اور چہرہ خوبصورت تھا۔
تواضع، نیک دلی متانت، انکسار مگر خودداری تو ان کے ساتھ اُن کے
خمیر میں داخل تھے۔ طبیعت مرنجاں مرنج پائی تھی۔ اپنے حلقہ احباب
میں ہر دلعزیز تھے۔

آنجہانی کے والد حسرتؔ بھی شاعر تھے۔ اُن کا نمونہ کلام دستیاب
نہیں ہوا۔ آپ کے نانا عبرتؔ کے متعلق ایک تذکرے میں لکھا ہے
کہ اپنے ہمعصر شعراء میں آپ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ ذوقؔ کے
ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تین شعر اُن کے دیکھے جن سے اُستادی کی
شان ٹپکتی ہے۔

سخت جانی تو نے شرمندہ کیا قاتل سے ہائے — وقتِ کشتن پھر گیا منہ یار کی تلوار کا
ہر دم صبا سے ہے طلبِ بوئے زلفِ یار — لڑتے ہیں بات بات پہ اب تو ہوا سے ہم

کون سا ہے وہ پر یرو کہ جسے تم عبرت　　دیکھے دل ایسے بنے پھرتے ہو دیوانے سے

ظاہر ہے کہ برقؔ مرحوم کی شاعری ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے ترکہ میں ملی اور بچپن سے ہی اِس خداداد قابلیت کا ظہور ہونے لگا جب مشق سخن شروع کی تو رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ اِس وقت جدید شاعری کی بنیادیں قائم ہو چکی تھیں۔ جدید مذاق انگریزی نظموں کے خشک اور بےکیف ترجموں کی تقلید سے معمور ہے۔ سرورؔ جہان آبادی نے خالص وطنی قالب میں اسے ڈھالکر لطافت، رنگینی و پاکیزگی کی ایسی روح اس میں پھونکی جو ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی۔ برقؔ نے بھی جدید رنگ اختیار کیا اور دہلی اسکول میں نظم نگاری کو ممتاز حیثیت دی۔ اپنی قوت فکر سے اِس میدان میں وہ چمن کھلایا جو اُردو ادب کے لئے باعث زینت رہیگا جدید شاعری کے علاوہ آپ نے غزل بھی کہی۔ میں پہلے نظموں کے متعلق کچھ لکھتا ہوں۔ آپ کی نظموں میں شاعری کے اعلےٰ جوہر نمایاں ہیں اِن میں بڑی روانی و درخشانی ہے۔ زبان دہلی کی یہ مستند زبان ہے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی آمیزش اس انداز سے کی ہے کہ کلام میں شکوہ، جوش اور تابانی کا حسن پیدا ہو گیا ہے بعض بعض نظموں کو بڑا نورانی بنا دیا ہے۔ آپ حسن فطرت سے بہت متاثر ہوتے ہیں چنانچہ بسنت کی ولولہ انگیز بہاروں پر بار بار نغمہ سرائی کی ہے اور بڑی دلکش اور کیف آور نظمیں لکھی ہیں۔ جذبات بڑے پاکیزہ ہوتے ہیں

جس کی تاثیر ہوسکارانہ خیالات نہیں پیدا کرتی بلکہ عرفانیت کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اوائل عمر سے آپ کا میلان طبع نیکی و نکوکاری کی طرف تھا اور سب سے پہلے انھیں خیالات نے نظم کی صورت اختیار کی "کار خیر" میں لکھتے ہیں۔

بتا اے خاک کے پتلے کہ دنیا میں کیا کیا ہے
بتا کے دانت ہیں منہ میں تیرے کھایا پیا کیا ہے
بتا خیرات کیا کی راہ مولا میں دیا کیا ہے
یہاں سے عاقبت کے واسطے توشہ لیا کیا ہے

دعائیں لیں کبھی ٹھنڈا کیا دل تفتہ جانوں کا
ہوا ہے تو کبھی راحت رساں تشنہ دہانوں کا

کسی گم کردہ رہ کی خضر بنکر رہنمائی کی
کسی کی ناخن تدبیر سے عقدہ کشائی کی
دم مشکل کسی مظلوم کی حاجت روائی کی
کسی کی دستگیری کی کسی سے کچھ بھلائی کی

کبھی کچھ کام بھی آیا کسی آفت رسیدہ کے
کبھی دامن سے پونچھے تو نے آنسو آبدیدہ کے

شریک درد دل ہو کر کسی کا دکھ بٹایا ہے
مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے
کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے

کبھی آنسوں بہائے ہیں کسی کی بد نصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

آگے چلکر لکھتے ہیں۔

فنا و زیست کا اک روز قصہ پاک ہونا ہے
اجل کے ہاتھ سے داماں ہستی چاک ہونا ہے
کسی دن خاک کا تودہ تہ افلاک ہونا ہے
کہ آخر خاک کے پتلے کو مٹکر خاک ہونا ہے

حباب آسا قرار زیست ہے دُنیائے فانی میں
جو تجھ سے ہو سکے کر لے بھلائی زندگانی میں

نظارہ چشم معنی خیز سے کر باغ امکاں کا   سبق آموز ہے ایک ایک ذرہ اس گلستاں کا
نہ ہو محوِ تماشا ہوش رکھ اپنے تن وجاں کا   اُلجھنے پائے کانٹوں میں نہ گوشہ تیرے داماں کا

بسر کر زندگی قید تعلق سے جدا ہو کر
برنگ سبزہ بیگانہ رہ نا آشنا ہو کر

کیسی سبق آموز نظم ہے اور کیسے پاکیزہ خیالات سے مملو۔ شاعر کی اُفتاد طبیع اس سے بخوبی آشکار ہو گئی۔ یہی رنگ مشق سخن کے ساتھ ساتھ نکھرتا گیا اور شاعرانہ دلفریبیوں کے ساتھ حکمت وفلسفہ وعرفانیات بڑھتا گیا۔ اس میں برقؔ آنجہانی کی شاعری کا پیام ملتا ہے اگر مغربی خیال کی تقلید میں کسی کو پیام کی تلاش ہو۔ اکثر نظمیں ہندوانی رنگ کی ہیں جن میں بعض خالص مذہبی اثر رکھتی ہیں مثلاً "کرشن درپن، کرشن بھگوان، کرشن اوتار" کرشن سداماں پریم کا تحفہ، بن باسیوں کی وطن میں آمد، بھرت ملاپ وغیرہ وغیرہ یہ نظمیں بھگتی اور پریم کی کیفیتوں سے لبریز ہیں۔

برقؔ کے یہاں تنوع مضامین بہت کافی ہے جس سے آپ کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر کو ہر باعظمت اور شاندار چیز میں حسن نظر آتا ہے۔ چنانچہ گرو نانک، میراں بائی پدمنی کا جوہر زیب النسا کی قبر، مہارانا پرتاب وغیرہ نظمیں ایسی حسن کے اثر سے لکھی گئی

ہیں۔ اِن میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ باید و شاید میراں بائی پر جو نظم ہے واقعی موتیوں کی لڑی ہے۔

مرحوم کے خیالات کا چشمہ گیتائے مقدس کے بحرِ معرفت سے نکلا ہے جس سے آپ نے اپنے تمام چمنستانِ سخن کی آبیاری کی ہے۔ کوئی موضوع کیوں نہ ہو گھوم پھر کے عارفانہ مرکز پر ہی آجاتے ہیں اور یہیں آپ کی لے ٹوٹتی ہے "حسنِ فطرت" میں لکھتے ہیں۔

اِک جلوہ گہِ حسن ہے یہ عالمِ اسباب نظارہ بداماں ہے رُخِ مہرِ جہاں تاب
ہے جادرِ مہتاب کہ اِک نور کا سیلاب ہر اختر تابندہ ہے رشکِ دُرِ نایاب

ہے وسعتِ دامانِ خلا حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

آگے چلکر لکھتے ہیں۔

ہر ذرے کے دامن میں ہے اک حسن کی دنیا ہر قطرے میں ہے قلزمِ زخار کا نقشہ
ہر دانے سے خرمن کے ہیں آثار ہویدا ہر شعلے میں ہے برقِ سرِ طور کا جلوا

ہر جزو کے آئینہ میں عکسِ رُخِ کل ہے
ہے اپنی جگہ ایک چمن زار جو گل ہے

جو منظرِ دلچسپ ہے فردوسِ نظر ہے نیرنگِ شبِ تار ہے یا نورِ سحر ہے
ہے غنچہ وابستہ کہ شبنم کا گھر ہے ہر شے میں نیا حسن نیا رنگ اثر ہے

جو شعلۂ بیتاب میں سامانِ تپش ہے
روئے گلِ خنداں میں وہی جذبِ کشش ہے

دل میں ہو اگر آرزوئے حسن پرستی — ہے عالم تصویر صنمخانہ ہستی
ہے فرش سے تا عرش یہاں اوج کی بستی — انوار سے معمور ہے یہ حسن کی بستی
وہ ذرہ ہے وہ خاتم قدرت کا نگیں ہے
جو شکل ہے اِس آئینہ خانہ میں حسیں ہے

سبزۂ بیگانہ میں کہتے ہیں۔

کب یہ خیال تھا ترے وہم وگمان میں[1] — دو حرف میں نے ڈال دئے تیرے کان میں
پورا اُترنا چاہیے اگر امتحان میں — بیگانہ وار تو بھی بسر کر جہان میں
نیرنگ روزگار کا شایق نہ ہو کبھی
غافل اسیر دام علایق نہ ہو کبھی
ہرگز ستم نہ توڑ کسی ناتوان پر — بیفائدہ عذاب نہ لے اپنی جان پر
دار فنا میں بھول نہ تو عز و شان پر — او مشت خاک اڑ کے نہ چل آسمان پر
ہشیار ہے تو دہر میں دیوانہ بنکے رہ
باغ جہاں میں سبزۂ بیگانہ بنکے رہ

چند شعر "شمع کشتہ" کے لکھتا ہوں۔ اِس نظم میں شمع کی سی ضیا باری اور پروانوں کی سی دلسوزی بھی موجود ہے۔

رات بھر تو نے مزے لوٹے ہیں سوز و ساز کے — دیدنی تھے رنگ تیری جلوہ گاہ ناز کے
تجھ سے سیکھے ڈھنگ پروانوں نے ضبط راز کے — جو سینے نکلے اچھل کر ظرف ہر جانباز کے

---

[1] جو ارباب فن اِس ترکیب عطفی میں اعلان نون پر انگلی رکھتے ہیں وہ ترقی پسند شعرا کا کلام دیکھیں انھیں معلوم ہوگا کہ یہ حضرات ان زنجیروں کو توڑ رہے ہیں۔ اور اِن میں حضرت جوش سب سے آگے ہیں۔
جگر بریلوی

جو فدا ہونے بڑھا رخسارِ آتشناک پر
گر پڑا آتش بجاں ہو کر بساطِ خاک پر

تیرے دم سے گرمیِ ہنگامۂ محفل ہوئی — تو ضیا بخشِ نظر فرحت فزائے دل ہوئی
پردۂ فانوس میں تو لیلئ محمل ہوئی — رُخ سے جب پردہ ہٹا رشکِ مہِ کامل ہوئی

جوت جاگی جب ترے حسنِ نظر افروز کی
جان میں جاں آگئی پروانۂ جانسوز کی

لو لگائے تجھ سے ساری رات پروانے رہے — لب پہ جانبازوں کے سوزِ غم کے افسانے رہے
سب شرابِ آتشیں ہی پی کے مستانے رہے — جوش میں آپے سے باہر تیرے دیوانے رہے

شعلہ خوئی پر تری مٹتے رہے سو جان سے
گرد پھر کر ہوئے صدقے ہزار ارمان سے

دونوں جانب سے ہوئے راز و نیازِ حسن و عشق — منکشف ہونے لگے سربستہ رازِ حسن و عشق
رنگ لائی لذتِ سوز و گدازِ حسن و عشق — ہو گئے یک جان باہم دلنوازِ حسن و عشق

کچھ نہ پروانے کو سوجھا فرطِ غم کے جوش میں
لے لیا تجھ کو تڑپ کر حلقۂ آغوش میں

رات بھیگی اوس نے چھینٹے دئے گلزار پر — آگیا کچھ کچھ عرق تیرے گلِ رخسار پر
پھر گئی زردی سی روئے مطلعِ انوار پر — رات بھاری ہو گئی تیرے دلِ بیمار پر

لاکھ ہاتھوں ہاتھ رکھا اہلِ محفل نے تجھے
خاک کر ڈالا جلا کر سوزشِ دل نے تجھے

پڑ گیا پھیکا فروغِ حسنِ لاثانی ترا — ملگجا سا ہو گیا ملبوسِ نورانی ترا

چھا گیا محفل میں دودِ سوزِ نہانی تیرا ڈھلگیا سایہ کی صورت نورِ پیشانی تیرا
دستِ حسرت تیری حالت پر ملے گلگیر نے
رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑا حسن کی تنویر نے

پردۂ شب اُٹھ گیا کھلنے لگے اسرارِ صبح ہو گئی تو سرد جیسے گرمی بازارِ صبح
عالمِ بالا پہ چمکا مطلعِ انوارِ صبح تیرگی رخصت ہوئی ظاہر ہوئے آثارِ صبح
چرخ پر ڈوبے ستارے چاندنی پھیکی ہوئی
بڑھ چلا نورِ سحر کافور تاریکی ہوئی
ضوفشاں جب جلوۂ رنگِ شفق ہونے لگا خاکدانِ دہر کا روشن طبق ہونے لگا
تیرے روئے آتشیں کا رنگ فق ہونے لگا عارضِ رنگیں ترا سادہ ورق ہونے لگا
ہستی بے بود آخر دے گئی دھوکا تجھے
کر گیا ٹھنڈا نسیمِ صبح کا جھونکا تجھے
تیرے گُل ہوتے ہی قصہ مختصر کچھ بھی نہ تھا خواب کا نقشہ تھا سب رنگ اثر کچھ بھی نہ تھا
کھل گیا جز بے ثباتی جلوہ گر کچھ بھی نہ تھا رات بھر کی ساری رونق تھی سحر کچھ بھی نہ تھا
شمعِ کشتہ تو مجسم یاس کی تصویر ہے
یا بیاضِ صبح پر اندوہ کی تفسیر ہے

جوشِ بہار کے چند بند لکھتا ہوں۔ واقعی قاآنی کے اِس قصیدے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

نسیمِ خلد می وزد مگر ز جوئبارہا

گھرا ہوا ہے سر فلک جو ابر قطرہ بار ہے خزاں پر اوس پڑ گئی چمن چمن بہار ہے
گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے ورق ورق ہے خوشنما نظر نظر نثار ہے

جمی تھی برگ برگ پر جو گرد اب وہ ڈھل گئی
کلی کلی نکھر گئی گرہ دلوں کی کھل گئی

نمو کا آشکار ہے بساط خاک سے نشاں بچھا ہے فرش مخملی گیاہ نو سے ہے عیاں
اُگل رہی ہے لعل اب زمین باغ بیگماں روش روش کھلے ہیں گل چمن ہے رشک جناں

کلی ہے نیم وا کوئی دلھن ہے یا حجاب میں
کھلا ہوا ہے نیم رُخ ہے نیم رُخ نقاب میں

گرا رہا ہے بجلیاں چنار شعلہ خو کہیں ضیا فگن ہے نیلوفر میان آب جو کہیں
ادا سے زیب شاخ ہے گل شگفتہ رو کہیں بسی ہوئی ہے عطر میں صبائے مشکبو کہیں

بنا ہے تختۂ چمن مجسمہ بہار کا
شگفتگی کا دور ہے سماں ہے برگ و بار کا

برس رہی ہے تازگی شجر بھی سبز پوش ہیں خزاں میں لٹ چکے تھے جو وہ آج گلفروش ہیں
بہار کا شباب ہے نہال عیش کوش ہیں نئی نئی مسرتیں دلوں میں تازہ جوش ہیں

رہین شغل میکشی ہر ایک مے پرست ہے
سرور چیرہ دست ہے خمار کو شکست ہے

مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا - ایم - ایل - اے نے برق آنجہانی کے ایک مجموعہ کلام پر مختصراً تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ عارفانہ تجسس ہندو مفکروں اور شاعروں کے خمیر میں ہے - یہ رائے وسیع مطالعہ پر

مبنی ہے اور ہندوؤں کے ایک شاعرانہ امتیاز پر مہر تصدیق ۔ موضوعاتی نظمیں تو حکمت و فلسفہ کے نور سے معمور ہی ہیں برق نے غزل میں بھی عارفانہ خیالات کی شمع روشن کی ہے ۔ غزل کے عامیانہ رنگ سے بچکر کلیتہً اُسے حکیمانہ خلعت سے آراستہ کر دینا آسان کام نہ تھا ۔ برق نے یہ مشکل راہ اختیار کی اور یہ اُن کی غزل کا مایہ الامتیاز ہو گیا ۔ جذبات، پاکیزہ خیالات بلند اور مسائل بلند تر آپ کے اشعار کی بنیاد ہیں ۔ وحدت و کثرت، لقا و فنا، حیات و ممات، تخلیق عالم، مدعائے آفرینش، مکافات عمل، وغیرہ وغیرہ کے اسرار آپ نے غزل میں کھولے ہیں ۔ اپنی قادر الکلامی سے ہر شعر کو چست، مضبوط اور رواں بنا دیا ہے اور دلی کی زبان کا مٹھاس اس میں بھر دیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

غزل

میسر ہے مجھے دار فنا میں جاوداں ہونا
میری ہستی کا ناممکن ہے نقش رائگاں ہونا

فریب حسن ہے ۔ نیرنگ گلزار جہاں ہونا
لبان گل عیاں ہونا برنگ بو نہاں ہونا

نہ ہونا واں نشاط دم زدن پردہ میں غافل
چراغ صبح کا ہنسنا ہے تیرا شادماں ہونا

زبان خاک سے شاہد ہے چاک دامن غنچہ
کہ لازم ہے لباس رنگ و بو کا دھجیاں ہونا

چمن ہے ابر ہے ساقی ہے مے ہے برق پی بھی لے
بہت مشکل ہے پھر یہ ساز و ساماں یہ سماں ہونا

دو عالم میں نظر آتا ہے جلوہ سر بسر اپنا
تماشا دیکھتا ہے آپ حسن خود نگر اپنا

نگاہوں میں سمائیں کیا کرشمے حسن فطرت کے
تیرا جلوہ ہے واقف تنگ دامان نظر اپنا

ہمیں راہ طلب میں خاک ہو جانے سے مطلب ہے — قدم پہونچے نہ پہونچے منزل مقصود پر اپنا
میسر ہو گا اوج خاکساری خاک میں ملکر — فلک پر اُڑ کے پہونچیگا غبار منتشر اپنا
ہوائے مرگ کی زد میں چراغ زندگانی ہے — مجھے آغاز میں انجام آتا ہے نظر اپنا
مسافر ہوں عدم کی راہ میں، فکر اقامت کیا — وہیں منزل ہے جس جا ختم ہو جائے سفر اپنا

کوئی پروانہ جلتا ہے تو رو کر شمع کہتی ہے
یہی ہے سوز غم تو خاتمہ ہے تا سحر اپنا

چشم کم میں واقف نیرنگئ فطرت نہیں — ایک جلوے کی فراوانی ہے یہ کثرت نہیں
روبروئے دیدۂ عبرت ہے انجام حباب — سر اُٹھانے کی تہ چرخ بریں ہمت نہیں
مجمع اضداد پر ہے انحصار کائنات — صانع قدرت کا کوئی فعل بے حکمت نہیں
ذرہ ذرہ جلوۂ توحید سے معمور ہے — کونسا شیشہ ہے جس میں بادۂ وحدت نہیں
اہل دل کو غیب سے ملتی ہے دولت عشق کی — بوالہوس کے ہاتھ جو آئے یہ وہ دولت نہیں
میں وفا سے ہاتھ اُٹھاؤں وہ جفا سے باز آئیں — عشق کی وہ خو نہیں یہ حسن کی فطرت نہیں
آتش پروانہ جانسوز یہ کیونکر بجھائے — بادۂ ہستی میں اب پہلی سی کیفیت نہیں

قدرداں جوہر انسانیت ہوں برقؔ میں
میری نظروں میں متاع دہر کی وقعت نہیں

اُنھیں کو ہم جہاں میں رہرو کامل سمجھتے ہیں — جو ہستی کو سفر اور قبر کو منزل سمجھتے ہیں
جو ہیں جانباز کب مشکل کو وہ مشکل سمجھتے ہیں — شناور موج طوفاں خیز کو ساحل سمجھتے ہیں
نکل جاتا ہے دل ہاتھوں سے غیروں کی مصیبت پر — جو ہیں درد آشنا اپنا سا سب کا دل سمجھتے ہیں
اشاروں میں ہوا کرتی ہیں حسن و عشق کی گھاتیں — نگاہوں کو نگاہیں اور دل کو دل سمجھتے ہیں

ہر نفس شکرانۂ معبود ہونا چاہئے ۔ زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصود ہونا چاہئے
کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود ہونا چاہئے ۔ لاتعین کس لئے محدود ہونا چاہئے
عالمِ اسباب ہے اک جلوۂ حسنِ ازل ۔ ذرہ ذرہ کعبۂ مقصود ہونا چاہئے
کیوں حجابِ ماسوا ہے مانع ذوقِ نظر ۔ فاش رازِ ہستی بے بود ہونا چاہئے
ہستیٔ قطرہ ہو جیسے بحرِ بے پایاں میں گم ۔ یوں وصالِ شاہد و مشہود ہونا چاہئے

برقؔ میخانہ میں ہو گی منعقد بزمِ سخن
آپ کو تو کم سے کم موجود ہونا چاہئے

جھپکے پلک نہ مہر درخشاں کے سامنے ۔ رہ جائے بات جلوۂ جاناں کے سامنے
کھلتی نہیں حقیقتِ دنیائے بے ثبات ۔ اک خواب سا ہے دیدۂ حیراں کے سامنے
پیوندِ خاک، خاک کے پتلے ہیں رات دن ۔ ہستی ہے گردِ گورِ غریباں کے سامنے

کس کو ہے ہست و بود کے انجام پر نظر
کچھ سوجھتا نہیں غمِ دوراں کے سامنے

وہ محفل میں نقاب الٹیں تو نقشہ ہی بدل جائے ۔ تڑپ کر شمعِ سوزاں صورتِ پروانہ جل جائے
تجلی حسنِ روز افزوں کی ہے عہدِ جوانی تک ۔ فروغِ شمعِ روشن پھر کہاں جب رات ڈھل جائے
گرے کیوں چار تنکوں پر فلک سے ٹوٹ کر بجلی ۔ شرارِ آتشِ گل سے نشیمن اپنا جل جائے
ریاضِ دہر میں ہوگا نہ مجھ سا آفتہ جاں کوئی ۔ وہ غنچہ ہوں نکلتے ہی جو شاخِ گل پہ جل جائے
میری طوفاں زدہ کشتی ہے موجوں کے تلاطم میں ۔ مدد اے گردشِ قسمت ہوا کا رخ بدل جائے

خوشی عہدِ وفائے یار کی برقؔ حزیں کیسی
زمانہ کیا خبر ہے پھر کوئی کروٹ بدل جائے

تجھے نخل نیدِ حیات نے تیری کاوشوں کے یہ پھل دئے
کیا خلق باغِ جہاں میں جب تو ثمر بھی حسبِ عمل دئے

کوئی ڈھونڈھے لیکے چراغ بھی نہ ملیگا اُن کا سراغ بھی
کہیں اُن کا نام و نشاں نہیں جو عدم کو قافلے چل دئے

جو کسی نے ہمتیں صرف کیں تو دلی مرادیں اُسے ملیں
جو شکم میں خاک کے تھے نہاں وہ دفینے اُس نے اُگل دئے

یہ طلسم خانۂ دہر ہے وہ نظر فریب کہ قہر ہے
ہمیں کیا حیاتِ دو روزہ دی جو ہزار اُس میں خلل دئے

یہ روا روی کا مقام ہے یہ اجل کا شیوۂ عام ہے
جو لباسِ زیست کہن ہوئے تو وہ دم زدن میں بدل دئے

نہ غرض متاعِ جہاں سے کچھ نہ ہمارا مال ہے نقدِ جاں
تہی دست آئے تھے ہم یہاں تہی دست دہر سے چل دئے

جو مآلِ کار یہ ہے نظر دل و جاں سے خدمتِ خلق کر
کہ یہ عقل و ہوش یہ دست و پا تجھے بہرِ حسنِ عمل دئے

طپش زدہ ہوں نہیں دم زدن کی تاب مجھے
ملی ہے برق صفت خوئے اضطراب مجھے

حرم کی دیر و کلیسا کی خاک چھانی ہے
تیری طلب نے کیا دربدر خراب مجھے

کھلے جو چشمِ حقیقت نگر یہ رازِ حیات
فنا میں آئے نظر زندگی کا خواب مجھے

ہوا میں بھر کے جو بحرِ جہاں میں چلتا ہوں
اُبھر کے آنکھ دکھاتا ہے ہر حباب مجھے

یہ کیا خبر تھی کہ دورِ خمارِ پیری میں
لہو رُلائیگی رنگینیٔ شباب مجھے

گرائیں آپ اگر بجلیاں زہے قسمت | کیا ہے برق نگاہی نے انتخاب مجھے
تصور نگہ مست سے ہوں خود رفتہ | نہیں ضرورت جام شراب ناب مجھے
نہ ڈوب مرنے کو جا ہے نہ دفن ہونے کو | قبول کرتی ہے خاک زمیں نہ آب مجھے

کیا نوازش ساقی نے برق مست الست
لڑا کے آنکھ دیا ساغر شراب مجھے

منشی دوارکا پرشاد افق

ولادت ۱۸۶۴ء — وفات ۱۹۱۳ء

جب دلی بگڑی تو سیکڑوں اُمرا و شرفا اور اہل کمال اپنی جانیں سلامت لیکر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور ملک بھر میں جہاں جس کو جگہ ملی وہیں رہ پڑا۔ اِن لوگوں نے مختلف مقامات میں پھیلکر شرافت تہذیب اور علم کی از سر نو بنیادیں رکھیں۔ اِنھیں میں حضرت افق[۱] کے قدیم بزرگ تھے جو لکھنؤ میں آکر آباد ہوئے۔ محلہ نولستہ کو اپنا اقامت گاہ بنایا۔ لکھنؤ کی مردم خیز سرزمین میں نولستہ ہمیشہ سے ایک ممتاز خطہ رہا ہے۔ یہاں کے باشندوں نے علم و ادب کی جو خدمتیں انجام دی ہیں بے اندازہ ہیں۔ اگر اِن کا تذکرہ لکھا جائے تو ایک ضخیم تاریخ ادب مرتب ہو جائے۔

---

[۱] حضرت افق کے حالات اُن کے فرزند رشید مسٹر شیشمبر پرشاد منور لکھنوی نے عنایت فرمائے اور اُن کا میں بھی منت پذیر ہوں۔
جگر بریلوی

نولستہ میں زیادہ تر سکسینہ کالستھ آباد ہیں۔ یہاں بڑے بڑے عالم وفاضل اور سخنور گزرے ہیں۔ منشی گوبند پرشاد فضا[۱] نے بوستان سعدی کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا اور متعدد کتابیں فارسی اور اُردو میں لکھیں۔ منشی خیراتی لال شگفتہ[۲] تلمیذ نسیم دہلوی، منشی شادی لال چمن[۳] منشی پورن چند عاجز[۴] منشی جگناتھ خوشتر[۵] اور منشی دھنپت رائے محقق اُردو کے مشہور تاریخ گو وغیرہ سب ارباب کمال یہیں کی خاک سے اُٹھے۔ فارسی اور اُردو کے چمنستانوں کو سیراب کیا۔ نظم ونثر میں گل کھلا دیے،

۱؎ فضا لکھنؤ کے مشہور ومعروف شعرا میں سے تھے۔ فارسی میں بڑے صاحب ذوق اور اعلیٰ معلومات کے حامل تھے متعدد کتابیں آپ نے تصنیف فرمائیں جن میں گلزار فضا۔ عروض فضا۔ بوستان اُردو منظوم اور مثنوی سحر میں خسرو ان کی بے بدل تصانیف ہیں ۱۸۸۶ء میں حیات تھے (ہندوؤں میں اُردو از سید رفیق احمد مارہروی)

۲؎ شگفتہ۔ والد کا نام رائے طوطا رام تھا محلہ نولستہ میں مکان تھا۔ فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فن شعر میں کہنہ مشق اور ہمعصروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ نیوٹ اور لکڑی کے فن میں استاد تھے۔ فن شعر میں نسیم دہلوی سے مشورہ کیا (ہندوؤں میں اُردو)

۳؎ چمن۔ کالستھ تھے لکھنؤ آپ کا وطن تھا منشی رام سہائے رونق کے حقیقی بھائی تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں زبردست قابلیت کے حامل تھے۔ فن شعر سے گہرا لگاؤ تھا اور ہر دو زبان میں فکر سخن فرماتے تھے (ہندوؤں میں اُردو)

۴؎ عاجز کالستھ سکسینہ تھے لکھنؤ محلہ نولستہ میں قیام تھا مطبع تمنائی آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے باعتبار علم وکمال لکھنؤ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ شعر وشاعری سے خاص اُنس تھا اور خوب داد سخن دیتے تھے (ہندوؤں میں اُردو)

۵؎ خوشتر ایک مشہور کالستھ خاندان سے متعلق تھے۔ خوشتر واجد علی شاہ کے سرکار میں متصدی گری پر فائز تھے اُنھوں نے راماین کو اُردو میں منظوم کیا۔ شری بھاگوت وچتر گپت ان کی مشہور اور بے بدل تصانیف ہیں جن پر ان کو بہت فخر تھا... فارسی زبان میں اگرچہ آپ مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن جو کچھ کہا اُردو میں کہا تاکہ زبان ترقی پائے (ہندوؤں میں اُردو)

اپنے زمانے کے مشاہیر میں نام پیدا کیا۔ تمام عمر ادب کی بہترین خدمتیں انجام دیں اور بیش بہا تصانیف کا خزانہ ترکہ میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خود حضرت اُفقؔ اور اُن کے گھرانے کے احسانات علم و ادب پر عظیم ہیں۔ آپ کے دادا منشی الشوری پرشاد شعاعؔی اور پردادا منشی ادے راج مطلعؔ فارسی کے شاعر تھے۔ آپ کے والد منشی پورنچند اُردو میں فکر سخن کرتے تھے۔ ذرہؔ تخلص تھا۔ حضرت اُفقؔ کے سب سے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمناؔ مشہور شاعر اور صاحب تصانیف ہوئے ہیں اِن سے چھوٹے بھائی منشی ماتا پرشاد نیستاں بھی اچھے شاعر تھے۔ حضرت اُفقؔ کے صاحب زادے منشی لشمیشور پرشاد منور بھی اپنے نامور بزرگوں کی طرح خدمت ادب میں منہمک ہیں۔ آپ کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کائنات دل اور نسیم عرفاں پہلی آپ کے منظومات کا مجموعہ ہے اور دوسری گیتائے مقدس کا منظوم ترجمہ ہے جو بقول پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ایک کوہ نور ہے۔

حضرت افقؔ ۱۹۶۴ سنہ میں پیدا ہوئے۔ اُردو مادری زبان ہو گئی تھی فارسی سے بسم اللہ ہوئی۔ ذہانت و ذکاوت اور موزونی طبع عطیات فطرت تھے۔ بڑے زندہ دل، شوخ طبع، بذلہ سنج، بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ مزاج میں سادگی تھی مگر خودداری کے ساتھ۔ نمود و نمائش سے نفرت تھی۔ جوانی میں شراب کا شوق ہوا اور اُس نابکار شوق نے مرتے دم تک پیچھا نہ

چھوڑا کسی نے سچ کہا ہے ۔ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

آپ کا قد میانہ تھا چہرہ گول، بدن دُہرا اور رنگ گندمی صحت اچھی نہیں رہتی تھی ۔ ضیق النفس کا مرض لگ گیا تھا جو رفتہ رفتہ اندر ہی اندر جسم کو گھلاتا رہا ۔ اِس پر مارچ ۱۹۱۳ء میں آپ کے لختِ جگر مسٹر رام شنکر پرشاد نے قضا کی ۔ ہونہار جوان بیٹے کی موت بڑا سخت سانحہ تھا ۔ پہلے آپ کی بصارت نے جواب دیدیا چند ماہ بعد ستمبر میں خود بھی دُنیا سے مُنہ موڑ لیا ۔

گھر کے علاوہ کچھ دنوں آپ نے کیننگ کالج لکھنؤ میں بھی تعلیم پائی لیکن کوئی سند حاصل نہیں کی مشق و مہارت سے انگریزی میں بھی اعلٰے استعداد پیدا کر لی اور بڑی بڑی ضخیم انگریزی کتابوں کے ترجمے اُردو میں کئے ۔ ہندی میں بھی کافی مہارت پیدا کی اور بڑی بڑی مذہبی کتابوں کے ترجمے اُردو نظم و نثر میں کئے ۔ فارسی میں فاضلانہ دستگاہ رکھتے تھے مگر اپنے اعلٰے افکار و تخیلات کے اظہار کا ذریعہ اُردو کو بنایا ۔

اُفق مرحوم کو بچپنے سے شعر و سخن کا شوق تھا اور کیوں نہ ہوتا گھر میں ابتدا ہی سے یہی چرچے یہی مشغلے رہتے تھے ۔ دادا، پردادا، باپ، بھائی سب شرابِ سخن کے متوالے تھے ۔ ننھیال بھی علم و ادب کا گہوارہ تھی ۔ منشی شنکر دیال فرحت آپ کے ماموں بڑے

عالم و فاضل اور مشہور و معروف سخنور ہوئے ہیں جن کی رامائن منظوم ہمیشہ یادگار رہے گی۔ حضرت افق نے پہلا شعر نو سال کی عمر میں کہا طبیعت کی موزونی کا یہ عالم تھا کہ مدرسہ میں اُستاد کے سوالوں کا جواب اشعار میں دیا کرتے تھے۔ پہلے دِل تخلص اختیار کیا تھا۔ چند سال بعد افق تخلص کرنے لگے۔ اسی تخلص سے شہرت و نام پایا۔ دور دور اپنے کلام و کمال کا سکہ بٹھا دیا۔ راجا گردھاری پرشاد باقی نے آپ کو حیدر آباد بلایا۔ وہاں ایک مشاعرے میں جس میں داغ بھی شریک تھے طرحی غزل پڑھی جسکا مطلع تھا

همیں وہ کہتا ہے پیار سے تو خطاب ہم لیکے کیا کرینگے
حضور ہم لیکے کیا کرینگے جناب ہم لیکے کیا کرینگے

سامعین سے داد پائی۔ پھر حضور نظام نے اپنے دربار میں شرف باریابی بخشا اور غزل سُنی۔ داد کمال دی جیغہ و سرپیچ عطا فرمائے۔

کمال کے قدر داں آپ کو گھر نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ عمر کا بیشتر حصّہ لکھنؤ سے باہر گزرا۔ بستی، ریاست کوٹہ، ناہن، دہلی، حیدر آباد، لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات سے آئے دن بلاوے آتے رہتے تھے جہاں جاتے تھے بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔

آپ کا میدان فکر و خیال بہت وسیع تھا۔ شاعر، ناثر، اخبار نویس، مترجم، مورخ، ڈرامہ نگار، ناول نویس، ظرافت نگار غرض ادب کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جس میں آپ کے قلم نے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ علم عروض و قافیہ اور صرف و نحو کے ماہر تھے۔ کئی کتابیں آپ نے

قواعد پر بھی لکھیں - تاریخی معلومات بہت وسیع تھی - نثر تو قلم برداشتہ لکھتے ہی تھے نظم میں بھی یہ کمال تھا کہ بات بات میں مصرعے اور شعر زبان سے نکلتے تھے - آپ کا "نظم اخبار" کُل کا کُل منظوم ہوتا تھا قدر دان کمال آپ کو ملک الشعرا لکھتے تھے اور یہ آپ کا خطاب ہو گیا تھا - صوبہ اودھ اور پنجاب کی ٹکسٹ بک کمیٹیوں نے آپ کا کلام کورس میں داخل کیا تھا - شاہ ایران سلطان فتح علی شاہ کج کلاہ کے داماد حضرت آغا سید علی عباس صاحب سہام الملک بہادر شستری رئیس خراسان نے سلطان دکن میر محبوب علی خاں آصف جاہ کے دربار میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر حضرت اُفق کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی "رائے دوارکا پرشاد اُفق شاعریست فخر ہندوستان و ناثریست معجز بیان - جوہرش با کمالی، گوہرش عالی . . . . . اُردوے معلی اسکے فصاحت و بلاغت بنامش میخوانند و نظم اخبار . . . . لالی شہوار مضامینش بہ چار دانگ عالم می افشاند - محاورہ دانی اہل ایران کلامش را در زیور کشیدہ و غلغلہ شیوا بیانیش از اُفق تا اُفق رسیدہ . . . . . اگر ہندوستان سرزمین ایران بودے و دولتخانہ قدردانیش اینقدر ویران نبودے - بچیر گمم کہ ذکر اوصاف جمیلش چہ قدر سیر چشمی بکار آرم - در سفرم واز ضیق فرصت ندارم - از قدردانی اکثرے از رؤسا و اُمرا کے ملک بالخصوص از جوہر شناسی رئیس و امراے دولت حیدرآباد دکن بمعائنہ اسناد و خلعتہائے گرانبہا بسیار خوشنود و شاد مانم و از

لیاقتش اور استحق تر . . . می دانم"

نظم میں ہر صنف میں آپ نے زور قلم دکھایا۔ غزل قصیدہ رباعی، مسدس، مثنوی غرض سب کچھ لکھا اور بہت لکھا۔ غزل کو چھوڑ کر باقی منظومات میں پند و نصائح، تاریخی واقعات اور مذہبی روایات ہیں۔ رامائنیں کئی لکھیں جن میں ایک ایک قافیہ ہے۔ اکیلی یہی تصنیف آپ کی قادر الکلامی کی زبردست دلیل ہے اور واقعی عدیم المثال چیز ہے۔ آپ کی تصنیفات بے حساب اور بے شمار ہیں۔ بعض تو ایسی نایاب ہوئیں کہ فراموش ہو گئیں۔ چند خاص خاص ترجمے اور تصنیفیں درج ذیل ہیں۔

مذہبی۔

(۱) رامائن منظوم (اب دستیاب نہیں ہوتی)

(۲) " " یک قافیہ۔ (دو بار مطبع نولکشور سے شائع ہو چکی ہے)

(۳) ترجمہ نثر رامائن والمیکی۔

(۴) " مہابھارت۔

(۵) بھاگوت مختصر۔

(۶) بھگوت گیتا۔

(۷) سناتن دھرم پرکاش۔ یہ سناتن دھرم کی تاریخ اور اصولوں پر ایک بڑی مثنوی ہے۔

(۸) رام ناٹک۔ یہ ڈراما ہے جو راے بہادر رام سرن داس کے ایما سے

تصنیف کیا گیا تھا - پہلی مرتبہ سری کرشن تھیٹر میں اسٹیج کیا گیا اور اب تک پنجاب کے اکثر مقامات میں کھیلا جاتا ہے۔

(۹) کرشن سداما - یہ بھی ڈرامہ ہے۔

علمی و اخلاقی (درسی)

(۱) آئینہ قواعد (متعلق صرف و نحو)

(۲) " جغرافیہ

(۳) قواعد خوشخطی

(۴) سرمایہ معلومات

(۵) مرقع کمال (نظم)

(۶) " اخلاق (")

(۷) " خیال (")

شعر و ادب

(۱) رسالہ تفریح طبع

(۲) غزلیات

سوانح عمریاں

(۱) یادگار جاوید (مہاراجا شیوراج دھرم دت کی منظوم سوانح عمری)

(۲) حیات باقی (فارسی مثنوی ہے جس میں مہاراجہ گردھاری پرشاد باقی کے خاندانی حالات ہیں)

(۳) حیات جاوید (تذکرہ خاندان راجا درگا پرشاد تعلقہ دار سندیلہ

(۴) زندگی جاوید (تذکرہ خاندان مہاراجا الیشور واس ور ما دنت)
(۵) سوانح عمری گرو گوبند سنگھ منظوم -

ناول اور افسانے -

(۱) عالم تصویر (اورنگزیب اور راجکماری)
(۲) فتنہ
(۳) کادمبری
(۴) طلسم
(۵) زلف لیلا (دو حصے)
(۶) شہزادی (اورنگزیب اور شیواجی مرہٹہ)

اِن کے علاوہ ٹاؤ رجستان کا ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا۔ بیس ضخیم جلدوں میں الف لیلا کا ترجمہ کیا نولکشور پریس کے لئے یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

اِن تالیفات، تصنیفات اور تراجم کے ساتھ ساتھ تین اخباروں کی ادارت خود سنبھالے ہوئے تھے۔ نظم اخبار، دھرم سجیون اور پنجاب سماچار۔ چھ پرچوں کی قلمی اعانت کرتے تھے۔ اخبار تمنائی، بھارت پرتاب دہلی، اودھ اخبار لکھنؤ، اخبار عام لاہور، زمانہ کانپور اور ہند لکھنؤ۔

اِن سب کے ساتھ ہی ساتھ بیسوں چھوٹی چھوٹی نظمیں اخلاقی و تاریخی طرز کی لکھیں جن میں بعض خاص طور سے کالستھوں کے متعلق تھیں؛

تصنیفات کے اس ضخیم و عظیم ذخیرہ کو دیکھکر حضرت افق کی قابلیت اور قوت تحریر پر حیرت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ تحریر و تصنیف سے خالی نہ تھا۔ آپ کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور آپ نے اپنے زمانے میں بڑی شہرت پائی۔ آپ کی تحریر میں روانی اور دلکشی ہے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا چٹخارا۔ غزلیں آپ نے کم کہیں بلکہ کچھ عرصہ بعد غزل سے بالکل طبیعت ہٹ گئی۔ نظم میں وہی رنگ غالب ہوگیا ہے۔ غزلوں میں عشقیہ مضامین ہیں وہی جن کے پیشوا امیر و داغ تھے۔ طرز ادا میں سادگی، روانی، سلاست اور مٹھاس ہے اور کہیں کہیں شوخی بھی کہیں "تانیثیت" بھی جھلکتی ہے۔

زمانہ اپنا تھا اپنا برابر جب زمانہ تھا　　تھا ربط و ضبط قسمت سے فلک سے دوستانہ تھا

جہاں گلزار میں جتنے ہو تم بکھرے ہوئے تنکے　　کبھی میرا بھی واں اے ہمصفیرو آشیانہ تھا

طیور باغ کیوں صیاد تیرے جال میں پھنستے　　وہاں تقدیر لے آئی جہاں کا آب و دانہ تھا

پھڑکنے بھی نہ پایا طائر جاں تیغ بسمل میں　　غضب کی نوک ناوک تھی قیامت کا نشانہ تھا

وہی ہے اے افق لیلیٰ و شیریں میں سرگزشت اپنی

جو قصہ کوہکن کا تھا جو مجنوں کا فسانہ تھا

ہمارے زخم میں ٹھنڈک لہو سے ہوتی جاتی ہے　　تسلی دل کو تکلیف رفو سے ہوتی جاتی ہے

قناعت کرتی رہتی ہے جو سیپی بر نیساں پر　　بسر در عدن کی آبرو سے ہوتی جاتی ہے

زمانہ قدرداں ہوتا ہے صورت اور سیرت کا　　گلوں کی قدر جیسے رنگ و بو سے ہوتی جاتی ہے

نہیں تکلیف سے خالی کسی کا پھولنا پھلنا　　شجر پر سنگ باری چار سو سے ہوتی جاتی ہے

ہے مجھ پر مہربانی اس قدر تکلیف زنداں کی — کہ خم گردن میری طوق گلو سے ہوتی جاتی ہے

اُفق کی میکشی ہے حافظ شیراز کی صورت
زمانے بھر میں شہرت لکھنؤ سے ہوتی جاتی ہے

مانع عشق کوئی لاکھ ہو ہوتا کیا ہے — ہم جو مرتے ہیں کسی پر تو کسی کا کیا ہے
مردم چشم کے آگے نہیں آتے تم کیوں — ابھی بچے ہیں یہ اُن سے تمہیں پردا کیا ہے
کبھی شوخی، کبھی مستی، کبھی غصہ، کبھی شرم — نہیں معلوم کہ آنکھوں میں تیری کیا کیا ہے
سحر وصل اذاں سُن کے نہ ہم جائیں گے — اے موذن تیرے چلانے سے ہوتا کیا ہے
مردم چشم کو کیا حسن پرستی کا وقوف — ابھی بچے ہیں آنکھوں نے ابھی دیکھا کیا ہے
آئے ہستی میں ہو کیوں اے میرے یاران عدم — خاک میں ملنے سے تم لوگوں کو ملتا کیا ہے

جان شیریں لب شیریں پہ جو دیتے ہو اُفق
نہیں معلوم کہ اس میں تمہیں میٹھا کیا ہے

دم میں پھر جائے جو وہ چشم عنایت کیسی — ایک نقطہ سے جو زحمت ہو وہ رحمت کیسی
دل پہ قابو نہیں کچھ چاہے جس پر آجائے — چاند سا کیسا بدن سانولی صورت کیسی
بول اُٹھا آئینہ منہ اُس نے جو دیکھا دم صبح — تم سلامت رہو دکھلائی ہے صورت کیسی
عمر کیوں زہد میں اے شیخ گنوائیں عشاق — حور دُنیا میں جو مل جائے تو جنت کیسی
جاؤ یاد اپنی بھلا کر کوئے جانے کا مزا — دل سے رخصت نہ ہوئی آنکھ سے رخصت کیسی

یہی کہتا ہے جو اشعار اُفق سنتا ہے
پائی ہے اس نے خدا جانے طبیعت کیسی

سونا نہ عاشقوں کو کبھی حشر تک ملے — نیند آنکھ ہو مگر نہ پلک سے پلک ملے

زخموں کو میرے درد کا بھاتا نہیں مزا — چھڑکوں جو ابروؤں کے تلے کا نمک ملے
تاریخ نجم و شمس و قمر تجھ سے کر بیاں — یہ داغ۔ کس کے غم میں تجھے اے فلک ملے
پہچانئے نہ پائے تیری شکل کیا کہیں — آنکھیں کھلیں نہ تھیں ابھی جب مردمک ملے
آنکھیں وہ عاشقوں سے لڑائیں تو ہوں نہ تحمل — فوج مژہ کو ایک اشارہ میں زک ملے
الفت جسے ہو خال لب یار سے اُفق
سرکار عشق سے اسے نان و نمک ملے

دل ہی کی دل میں وصل کے دن بات رہ گئی — وہ چل دیئے جب ایک پہر رات رہ گئی
رہتی ہیں بادلوں کے عوض آنکھیں اشکبار — دنیا میں ایک بس یہی برسات رہ گئی
کفنی بدن پہ ہے تو بچھانے کو بوریا — زہاد کی جہاں میں یہ اوقات رہ گئی
دشمن ملے رقیب ملے محتسب ملے — محفل میں صرف اُن سے ملاقات رہ گئی
وامق نہیں ہے قیس نہیں کوہکن نہیں — عشاق میں تیری ہی اُفق ذات رہ گئی

پنڈت امرناتھ ساحر

آپ کا خاندان دہلی میں بڑا معزز اور ممتاز خاندان ہے۔ راجا دینا ناتھ اِس خاندان کے مورث اعلیٰ رنجیت سنگھ شیر پنجاب اور اُس کے جانشینوں کے دیوان تھے۔ حضرت ساحر کے والد مرحوم پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلی کے مشہور عمائد میں سے تھے۔ حضرت ساحر کی ولادت سنہ ۱۸۶۳ء میں بمقام بریلی ہوئی جہاں آپ کے والد اِس زمانے میں محکمہ چنگی میں ملازم تھے ابتدائی تعلیم بھی بریلی میں ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں پنڈت پرشاد رام رازدان

کے شاگرد ہوئے اور اُردو فارسی کی تکمیل کی۔ فن عروض و قوافی میں کامل دستگاہ بہم پہونچائی۔ آپ بہت دنوں تک تحصیلداری کے عہدے پر ممتاز رہے اِس کے بعد اپنے وطن دہلی میں آکر مقیم ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

حضرت ساحر میں شاعری کا ملکہ بھی تھا۔ آپ نے سب سے پہلے فارسی میں شعر کہا اور مولانا عبدالحلیم عاصم کاشانی کو کلام دکھلایا عاصم کاشانی فارسی کے زبردست عالم و شاعر تھے۔ بائیس سال کی عمر میں ساحر مرحوم نے اپنے بعض احباب کی ترغیب سے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ پھر اُردو نے آپ کو ایسا فریفتہ کر لیا کہ تادم مرگ اِسی زبان میں شعر کہتے رہے۔ آپ ادب و شعر کے بڑے دلدادہ تھے۔ ہر مہینے آپ کے در دولت پر مشاعرے ہوتے تھے۔ آپ بہت سی نظم و نثر کی کتابوں کے مولف و مصنف تھے بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی آپ نے کئے۔ آپ کا اُردو دیوان کفر عشق" شائع ہو چکا ہے۔

آپ کا کلام بڑا قابل قدر ہے۔ آپ نے اشعار کے لباس میں فلسفہ کی باریکیاں، تصوف اور معرفت کے رموز و نکات پیش کئے ہیں۔ ہر شعر میں کچھ نہ کچھ غور و فکر کا سامان موجود ہے غیب و شہود، مکان و لامکان، ذات و صفات، بقا و فنا، روح و جسم، حیات و ممات، حدوث و قدم، وغیرہ مسایل اور دیگر

حقائق کائنات کے انکشاف کو مدنظر رکھا ہے۔ انداز متین و استوار ہے کبھی کبھی پرلطف پیچ وخم سے بات کہتے ہیں جو بادی النظر میں ناہمواری کا اثر رکھتی ہے

غزل

دور جب دل سے حجاب شب عصیاں ہوگا
چہرۂ شاہد مقصود نمایاں ہوگا

وہ سمجھتے ہیں کہ ہے میری تمنا اس کو
ہم کو ارمان ہے ہمیں کوئی بھی ارماں ہوگا

یوں تو ہر زخم جگر ہے میر الذت کش درد
ہر ادا میں تیری ایک ایک نمک داں ہوگا

حوصلہ وجہ تپشہائے دل و جاں نہ ہوا
شعلۂ شمع تیری بزم میں رقصاں نہ ہوا

قیس تھا مست ازل جام اناؔ لیلےٰ سے
تن کی عریانی سے مجنوں کوئی عریاں نہ ہوا

لب منصور سے دی کس نے اناالحق کی صدا
تو اگر پردۂ پندار میں پنہاں نہ ہوا

دل مٹا پر نہ مٹا حرف محبت دل سے
کفر اسلام ہوا مر کے ایماں نہ ہوا

ہم رہے چشم عنایت سے ہمیشہ محروم
دلنشیں تیر نظر کا کوئی پیکاں نہ ہوا

دل ہے بتخانۂ اصنام خیالی ساحرؔ
تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

یوں تو ہر دین میں ہے صاحب ایماں ہونا
ہم کو اک بت نے سکھایا ہے مسلماں ہونا

جلا ہے کس قدر دل ذوق کاوشہائے مژگاں سے
کہ سو سو نشتروں کی نوک ہے ہر ہر رگ جاں پر

میری دیوانگی روز قیامت میرے کام آئی
قلم رحمت کا کھینچا اس نے آخر میرے عصیاں پر

کون دیتا ہے تمھیں سنگ دلی کا طعنہ
سخت جانی کی ندامت میرے سر رہنے دو

دوستو تم کو مبارک رہے یہ شربِ مدام — ہم کو لذت کشِ خوں نابِ جگر رہنے دو
زاہدو یاد رہے نارِ جہنم کا عذاب — خیر جا ہو تو میرا دامن تر رہنے دو
ساحرؔ اب ترکِ وفا شیوۂ عشاق نہیں
"ہرچہ آید" کے لئے سینہ سپر رہنے دو

مکاں کہیں تو مقرر ہو لامکاں کے لئے — نشاں کوئی تو معین ہو بے نشاں کے لئے
ملا ہے جسم ہمیں امتیازِ جاں کے لئے — بشر وجود میں آیا ہے امتحان کے لئے
ہمارے دل میں یقیں کو ملی ہے گنجائش — کہ بس ہے وسعتِ کون و مکاں گماں کے لئے
چلی جو ساحلِ عمرِ رواں سے کشتیِ تن
نفس سے کام مشیت نے بادباں کے لئے
کیف مستی میں عجب جلوۂ یکتائی تھا — تو ہی تو تھا نہ تماشا نہ تماشائی تھا

حسنِ ازل صفات میں جب جلوہ گر ہوا — آئینۂ جمال وجودِ بشر ہوا
ترکِ وجود سے جو فنا میں گزر ہوا — اور بقا تجلیٔ یار نظر ہوا
کونین ہے جو نورِ تجلی کی جلوہ گاہ — کُن سے فروغِ حسنِ ازل جلوہ گر ہوا
کیوں حسنِ پردہ دار کی ہیں لن ترانیاں — منصور رازِ عشق کا جب پردہ در ہوا
معلوم و علم عالم و عرفاں ہیں نورِ ذات — اشراق و ہوش و خلوت میں رنگِ اثر ہوا
مرکز ہے نقطہ نقطہ ہے خط خط ہے دائرہ
ساحرؔ قدم حدوث میں حسن نظر ہوا

آنکھیں قصور وار ہیں دل شرمسار ہے | دو پردہ در ہیں راز کے اک پردہ دار ہے
خلوت میں انجمن ہے تو جلوت میں انجمن | آئینہ سے نگاہ کسی کی دوچار ہے

گر تصور نہ ہو تصدیق تو ہے نقص کمال | خود چلے آئیں کھنچے جلوۂ کار ہے یہی

رسوائے عشق ہے تیرا شیدا کہیں جسے | عشاق میں مثال ہے رسوا کہیں جسے
ہے منزل فنا میں مرا ہمسفر وہ داغ | روشن چراغ گنبد مینا کہیں جسے
منسوب کفر و دیر سے ایماں حرم سے ہے | اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

ساحر نفس وہ دام ہے جس میں کہ ہے اسیر
موج رم خیال کہ عنقا کہیں جسے

زیر طبع!　　# بہار جاوداں　　زیر طبع!

مشہور و معروف شاعر و ادیب منشی شام موہن لال جگر بریلوی بی۔اے کی یہ دوسری گراں پایہ تصنیف ہے۔ یہ بھی ادب اُردو کے لئے ایک نادر و بیش بہا اضافہ ثابت ہو گی۔ اسے یادِ رفتگاں کی تکمیل کا ایک قدرتی نتیجہ سمجھنا چاہیئے یادِ رفتگاں میں گذشتہ ہندو مشاہیر ادب کا تذکرہ، انتخاب کلام اور کلام پر تبصرہ ہے۔ "بہار جاوداں" میں موجودہ ہندو مشاہیر شاعروں اور نثاروں کے حالات اور اقتباسات کلام ہیں اور کافی و وافی مقدار میں ہیں۔ کلام پر جو تنقید ہے مصنف کے مخصوص انداز میں ہے اور بڑی دلپذیر، عالمانہ، بے لاگ اور مکمل ہے چھپائی، لکھائی، تہذیب کتاب نہایت عمدہ ہے۔ صفحات تقریباً چار سو۔ پہلے ہی سے بکثرت خریداروں کے آڈر آ چکے ہیں۔ آپ بھی اپنا آڈر دیدیجیئے تاکہ مایوسی نہ ہو۔ قیمت کتابت کے بعد مقرر کی جائے گی۔ غالباً للعہ/ ہوگی

ملنے کا پتہ

جعفری برادرس۔ انوار احمدی پریس۔ الہ آباد

کلیات نظیر اکبرآبادی

معہ مقدمہ

یہ نظیر اکبرآبادی کے کلام کا بہترین انتخاب ہے جس کے شروع میں ۸۲ صفحہ کا ایک مقدمہ ہے۔ جس میں نظیر کے حالات اور اُن کے کلام پر مفصل تبصرہ ہے۔ اس وقت تک نظیر کے جسقدر انتخابات چھپے ہیں ایسا مفصل تبصرہ کسی پر نہیں دیا گیا۔

انتخاب میں اسکا خیال کیا گیا ہے کہ نظیر کو شاعری کی جس صنف میں کمال تھا وہی کلام زیادہ لیا گیا ہے۔ یعنی غزلوں کا انتخاب کم ہے۔ عنوانات پر جدید طرز کی شاعری جسقدر نظیر نے کی ہے وہ فحش اور غیر مہذب کلام کو چھوڑ کر قریب قریب سب لے لیا گیا ہے۔

نظیر کا مذہبی کلام مثلاً خدا پرستی۔ دنیا کی بے ثباتی۔ فقر۔ مکافات عمل۔ موت بنجارہ نامہ وغیرہ۔ اخلاقی۔ مثلاً سخاوت۔ استغنا۔ خوشامد۔ وغیرہ دوسری قسم کی نظمیں۔ مثلاً اکبرآباد۔ آگرہ کی ککڑی۔ شب برات۔ بلبل کی لڑائی۔ ریچھ کا بچہ گلہری کا بچہ۔ ہرن کا بچہ۔ کبوتر بازی۔ پتنگ بازی۔ تربوز۔ ہولی۔ دیوالی۔ عید۔ بسنت۔ برسات۔ جاڑا۔ وغیرہ۔ ان سب طرح کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس طرح کی تقریباً ۱۹۰ عنوانات کی نظمیں ہیں۔ نہایت دلچسپ انتخاب ہے۔ بہت عمدہ کاغذ پر خوشخط چھپا ہے۔ مجلد ہے اور اسکا گرد پوش نہایت خوبصورت ہے۔ قیمت للعمر

ملنے کا پتہ

جعفری بُکڈپو۔ مالک مطبع انوار احمدی۔ الہ آباد